خطبہ

حضرت فاطمۃ زہراء (سلام اللہ علیہا)

اور

واقعہ فدک

فقیہ عالیقدر

حضرت آیت اللہ العظمیٰ منتظری دامت برکاتہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ

حضرت فاطمۂ زہراء (سلام اللہ علیہا)

اور

واقعہ فدک

فقیہ عالیقدر

حضرت آیت اللہ العظمیٰ منتظری دامت برکاتہ

● خطبہ

حضرت زہراء (سلام اللہ علیہا)

○ ناشر:۔ م۔ ف۔ ا۔ خ۔ (C.C.I.K.)

○ تاریخ اشاعت: ۱۹۹۶

○ قیمت: ۔/۱۲۵ روپے

انتساب

اس ناچیز خدمت کو
اسلام کی واحد عظیم الشان خاتون صدیقہ طاہرہ
حضرت فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا
کی بارگاہ مقدس میں پیش کرتا ہوں۔

فہرست

☼ تیسرا درس:

☼ چوتھا درس:

فلسفہ احکام الہی

☼ پانچواں درس:

زمانہ جاھلیت میں جزیرۃ العرب میں انحطاط و پستی کے چند نمونے:

☼ چھٹا درس:

☼ گیارھواں درس:

☼ بارھواں درس:

⊖ حصّہ دوئم:

☼ تیرھواں درس:

☼ چودھواں درس،

حصّہ سوئم :

حضرت امام جعفر صادق(ع) کی زبانی غصب فدک کی کہانی

پندرھواں درس :

سولھواں درس :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

فاطمۃ الزہراء علیہا السلام ایک ایسی خاتون تھیں
کہ جنہوں نے ایک سادہ گھر اور چھوٹے سے کمرے
میں ایسی ہستیوں کی تربیت کی کہ جن کا نور ارض
خاکی سے افلاک تک اور عالم ملک سے لے کر عالم
ملکوت تک چمک اٹھا۔

امام خمینی (قدس اللہ سرہ)

تاریخ بشریت اس حقیقت کی گواہ ہے کہ "حق و باطل"، "مومن اور مشرک" اور "ظالم و مظلوم" کے یہ دو گروہ ہمیشہ سے ایک دوسرے کے مقابلے میں رہے ہیں، اس باہمی کشمکش میں اہل حق، "ایمان، حقیقت اور سچائی" کے ہتھیار سے مسلح رہے تو باطل گروہ "ڈراؤ دھمکاؤ، لالچ اور مکر و فریب" سے کام لیتے رہے۔

تاریخ اسلام کے چودہ سو سالہ عرصے میں بھی ان دو گروہوں کے درمیان معرکہ آرائی کے نمایاں نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ قارون صفت دنیا کے دلدادہ افراد نے جب دیکھا کہ اسلام ان کے مفادات کے لئے خطرے کا موجب بن رہا ہے تو اپنی تمام تر طاقت اور فریب کاری کے ساتھ ایک ایسے گروہ کے مقابلے میں اتر آئے جو خدا پرست تھا اور خدا کے علاوہ کسی کے سامنے جھکنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ لہذا مسلمانوں بلکہ خود پیغمبر اسلام (ص) کو بھی آزار و اذیت اور شکنجوں کے ذریعے اپنے ہدف سے دور رکھنے کی کوشش کی لیکن خداوند، یہ فیصلہ کرچکا تھا کہ ان کی کوئی نہ چلے اور حق والے کامیاب و کامران ہوجائیں۔

صدر اسلام کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ وہی لوگ جو پیغمبر اسلام (ص) سے دیرینہ دشمنی رکھتے تھے اور اسلام کی ترویج اور گسترش کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے تھے، جلدی سے رنگ بدلنے لگے اور ایک نیا محاذ کھول کر اسلام کے حقیقی مجاہدوں کے خلاف مبارزہ شروع کرنے لگے۔ اس دفعہ یہ لوگ اسلام اور رسول خدا (ص) کا نام لے کر اسلام کو سرے سے ہی ختم کرنا چاہتے تھے لہذا انحراف اور گمراہی کی ایسی بنیاد رکھی کہ آج تک مسلمان اس انحراف کا خمیازہ بھگت رہے ہیں اور اس چودہ سوسالہ تاریخ میں مسلمان جتنی مشکلات اور بحرانوں کا شکار ہوئے ہیں وہ انہی واقعات کا کڑوا پھل تھا جو پیغمبر اسلام (ص) کی رحلت کے بعد رونما ہوئے ہیں۔

(انحراف اور گمراہی کی) اس جدید محاذ آرائی میں مؤمنین اور مخلص مسلمانوں کی ذمہ داری بنتی تھی کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق لوگوں کو آگاہ کریں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں اور امامت وولایت کی حمایت اور اس کا دفاع کریں اور اس فریضہ کی ادائیگی میں حضرت فاطمہ الزہراء علیہا السلام نے

نمایاں، کردار ادا کیا ہے۔

رحلت رسول (ص) کے بعد رونما ہونے والے اس عظیم انحراف کے مقابلے میں اسلام کی اس عظیم خاتون نے جو کوششیں کیں (ان میں سے اہم ترین اقدامات) یہ ہیں:

حساس موقعوں پر حضرت امیرالمؤمنین (ع) کی حمایت کرنا، آتشین اور روشنگر خطبات بیان فرمانا، منافقت اور دو روئی کے چہرے کو بے نقاب کرنا، مسلمانوں کو قرآن کی آیات اور رسول خدا (ص) کی فرمائشات سے آگاہ کرنا اور یاد دلانا وغیرہ وغیرہ۔

اہل بیت عصمت و طہارت علیہم السلام کی سیرت و کردار سے آگاہی اور انسانیت کو اس سے آگاہ کرنا ایک ایسی ذمہ داری ہے کہ جسے علماء اور اہل تحقیق کو سونپا گیا ہے لہذا ان پر فرض ہے کہ ان عظیم ہستیوں کے پیغام حق خواہی کو تمام انسانوں تک پہنچانے کے لئے انتھک کوشش کریں۔

اسی ذمہ داری کی بنا پر حضرت آیت اللہ العظمیٰ منتظری مدظلہ العالی بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ حوزہ علمیہ کے دوسرے (مروجہ) دروس کے ساتھ ساتھ، نہج البلاغہ، اصول کافی اور حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کے خطبہ کا بھی درس دیا جائے۔ لہذا وہ اپنے قیمتی وقت میں سے روزانہ کچھ وقت، ان زرین اقوال کی تدریس اور تشریح کے لئے مختص کرتے ہیں تاکہ ہر انسان اس سے استفادہ کرسکے۔

عام فہم اور سلیس و آسان بیان نیز غیر مانوس الفاظ کے استعمال سے اجتناب آپ کے دروس کی خصوصیات میں سے ہیں۔

یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے در اصل ان درسوں کا مجموعہ ہے جسے جناب استاد محترم حضرت آیت اللہ العظمیٰ منتظری دام ظلہ (۱۳۷۲ھ ش / ۱۹۹۳ء) کے ایام فاطمیہ میں حضرت فاطمہ زہراء (ع) کے خطبے کی تشریح اور وضاحت میں بیان فرمایا۔

یہ کتاب سولہ دروس پر مشتمل ہے جو تین حصوں میں پیش کی جاتی ہے:

پہلا حصہ: مسجد نبوی میں حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کا خطبہ۔

دوسرا حصہ: بستر شہادت پر انصار و مہاجرین کی عورتوں سے آپ کا خطاب۔

تیسرا حصہ: امام جعفر صادق علیہ السلام کی زبانی، غصب فدک کا واقعہ۔

جیسا کہ کہا گیا ہے، یہاں جو توضیح اور تشریح دی گئی ہے وہ وسیع تحقیق اور مکمل شرح نہیں بلکہ (ایام فاطمیہ میں) عام استفادہ کے لئے عام سامعین کو مدنظر رکھ کر بیان کیا گیا ہے۔ اسی لئے (فقیہ عالیقدر حضرت آیت اللہ العظمیٰ منتظری) ابتداء میں اس کے چھاپنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے لیکن چند جید علماء کے اصرار پر آپ نے چھاپنے کی اجازت دیدی تاکہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد، حضرت زہراء (ع) کے بیانات سے آگاہ ہوسکیں اور رسول خدا (ص) کے بعد معاشرے میں اہل بیت (ع) کی مظلومیت اور اجتماعی مقام کا ادراک کرسکیں۔

آپ کی تقاریر کو کتابی شکل میں اس امید کے ساتھ پیش کی جارہا ہے کہ یہ حقیر سی خدمت درگاہ خداوندی میں مورد قبول واقع ہو اور اہل بیت عصمت وطہارت (ع) کی تعلیمات کی روشنی میں ہمارا یہ اسلامی معاشرہ خوشبختی اور کمال کی راہ پر گامزن ہو۔

ناشر

حصّہ اول:

مسجد نبوی (ص) میں
موجود مسلمانوں سے
حضرت زہراء علیہا السلام کا خطاب
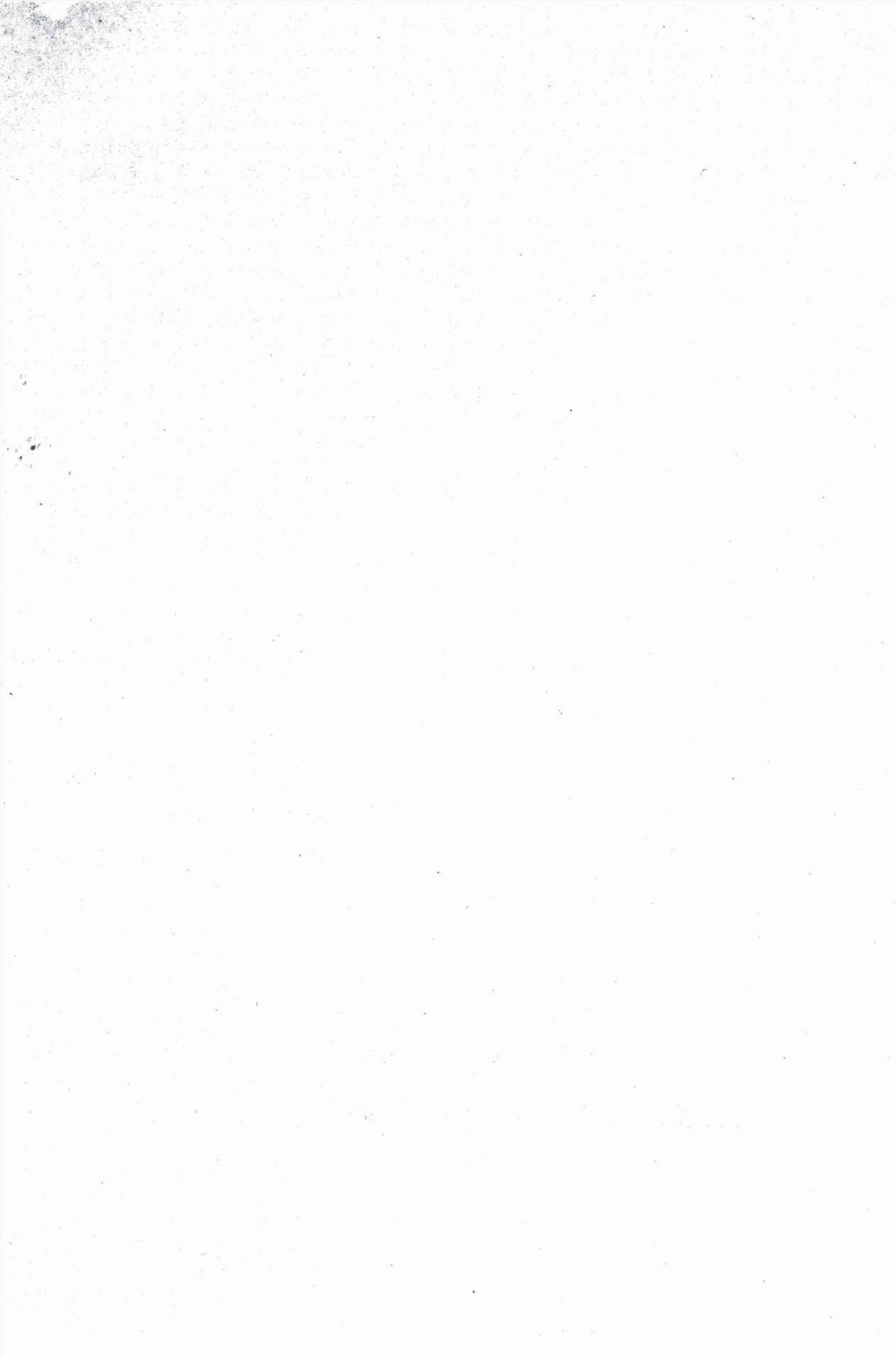
پہلا درس:

- خطبے کی سند
- حضرت فاطمہ (ع) کس شان سے مسجد گئیں
- خطبہ کے لئے تیاری
- حضرت زہراء (ع) اور حاضرین کا شدید گریہ

رَوىٰ عَبْدُالله بن الْحَسَنِ بِاسْنادِهِ عَنْ آبائه‌علیهم‌السلام:

أَنَّهُ لَمّا أجمَعَ [إجْتَمَعَ] أَبُوبكر و عُمَر عَلىٰ مَنْعِ فاطِمَة‌علیهاالسلام فَدَكاً، و بَلَغَها ذلِكَ، لاثَتْ خِمارَها عَلىٰ رَأسِها وَاشْتَمَلَتْ بِجِلْبابِها، وَ أَقْبَلَتْ فى لُمةٍ مِنْ حَفَدَتِها وَ نِساءِ قَوْمِها، تَطَأُ ذُيولَها، ما تخرمُ مِشْيَتها مِشْيَةَ رَسُول‌الله‌صلی‌الله‌علیه‌وآله، حَتّى دَخَلَتْ عَلىٰ أَبى‌بكر و هُو فى حشدٍ مِنَ المُهاجِرينَ وَالأنصار و غيرِ هم، فنيطَتْ دُونَها مُلاءَة، فَجَلَسَتْ؛ ثُمَّ أَنَّتْ أَنَّة أجْهَشَ القَوْمُ لَها بِالبُكاء، فَارْتَجَّ المَجْلِس؛ ثمَّ أَمْهَلَتْ هُنَيْئَةً، حتى إذا سَكَنَ نشيجُ القَومِ و هَدَأَتْ فورَتهم؛ إفْتَتَحَتِ الكلامَ بِحَمْدِاللهِ تَعالىٰ و الثّناء عَلَيه و الصَلوة عَلىٰ رَسُول‌الله‌صلی‌الله‌علیه‌وآله؛ فَعادَ الْقَوْمُ فى بُكائهم.

❁ ❁ ❁

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبہ نستعین

خطبے کی سند:

حضرت زہراء (ع) نے مسجد نبوی میں جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ مختلف کتابوں میں کئی اسناد کے ساتھ نقل ہوا ہے، جسے ہم مختصراً ذکر کرتے ہیں:

١۔ بحار الانوار (تالیف) علامہ مجلسی قدس سرہ،

بحار الانوار میں علامہ مجلسی قدس سرہ نے فدک سے مربوط باب میں اس خطبہ کے لئے ایک مستقل فصل لکھی ہے اور فرماتے ہیں کہ:

"یہ خطبہ ان مشہور اور معروف خطبات میں سے ایک ہے جسے شیعہ و سنی، دونوں نے مختلف اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے (١)" علامہ مجلسی فرماتے ہیں کہ یہ خطبہ معمولی سے فرق کے ساتھ احمد بن ابی طاہر کی کتاب "بلاغات النساء" میں ذکر ہوا ہے اور احمد بن ابی طاہر نے اس خطبہ کی سند میں شک وشبہ کرنے والوں کو جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"خاندان ابوطالب کی بزرگ ہستیوں نے اپنے آباء واجداد سے اس خطبہ کو نقل کیا ہے اور وہ اپنی اولاد کو اس کی تعلیم دیتے تھے (٢)"

١۔ ٢۔ بحار الانوار طبع قدیم ج ٨ ص ١٠٨ اور اس کے بعد۔

۲۔ شرح نہج البلاغہ (تالیف) ابن ابی الحدید،

ابن ابی الحدید نے نہج البلاغہ کی اپنی شرح میں عثمان بن حنیف کے نام حضرت علی (ع) کے مکتوب، جس میں فدک کا ذکر ہوا ہے، کے ضمن میں اس خطبے کو "ثقیفہ وفدک" نامی کتاب (۱) سے نقل کیا ہے جہاں اس خطبے کی کئی اسناد ذکر کی گئی ہیں (۲) ابن ابی الحدید کہتا ہے کہ میں نے اس خطبہ کی سند کو شیعوں کی کتب سے نقل نہیں کیا بلکہ اہل سنت کی کتابوں سے ہی نقل کیا ہے. وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ فدک صرف شیعوں سے مربوط نہیں بلکہ ایک مسلم اور حقیقی واقعہ ہے جو تمام مسلمانوں کے ساتھ مربوط ہے۔

"ثقیفہ اور فدک" کا مؤلف ابوبکر احمد بن عبدالعزیز (جوہری) بھی اس خطبہ کے لئے بہت ساری اسناد نقل کرتا ہے اور ان میں سے ایک سند "عبداللہ بن حسن" کی سند ہے اور یہ (عبداللہ بن حسن) عبداللہ محض کے نام سے مشہور ہے۔

عبد اللہ محض چونکہ خود، والد گرامی اور والدہ ماجدہ دونوں طرف سے سید تھے، آپ حسن مثنیٰ کے فرزند تھے اور حسن مثنیٰ بھی حضرت امام حسن مجتبیٰ (ع) کے فرزند ہیں. آپ کی والدہ ماجدہ حضرت امام حسین (ع) کی صاحب زادی تھیں لہذا آپ امام حسن (ع) کے پوتے اور امام حسین (ع) کے نواسے تھے. اسی بنا پر آپ عبد اللہ محض کے نام سے مشہور و معروف تھے۔

آپ منصور (دوانیقی) کے دور میں زندان میں مقید ہوئے اور اسی زندان میں آپ نے وفات پائی۔

محمد نفس زکیہ اور ابراہیم آپ کے فرزند تھے جنہوں نے منصور کے دور خلافت میں قیام کیا اور اس کے حکم سے شہید کیے گئے۔

۳۔ احتجاج طبرسی (رحمۃ اللہ علیہ)

جن کتابوں میں حضرت زہراء (ع) کے خطاب کا ذکر ہوا ہے ان میں سے ایک مرحوم طبرسی (رہ)

۱۔ یہ کتاب ابوبکر احمد بن عبدالعزیز جوہری کی ہے اور وہ خود اہل سنت کے بزرگ علماء میں سے ہیں۔

۲۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۱۶ ص ۲۱۱۔

کی کتاب احتجاج ہے [1] انہوں نے بھی اس خطبہ کو عبد اللہ محض سے نقل کیا ہے۔

یہاں پر ہم (یہ خطبہ) کتاب احتجاج کے نقل کے مطابق ذکر کریں گے۔

احتجاج میں ذکر ہے کہ:

"روی عبد اللّٰہ بن الحسن باسنادہ عن آبائہ علیہم السلام،

انہ لما اجمع (اجتمع [2]) ابو بکر و عمر علی منع فاطمۃ علیہا السلام فدکاً، وبلغہا ذلک..."

فاطمہ (ع) کس شان سے مسجد گئیں:

عبد اللہ بن حسن اپنے آباء سے نقل کرتے ہیں کہ جب ابو بکر اور عمر نے فیصلہ کیا کہ حضرت زہراء (ع) سے فدک چھینا جائے تو اس کی اطلاع جب حضرت زہراء (ع) کو ملی (اور آپ نے فیصلہ کیا کہ صدائے احتجاج بلند کی جائے لہذا مسجد میں تشریف لے جانے کے لئے آمادہ ہوئیں اور)

"لاثت خمارھا علی راسھا"

(آپ نے سر پر چادر رکھی)

"خمار" ایسی چادر ہے جس سے عورتیں اپنے سر، گردن اور سینے کا پردہ کرتی ہیں اور خمار معمولی چادر سے جو صرف سر کو چھپاتی ہے کسی حد تک بڑی ہوتی ہے۔ سورۂ نور کی آیت ۳۱ میں بھی یہی مراد ہے۔ جہاں پر ارشاد خداوندی ہے کہ: "ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن" (یعنی اپنی چادروں کو اس طرح پہنیں کہ گردن اور سینے کا بھی پردہ ہو جائے) اور خُمر لفظ خمار کی جمع ہے۔

۱۔ کتاب احتجاج طبرسی ج ۱ ص ۲۵۳ (اسوہ پبلیکیشنز) بعض بزرگ اس کتاب کو مرحوم شیخ ابی علی طبرسیؒ مؤلف تفسیر مجمع البیان کی طرف نسبت دیتے ہیں لیکن علامہ مجلسیؒ بحار الانوار کے مقدمات (۹/۱) میں فرماتے ہیں کہ یہ کتاب، ابو منصور احمد بن علی بن ابیطالب الطبرسیؒ کی تالیف ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب احتجاج کو مجمع البیان کے مؤلف کی طرف منسوب کرنا غلطی کی وجہ سے ہوا ہے جو حضرات مزید تحقیق کے خواہاں ہوں تو وہ اسوہ پبلیکیشنز کی طبع کردہ کتاب احتجاج کے مقدمہ کی طرف رجوع کریں وہاں پر حضرت آیت اللہ جعفر سبحانی کی اس سلسلے میں تحقیق بھی موجود ہے۔

۲۔ بعض نسخوں میں اجمع کے بجائے اجتمع آیا ہے لیکن ظاہراً اجمع صحیح ہے۔

"خَمر" اصل میں لباس اور ڈھانپنے والی چیز کو کہا جاتا ہے. شراب کو بھی خَمر اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے پینے سے انسان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے. جنگل کے درختوں کو بھی خمر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ سطح زمین کو ڈھانپ لیتے ہیں اور چھپا دیتے ہیں(۱)۔

"لاث" اور "لوث" کے معنی ہیں باندھنا، پہننا. "لاث العمامہ علی راسہ" یعنی اس نے اپنے سر پر عمامہ باندھا. چونکہ اس عبارت میں "خمار" کا بھی ذکر ہوا ہے "لاثت خمارھا علی راسہا" کے معنی یہ ہوں گے کہ آپؑ نے مقنعہ پہنا. یعنی ایک ایسی چادر پہن لی جو آپؑ کے سر، گردن اور سینے کو مکمل طور پر ڈھانپ لیتی تھی۔

"واشتملت بجلبابھا"

(آپؑ نے اپنے برقعہ کو زیب تن فرمایا)

"جلباب" جس کی جمع "جلابیب" ہے، عربی میں ایسے لباس کو کہا جاتا ہے جو عربوں کی لمبی قیمص یا عبا کی طرح پورے بدن کو ڈھانپ لے. بنابریں "واشتملت بجلبابہا" کے یہ معنی ہوں گے کہ آپؑ نے ایک ایسی چادر زیب تن فرمائی جو پورے بدن کو سر سے پاؤں تک چھپا لیتی تھی۔

"واقبلت فی لمۃ"

(اور آپؑ اپنے سے ہم آہنگ گروہ کے ساتھ مسجد میں تشریف لائیں)

اہل لغت نے "لمۃ" کو دو طریقے سے پڑھا ہے. کتاب قاموس میں تشدید کے ساتھ "لمّۃ" ذکر ہوا ہے جو ہم عمر جماعت یا گروہ کو کہا جاتا ہے اور دوسروں نے "لُمَۃ" تشدید کے بغیر نقل کیا ہے. اس صورت میں یہ لفظ "لؤمہ" اور "لام" سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں "ملائم" اور یہ ایسے افراد کو کہا جاتا ہے جو ایک دوسرے سے ہم فکر، ہم آہنگ اور ایک ہی نظریہ کے حامل ہوں۔

اہل لغت کی اس توضیح کے مطابق مذکورہ جملے کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت زہراء (ع) ایسی

۱۔ لسان العرب ج ۴ ص ۲۵۶، ۲۵۷ اور راغب اصفہانی اپنی کتاب مفردات ص ۲۹۸ میں لکھتے ہے کہ: خَمر کا اصلی معنی کسی چیز کو چھپانا ہے اور چھپانے والی چیز کو خمار کہا جاتا ہے لیکن عرف میں خمار اس چادر کا نام ہے جس سے عورتیں اپنے سر کو چھپاتی ہیں. اس لفظ کی جمع خُمر ہے.

حالت میں مسجد کی طرف روانہ ہوئیں کہ ہم عمر مستورات یا ہم فکر اور نظریاتی طور پر ہم آہنگ خواتین کی ایک جماعت آپؑ کو اپنے حصار میں لئے ہوئے تھیں۔

"من حفدتها ونساء قومها"

(اپنے مددگاروں اور خاندان کی خواتین کی ایک جماعت کے ہمراہ آپؑ مسجد کی طرف روانہ ہوئیں)

(من حفدتها لفظ لمة کی توضیح اور تشریح کے لئے بیان ہوا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ اپنی ہمفکر اور نظریاتی طور پر موافق خواتین کے ہمراہ مسجد میں گئیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آپؑ کی ظاہری شخصیت محفوظ رہے اور آپؑ کا ظاہری مقام و منزلت بھی محفوظ رہے [۱]۔

"تطا ذیولها"

(برقعے کے دامن پر قدم مبارک رکھتے جا رہی تھیں)

یعنی چلتے وقت آپؑ کی چادر کا نچلا حصہ آپؑ کے قدموں کے نیچے آ رہا تھا اور آپؑ اس پر جلدی یا چادر کے لمبے ہونے کی وجہ سے قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔

یہاں دو احتمال پائے جاتے ہیں:

۱۔ چونکہ آپؑ (ابوبکر و عمر کے اقدام سے) پریشان اور مضطرب تھیں اور آپ جلدی اور شتاب زدہ مسجد کی طرف جا رہی تھیں لہذا عجلت کی وجہ سے آپؑ چادر پر قدم رکھتے ہوئے جا رہی تھیں چونکہ عموماً عورتوں کو جب کسی کام میں جلدی ہوتی ہے تو وہ اپنی چادر اور قمیص کو گھسیٹتے ہوئے اور اس پر قدم رکھتے ہوئے چلی جاتی ہیں۔

۲۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ (چونکہ عفت و حجاب کے پیش نظر) آپؑ کا لباس کافی بلند اور لمبا تھا جس کی وجہ سے کبھی کبھار چلتے ہوئے آپؑ کا قدم مبارک برقعے پر پڑتا تھا۔

۱۔ اگرچہ اولیاء اور بزرگان دین کی شخصیت، مال اور دنیوی مقام سے بے نیاز اور بلند و بالا ہے لیکن جب فردی مسائل سے ہٹ کر حق و باطل کے مقابلے میں مبارزے کا مسئلہ ہو تو وہاں حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ بزرگان دین بھی ظاہری امور پر توجہ دیں اور یہ توجہ صرف حق و عدالت کے احترام کے لئے ہوتی ہے ورنہ اولیاء کا مقام ایسی ظاہری چیزوں سے پاک و منزہ ہے۔

بہر صورت جب آپؑ مسجد کی طرف تشریف لے جارہی تھیں تو جلدی یا چادر لمبے ہونے کی وجہ سے چادر آپؑ کے قدموں کے نیچے آرہی تھی اور آپؑ اس پر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔

" ماتخرم مشیتہامشیۃ رسول اللّٰہ (ص)"

(آپؑ کے چلنے کا انداز، رسول خدا (ص) کے چلنے کے انداز اور طریقے سے کسی طرح کم نہ تھا)

"خرم" کم کرنا، چھوڑ دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور "مشیۃ" فِعلَۃ کے وزن پر (مصدر نوعی) ہے جو کسی کام کی حالت یا ہیئت کو بیان کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور فَعلَۃ کا وزن کسی کام کی تعداد اور مقدار کو بیان کرتا ہے۔ جیسا کہ "جِلسَۃ" بیٹھنے کے مخصوص انداز اور "جلسہ" بیٹھنے کی تعداد اور دفعات کو بیان کرتا ہے۔

بنابریں یہاں پر بھی "مشیۃ" آپؑ کے چلنے کے مخصوص انداز اور شکل کو بیان کرتا ہے کہ وقار و عظمت اور متانت کے لحاظ سے آپؑ کے چلنے کے انداز اور رسول خدا (ص) کے چلنے کے انداز میں کوئی فرق نہ تھا اور آپؑ رسول خدا (ص) سے مکمل شباہت رکھتی تھیں (۱)۔

خطاب کے لئے تیاری:

" حتی دخلت علی ابی بکر وھو فی حشد من المھاجرین والانصار وغیرھم"

(یہاں تک کہ آپؑ اس حالت میں ابوبکر پر وارد ہوئیں کہ وہ

بہت سے مہاجرین وانصار اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا)

"حشد" بڑے مجمع کو کہا جاتا ہے۔ یعنی مہاجرین وانصار اور دوسرے مسلمانوں کے بہت سے لوگ اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے چونکہ اب وہ "خلیفہ" بن چکا تھا اور اب وہ ایک شخصیت بن چکا تھا۔

۱۔ دوسرا احتمال صحیح نظر آتا ہے چونکہ جلدی اور عجلت آپؑ کی عظمت اور وقار کے منافی ہے علاوہ ازیں عرب کی صاحب حمیت اور عفیف خواتین کا برقع لمبا ہوتا تھا کہ اسے زمین پر گھسیٹتے جاتی تھیں۔ نیز پیغمبر اکرمؐ بھی آہستہ آہستہ چلتے تھے نہ کہ عجلت اور جلدی میں۔

"فنیطت دونہا ملاءۃ"

(آپؑ اور دوسرے لوگوں کے درمیان ایک پردہ نصب کیا گیا)

جب لوگوں نے دیکھا کہ حضرت زہراء (ع) اپنی ہم فکر اور مدد گار خواتین کے ساتھ مسجد میں تشریف لائی ہیں تو ان کے احترام کے لئے ان کے اور مردوں کے درمیان ایک پردہ لگا دیا گیا۔

البتہ بعض دوسری کتابوں میں "ملاۃ" کے بجای "قِبطیۃ" یا "قُبطیۃ" ذکر ہوا ہے. اس کی وجہ یہ ہے کہ پردے کے کپڑے مصر سے لائے جاتے تھے اسی لئے اسے قبطیہ بھی کہتے تھے یعنی وہ پردہ جو "قِبط" یعنی مصر سے لایا گیا ہو۔

حضرت زھراء (ع) اور حاضرین کا شدید گریہ،

"فجلست، ثم انّت انہ اجہش القوم لھا بالبکاء"

(پھر آپؑ بیٹھ گئیں اور گریہ کیا اور ایسی جانسوز فریاد لگائی کہ مہاجرین وانصار کو رلا دیا)

"انت" انین سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں نالہ وفریاد۔

"اجہش..." سے مراد یہ ہے کہ کبھی انسان کسی حادثہ سے پریشان اور غمگین ہوتا ہے کہ خوب روتا ہے اپنے آپ کو بے اختیار اس طرف اس طرف گراتا ہے اور کبھی اپنے پہلو کے بل گر پڑتا ہے. خلاصہ یہ کہ اس کا رونا ایک حرکت اور ہلنے کے ساتھ ہے. یہاں پر حضرت زہراء (ع) کا گریہ اور نالہ بھی اتنا جانسوز تھا کہ وہاں پر موجود مہاجرین وانصار کے رونے کی آواز بلند ہوئی اور وہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر روتے تھے. حضرت زہراء (ع) کے گریہ نے اس طرح مجمع کو متاثر کیا تھا۔

"فارتج المجلس، ثم امہلت ھنیئۃ"

(مجمع میں کھلبلی مچ گئی تو آپؑ نے چند لمحے فرصت دی تا کہ وہ سنبھل جائیں)

"حتی اذا سکن نشیج القوم وھدات فورتھم"

(۔ چند لمحوں کے بعد۔ حاضرین کی ہچکیاں بند ہو گئیں اور ان کا جوش وخروش ٹھنڈا پڑ گیا)

" افتتحت الکلام بحمد اللہ تعالیٰ والثناء علیہ والصلوۃ علیٰ رسول اللہ (ص) "

(۔آپؑ نے پہلے مجمع کے جذبات کو بیدار کیا اور اس کے بعد۔

خداوند بزرگ و برتر کی حمد وثنا اور پیغمبر اکرم (ص) پر درود و صلوات کے ساتھ اپنے خطبے کا آغاز کیا)

" فعاد القوم فی بکائہم "

(اس وقت۔ حضور (ص) کی بیٹی (ع) کی مظلومیت کو دیکھ کر مسجد میں موجود۔ لوگ دوبارہ رونے لگے)

اب جب دوسری مرتبہ لوگوں کا رونا بند ہوتا ہے تو آپؑ نے دوبارہ حمد وثنا الٰہی پڑھی۔ فلسفہ شکر اور شکر کرنے کی وجہ سے نعمت کی فراوانی کی یاد دہانی کی، انشاء اللہ ہم دوسرے درس میں اس کی وضاحت کریں گے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دوسرا درس:

- گزشتہ درس کا خلاصہ
- شکر الٰہی کے ساتھ خطبہ کا آغاز
- خدا کی بے شمار نعمتیں
- شکر نعمت اور نعمتوں کی بقاء اور فراوانی
- اخلاص، توحید کا ثمر ہے
- توحید کے ادراک میں افراد کا اختلاف
- خدا، ایک ناشناختہ حقیقت
- کائنات کی خلقت
- ھدف خلقت
- فلسفہ ثواب وعقاب

فَلَمّا أَمْسَكوا عادَتْ فی کَلامِها، فَقالَتْ علیها السلام:

أَلْحَمْدُللهِ عَلیٰ ما أَنْعَمَ، وَلَهُ الشُّکرُ عَلیٰ ما أَلْهَمَ، والثَّناء بِما قَدَّمَ، مِنْ عُمومِ نِعَمٍ إِبْتَدَأَها، و سُبوغِ آلاءٍ أَسْداها، و تَمامِ مِنَنٍ أَوْلاها، جَمَّ عَنِ الإِحْصاءِ عَدَدُها، وَ نَأیٰ عَنِ الْجزاءِ أَمَدُها، وَ تَفاوتَ عَنِ الإِدْراكِ أَبَدُها، و نَدَبَهُمْ لِاسْتِزادَتِها بِالشّکرِ لِاتِّصالِها، وَاسْتَحْمَدَ إِلَی الخَلائِقِ بِاجْزالِها، وَثنی بالنَّدبِ إِلی أَمثالِها؛ وَ أَشْهَدُ أَن لاإِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لاشَریكَ لَه، كَلِمَةٌ جعلَ الإِخلاص تَأْویلها، و ضَمَّنَ القُلوب موصولها، وَ أَنارَ فی التَّفکُّرِ مَعْقُولها، اَلْمُمْتَنع مِنَ الأَبْصارِ رُؤْیَتهُ، وَ مِنَ الأَلْسُنِ صِفَتهُ، وَ مِنَ الأَوهامِ کیفیّته، إِبْتَدَعَ الأَشْیاء لامِنْ شیءٍ کانَ قبلها وَ أَنْشَأَها بِلاٰ إِحْتِذاء أَمْثِلَةٍ إِمْتَثَلَها، کَوَّنَها بِقُدْرَتِه وَ ذَرَأَها بِمَشِیَّتِهِ، مِنْ غَیْرِ حاجَةٍ مِنْهُ إِلیٰ تَکوینِها، وَلا فائِدَةٍ لَه فی تَصویرِها، إِلّا تَثْبیتاً لِحِکمَتِه، و تَنْبیهاً عَلی طاعَتِه، وَ إِظهاراً لِقُدْرَتِهِ، وَ تَعَبُّداً لِبَرِیَّتِه، وَ إِعزازاً لِدَعْوَتِه؛ ثُمَّ جَعَلَ الثَّوابَ عَلیٰ طاعَتِهِ، وَ وَضَعَ العِقابَ عَلیٰ مَعْصِیَتِه، ذِیادَةً لِعبادِه عَنْ نَقِمَتِه وَحیاشَةً لَهُمْ إِلیٰ جَنَّتِه.

***

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

وبه نستعین

گزشتہ درس کا خلاصہ:

ہم نے گزشتہ درس میں یہ کہا کہ جب ابوبکر اور عمر نے حضرت زہراء (ع) سے فدک غصب کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ خبر آپؑ تک پہنچی تو آپؑ اپنے حق کے دفاع کی خاطر اپنی چند مددگار وہمفکر اور رشتہ داروں کو لے کر مسجد نبوی (ص) کی طرف روانہ ہوئیں. وہاں ابوبکر اصحاب کے ایک بڑے مجمع میں بیٹھا ہوا تھا. جب حضرت زہراء (ع) اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچیں تو آپؑ کے اور مردوں کے درمیان ایک پردہ لگایا گیا. اس وقت آپؑ نے ایک جانسوز گریہ کیا جس کی وجہ سے تمام حاضرین بلک کر رو پڑے. آپؑ نے چند لحہ مہلت دی تاکہ وہ خاموش ہوجائیں. پھر آپؑ نے حمد وثناء الٰہی اور رسول خدا (ص) پر درود وصلوات کے ساتھ اپنے سخن کا آغاز فرمایا تو مجمع ایک بار پھر بے اختیار رونے لگا۔

کتاب احتجاج میں روایت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

" فلما امسکوا عادت فی کلامها "

(جب حاضرین خاموش ہوئے تو آپؑ نے اپنا خطبہ شروع کردیا)

شکر الٰہی کے ساتھ خطبہ کا آغاز:

" فقالت علیها السلام: الحمد للّٰہ علی ما انعم و له الشکر علی ما الهم "

(پھر حضرت زہراء (ع) نے فرمایا: نعمتوں سے نوازنے کے لئے تمام تعریفیں اللہ کے لئے مخصوص ہیں

اور الہام بخشنے کی بنا پر شکر بھی اسی ذات کے ساتھ مختص ہے)

جیسا کہ آپ آگاہ ہیں کہ ہر سطح کے افراد کو مد نظر رکھتے ہوئے خطبہ کا ترجمہ اور مختصر سی وضاحت پیش کرنا مقصود ہے اگر ہم خطبہ کی مکمل تشریح کرنا چاہیں (مثلاً یہ کہ "حمد" اور "شکر" کے درمیان فرق، "ما انعم" میں جو "ما" ہے اس کے موصول حرفی یا اسمی (۱) ہونے کا تعین وغیرہ) تو یہ بحث کافی طویل ہوجائیگی جو ہمارے مقصود کے خلاف ہے۔

حضرت زہراء (ع) کے خطبہ کا یہ جملہ " ولہ الشکر علی ما الھم " اچھائیوں اور برائیوں کے الہام (۲) کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں بھی اس کا ذکر ہوا ہے " فالھمھا فجورھا وتقواھا (۳) " نیز (اس حقیقت کی یاد دہانی کہ) یہ (الہام) ایک ایسی عظیم نعمت ہے جس کی خاطر شکر بجا لانا لازم ہے۔

جس نکتہ کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ سوال ہے کہ کیا الہام اور وحی صرف انبیاء واولیاء کے ساتھ مختص ہے یا نہیں بلکہ عام افراد پر بھی وحی اور الہام ہوسکتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں یوں کہنا چاہیے کہ:

۱۔ موصول حرفی وہ ہے جو اپنے صلہ کے ساتھ مصدر کا معنی ومفہوم دیتا ہے اور وہ پانچ ہیں " ان۔ ان۔ کی۔ لو۔ ما " جبکہ موصول اسمی مصدر کی تاویل میں جاتا ہے بلکہ " الذی " وغیرہ کی طرح اپنے مدخول کو معرفہ بناتا ہے۔

۲۔ لغت میں خدا یا مجموعی طور پر ملا اعلیٰ کی طرف سے انسان کو القاء کی جانے والی بات کو الہام کہا جاتا ہے جبکہ وحی تیز اشارے کا نام ہے اور یہ الہام کے مقابلے میں وسیع تر مفہوم رکھتی ہے کیونکہ وحی کبھی دل میں کسی بات کے القاء کے ذریعے ہوتی ہے جیسا کہ " فالھمھا فجورھا وتقواھا " میں ذکر ہوا ہے، کبھی مرموز اور ناشناختہ شعور اور فطرت کے ذریعے ہوتی ہے جیسا کہ شہد کی مکھی اور کبھی کسی موجود کی خلقت کی شکل میں جیسے زمین وآسمان پر وحی کہ جو قرآن میں ذکر ہوئی ہے، کبھی فرشتہ، غیبی آواز، درخت، خواب وغیرہ کے ذریعے خدا کے انبیاء سے گفتگو کرنے کے معنی میں استعمال ہوئی ہے علاوہ ازیں وحی انسان کے علاوہ دوسرے موجودات پر بھی نازل ہوسکتی ہے اور خدا کے علاوہ شیطان کی طرف سے بھی وحی ہوتی ہے جیسا کہ سورہ انعام کی آیت ۱۲۱ سے نمایاں ہے، درحالانکہ الہام صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔

۳۔ سورہ شمس آیت ۸۔ پس خداوند اچھائیاں اور برائیاں کو انسان الہام کرتا ہے۔

انبیاء واولیاء کے علاوہ دوسرے انسانوں خصوصاً متقی اور پرہیزکار انسانوں پر بھی الہام اور وحی ہوسکتے ہیں. قرآن کریم کی مذکورہ (بالا) آیت بھی اس بات کی تائید کرتی ہے، اسی طرح سورہ نحل کی آیت ۶۸ میں ارشاد ہوتا ہے کہ: " واوحینا الیٰ ام موسیٰ ان ارضعیہ[۱]" (ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ وہی موسیٰ کو دودھ پلائے)۔

ان آیات اور حضرت زہراء (ع) کے فرمان سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ "وحی والہام" انبیاء واولیاء کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دوسرے انسانوں پر بھی اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

حقیقت میں الہام (اور وحی) انسان کے مرموز شعور اور اندرونی معرفت کی ایک قسم ہے کہ خداوند (جل جلالہ) نے انسانوں کے علاوہ دوسرے بعض حیوانوں کو بھی اس نعمت سے نوازا ہے. مثال کے طور پر شہد کی مکھی (جس کے بارے میں ارشاد ربانی ہے کہ): " واوحیٰ ربک الی النحل " (تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کو وحی فرمائی)

البتہ اس فرق کے ساتھ کہ انبیاء واولیاء پر جو الہام اور وحی ہوتے ہیں وہ نوعیت اور کیفیت کے لحاظ سے مختلف اور انتہائی قوی ہوتے ہیں اور ہم اس کی حقیقت کو درک نہیں کرسکتے ہیں۔

" والثناء بما قدم"

(تعریف وحمد۔ بھی اسی سے مخصوص ہے ان نعمتوں کی خاطر۔ جو اس نے ہماری۔ خلقت سے۔ قبل پیدا کی ہیں)

یہ اشارہ ہے آسمان وزمین کی خلقت کی طرف جو خدا نے ہماری خلقت سے پہلے پیدا کیے اور ہم اس سے استفادہ کررہے ہیں۔

" من عموم نعم ابتداھا"

(ان تمام نعمتوں کی وجہ سے جنہیں۔ خدا نے بغیر کسی درخواست اور التجاء کے۔ اپنی طرف سے ہی بخشا ہے)

۱۔ اس آیت میں مسئلہ حسن وقبح عقلی کی طرف اشارہ ہے کہ قدیم وجدید علم کلام میں جس سے بحث ہوتی ہے. یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان الہام، فطرت الٰہی خلقت کے ذریعے اس بات پر قادر ہے کہ اچھائیوں اور برائیوں کو درک کرسکے، فجور اور تقویٰ اور عدالت وظلم کو تشخیص دے سکے. لہٰذا افراد اور انسانی معاشروں کا عدالت وظلم اور اچھائیوں اور برائیوں میں اختلاف اکثر اوقات عدل وظلم کے مصداق کے اعتبار سے ہے نہ کہ اصل کے اعتبار سے۔

اس جملے کی ابتداء میں جو "مِن [۱]" کا لفظ ہے وہ بیانیہ ہے جو پہلے جملہ میں مذکور "بما قدم" کی توضیح اور تشریح کررہا ہے۔ "بما قدم" سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو بغیر کسی سوال کے خدا نے بندوں کو بخشی ہیں۔

بنیادی طور پر نعمتوں کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ نعمتیں جو بندہ خدا سے مانگتا ہے، سوال کرتا ہے تو خدا اس سوال کے جواب میں عنایت فرماتا ہے۔ دوسری وہ نعمتیں ہیں جو بندے کے سوال کرنے سے قبل یا اس کی خلقت سے پہلے خدا نے فضل وکرم سے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں۔

حضرت زہراء (ع) کے اس جملہ سے دوسری قسم کی نعمتیں مقصود ہیں جو خدا نے اپنی بے پایان رحمت کی بنا پر بغیر مانگے بندوں کو عنایت فرمائی ہیں۔

"وسبوغ آلاء اسداها"

(اور نعمت کی فراوانی جو اس نے بخشی ہے)

"سبوغ" یعنی فراوانی، "آلاء" کا مفرد "الیٰ" ہے اور یہ لفظ ہمزہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور اس کے معنی ہیں نعمت۔ "الیٰ" کی جمع "االاء" ہے اور علم صرف کے قاعدہ مدّ [۲] کے مطابق دوسرا ہمزہ مدّ میں تبدیل ہوگیا ہے۔ لہذا آلاء کے معنی ہوں گے نعمتیں۔

"اسدیٰ" کے معنی ہیں کسی نعمت کا بخشا جانا۔

یہ جملہ پہلے جملے پر عطف ہے (اور خداوند تبارک وتعالیٰ کے حمد وثناء اور شکر کی علت بیان کررہا ہے) لہذا جملہ کا مقصود یہ ہوگا کہ تعریفیں اس خدائے ذوالجلال کے لئے ہیں جس نے خلقت سے پہلے ہی انسانوں کو نعمتیں عنایت کیں (خلقت کے بعد بھی) بغیر سوال کے اپنی رحمت سے نوازا اور فراوانی کے ساتھ نعمتیں بخشیں۔

۱۔ "مِن" کے کئی معانی ہیں: ان میں سے ایک بیانیہ ہے اور وہ اس وقت استعمال ہوتا ہے کہ جب "مِن" سے پہلے کوئی مبہم حرف یا جملہ موجود ہو کہ جس کی تشریح اور توضیح کی ضرورت ہو جیسے "بما قدم"۔

۲۔ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ اگر دو ہمزے کسی ایک لفظ میں جمع ہوجائیں اور دوسرا ہمزہ ساکن ہو تو دوسرا ہمزہ پہلے حرف میں بدل دیتے ہیں جو پہلے ہمزہ کی حرکت سے موافق ہو اس طرح پہلے ہمزہ پر فتحہ ہو تو دوسرے ہمزہ کو الف میں، اگر زیر ہو تو دوسرے ہمزہ کو یاء میں اور اگر پہلے ہمزہ پر پیش ہو تو دوسرے ہمزہ کو واو میں بدل دیتے ہیں۔

" وتمام منن اولاھـــا "

(شکر وسپاس اس خالق کے لئے۔ جس نے جب نعمتیں بخشیں تو مکمل کر کے بخشیں)

"مِنَن" سے مراد وہ تمام نعمتیں ہیں جو خـــدا نے بطور احسان، بندوں کو بخشیں اور اس پر ا ن جتلایا(۱)۔

خدا کی بے شمار نعمتیں:

" جـمّ عن الاحصاء عددھـــا "

(یہ نعمتیں شمارش سے باہر ہیں)

" جم " کثرت اور فراوان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں " عن " کے ذریعے متعدی ہوا ہے لہذا کثرت اور فراوانی کے بے انتہاء اور بے حساب ہونے پر دلالت رکھتا ہے۔ یعنی خدا کی نعمتیں اس قدر زیادہ اور فراوان ہیں کہ ہم انہیں شمار نہیں کر سکتے۔ آپ٘ کا یہ کلام، قرآن کے اس ارشاد خداوندی کی طرف اشارہ ہے کہ: " وان تعدوا نعمة اللہ لاتحصوھـــا(۲) " (اور اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو اس کا حساب نہ کر سکو گے)۔

" ونای عن الجزاء امـــدھا "

(خدا کی نعمتوں کی ابتداء اور ان کا آغاز ہی۔ اتنا عظیم ہے کہ۔ اس کا عوض اور بدلہ ہمارے بس سے باہر ہے)

" امد " لغت میں کسی چیز کی ابتداء یا اس کی مکمل مدت کو کہا جاتا ہے۔

حضرت زہراء(ع) فرماتی ہیں کہ: خـــدا کی نعمتوں اور احسانات کی ابتداء یا مدت اس قدر زیادہ اور

۱۔ منن لفظ منۃ کی جمع ہے اور قرآن میں سورہ ۳ آیت ۱۶۴ میں نبوت، ہدایت اور رسول خدا٘ کی ذات گرامی کو بہترین نعمت اور مؤمنین پر منت قرار دیا گیا ہے جو انسانوں کے نہ چاہتے ہوئے بھی خدا نے اپنی طرف سے عنایت فرمائی۔

لہذا اس جملے میں لفظ تمام کو منن کی طرف اضافہ کیا گیا ہے اس سے یہ سمجھ آتا ہے کہ اس جملے کا مقصد نعمت ولایت ہے جس کے ذریعے نعمت ہدایت تکمیل ہوئی اور ارشاد ہوا کہ الیوم .... واتممت علیکم نعمتی۔

۲۔ سورہ ابراہیم / ۳۴۔

ہماری قدرت سے باہر ہے کہ ہم اس نعمت کے ابتدائی حصے کا یا مکمل مدت کا عوض (شکر وعبادت وغیرہ) کے ذریعے ادا نہیں کرسکتے اور ہمارے بس سے باہر ہے۔

اگر خداوند جل جلالہ، کسی خاص دن یا معینہ وقت کے لئے بندوں کو اپنے لطف وکرم سے نوازتا تو کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ ہم بھی ایک خاص مدت کے اندر اس نعمت کا بدلہ اور عوض (عبادات) کی شکل میں ادا کرسکتے ہیں، لیکن خدا کی نعمتیں (اور رحمتیں) روز وسال تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کی رحمتوں کی بارش کئی ملین سال پہلے سے برس رہی ہے لہذا اس وقت ہم اس بات پر قادر نہیں ہیں کہ اس کی نعمتوں کا بدلہ اتار سکیں۔

اس نظام ہستی میں ہم ایک ذرے اور تنکے کی حیثیت رکھتے ہیں اور نظام خلقت کا ہر ذرہ، اسی تنکے کی پیدائش اور بقاء ودوام میں بھرپور کردار ادا کرتا ہے. یعنی یہ نظام ہستی ہم آہنگ اور ایک دوسرے سے مربوط ہے ایسا ہرگز نہیں کہ اس نظام سے ہٹ کر ہم کوئی الگ وجود یا تشخص رکھتے ہوں۔

ہمارا وجود، ماں باپ، آباء واجداد کے وجود سے وابستہ ہے اس کے علاوہ، ماحول، طبیعت، آب وہوا، سورج اور زمین وغیرہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر کام کررہے ہیں تاکہ نتیجتاً ایک انسان دنیا میں قدم رکھ سکے۔

لہذا ایک چیز کی خلقت کا آغاز شاید کروڑوں سال پہلے سے ہوچکا ہو اور یہ نظام اس قدر تبدیلیوں اور تغییرات کا شکار ہوچکا ہو اور اسی تغییر کے تسلسل میں اس قدر چکر کاٹے ہوں کہ آخر میں ایک شی وجود میں آئی ہو۔

علم وسائنس نے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ ایک خاص چیز کی پیدائش میں مکمل نظام ہستی دخالت رکھتی ہے (اور اسی کی خاطر فعالیت کرتی ہے)۔

حضرت زہراء (ع) بھی انہیں حقائق کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ: "ونای عن الجزاء امدھا"، یعنی اگر کوئی خدا کی نعمتوں کی ابتداء یا پوری مدت کا عوض دینا چاہے تو یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

"وتفاوت عن الادراک ابدھا"

(ان نعمتوں کے آخر اور انجام کے لحاظ سے انسانوں کے ادراک اور احساس مختلف ہیں)

"ابد" یعنی انجام اور کسی چیز کی نہایت اور آخر. اس جملہ میں "ابد" کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے والے جملے میں "امد" کا معنی ابتداء ہے. یعنی خدا کی نعمتیں اپنی ابتداء اور انتہاء دونوں کے اعتبار سے بہت دور ہیں (آغاز کا علم نہ انجام کا) لہذا ان نعمتوں کا کما حقہ شکر ادا کرنا انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔

شکر نعمت اور نعمتوں کی بقاء اور فراوانی:

"وندبھم لاستزادتھا بالشکر لاتصالھا"

(اور اس۔خدا۔نے اپنے بندوں کو دعوت دی کہ:

نعمتوں کا شکر ادا کریں اور اس میں تسلسل کے ذریعے نعمتوں کی فراوانی اور دوام کا باعث بنیں"

"ندب الیہ" یعنی اس کی طرف بلایا اور دعوت دی. مستحبات کو مندوبات اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ان کو بجا لانے کی دعوت دی گئی ہے۔

"ندبھم لاستزادتھا..." یعنی خداوند (جل جلالہ) نے اپنے بندوں کو دعوت دی کہ وہ نعمتوں کا شکر ادا کریں اور اس طریقے سے درگاہ خداوندی سے نعمتوں کی زیادتی اور فراوانی طلب کریں (دوسرے الفاظ میں یوں عرض کروں کہ) خداوند فرماتا ہے کہ انسان شکر گزار بندہ بنے تاکہ خداوند اپنی نعمتوں میں اضافہ کرے۔

"لاتصالھا" کے بارے میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ "لاتصالھا" کا لفظ شکر سے مربوط ہے اور اس لفظ کے ابتداء میں جو لام ہے وہ لام صلہ (۱) ہے۔

۱۔ عربی زبان میں "ل" کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے ان میں سے ایک اپنے مدخول اور اس سے پہلے کسی دوسرے لفظ یا جملے کے درمیان ربط پیدا کرنا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ: " لاتصالہا " کا لفظ " ندبہم " کے لئے علت ہو، یعنی گویا کوئی سوال کرے کہ نعمتوں کی فراوانی اور کثرت کی خاطر خداوند بندوں کو شکر کی طرف کیوں بلاتا ہے؟ (شکر اور نعمت میں اضافہ کے درمیان کیا رابطہ ہے؟) تو اس کا جواب یہ ہے کہ: " لاتصالہا " یعنی شکر نعمتوں کے مسلسل اور پے در پے نازل ہونے اور بقاء کا سبب بنتا ہے۔

ان دو احتمالات میں سے پہلا احتمال بہتر نظر آتا ہے لہذا اس جملے کا معنی یہ ہو گا کہ نعمتوں کے پے در پے نازل ہونے پر شکر گزار رہو تاکہ خداوند اس کے نتیجے میں تمہیں مزید نعمتوں سے نوازے۔

بہر صورت حضرت زہراء (ع) کا یہ جملہ سورۂ ابراہیم کی آیت نمبر ۷ کی طرف اشارہ ہے کہ جہاں ارشاد ہوتا ہے کہ: " لئن شکرتم لازیدنکم " (اگر تم شکر کرو گے تو بتحقیق میں تمہاری نعمتوں میں اضافہ کروں گا) البتہ شکر نعمت کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس نعمت کو اسی کام اور مقصد کے لئے استعمال کریں جس کا خدا نے حکم دیا ہے۔

" واستحمد الی الخلائق باجزالھا "

(نعمتوں کی کثرت کے مقابلے میں خدا نے بندوں سے چاہا کہ اس کی حمد وثنا کریں)

" اجزال " کسی چیز کو زیادہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے. لہذا " اجزال نعمت " کا معنی نعمتوں کو زیادہ اور فراوان کرنا ہے، آپؑ فرماتی ہیں کہ: خدا نے اپنے بندوں سے یہ چاہا کہ وہ اسی کی نعمتوں پر حمد وثنا کریں تاکہ اس کے مقابلے میں خداوند عالم بھی بندوں کو مزید نعمتوں اور رحمتوں سے سرفراز فرمائے۔

" وثنّی بالندب الی امثالہا "

(ایسی نعمتوں کی طرف خدا نے تمہیں بار بار دعوت دی ہے)

یہاں پر دو احتمال ہیں، جیسا کہ علامہ مجلسیؒ نے بھی فرمایا ہے، ممکن ہے " امثالہا " کا مقصد اخروی نعمتیں ہوں، پس جملہ کا معنی یہ ہو گا کہ جہاں انسان دنیوی نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں وہاں خداوند اسے دعوت دیتا ہے کہ نماز پڑھیں، فقراء کی مدد کریں، مسجد و مدرسہ تعمیر کریں اور دوسرے نیک کاموں

کو انجام دیں تاکہ آخرت میں بھی خدا کی بے حد و حساب نعمتوں سے بہرہ مند ہو سکیں۔

جیسا کہ پہلے فرمایا کہ: " ندبھم لاستزادتھا بالشکر " (یعنی خدا نے بندوں کو شکر بجا لانے کی دعوت دی تاکہ اس کے ذریعے نعمتوں میں اضافہ کیا جائے) یہاں پر بھی فرمایا کہ: " وثنی بالندب الی امثالھا " یعنی خدا نے تمہیں دوبارہ دعوت دی ہے کہ اچھے کام کریں تاکہ دنیوی نعمتوں کی طرح اور ان سے ملتی جلتی نعمتیں تمہیں آخرت میں بھی دی جائیں، اگر اس دنیا میں تمہیں ایک گھر دیا گیا ہے تو آخرت میں نیک اعمال کی بدلے محلات دے گا، یہاں کے ایک باغ کی جگہ پر وہاں جنت کے باغات سے نوازے جاؤ گے. شاید " امثالھا " سے یہی دنیوی نعمتیں مقصود ہوں جو ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں اور مختلف انداز اور طریقوں سے بندگان خدا اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اخلاص، توحید کا ثمر ھے:

" واشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ "

(گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں)

" کلمة جعل[1] الاخلاص تاویلھا "

(خدا کی وحدانیت کی یہ گواہی ایک ایسا کلمہ ہے جس کی تاویل اور نتیجہ اخلاص عمل ہے)

اگر کوئی انسان دل کی گہرائیوں سے یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ خدائے یکتا کے علاوہ کوئی شی موجود ہے ہی نہیں اور خدا کے مقابلے میں تمام کائنات ہیچ اور پوچ ہے صرف اس کی ذات ہے جو عبادت کے لائق ہے اور وہی ذات تمام موجودات کی خالق اور رازق ہے اور صرف وہی بندوں کی ضروریات اور حوائج کو پورا کرتی ہے، اگر کوئی انسان اس مسئلے کو دل سے قبول کرلے تو اس کے تمام اعمال میں خلوص نیت پیدا ہوگا اور وہ اپنی عبادات کو خلوص نیت (اور صدق دل) سے بجا لائے گا۔

۱۔ " جعل " مجہول کی صورت میں بھی پڑھا گیا ہے کہ جس کے معنی یوں بنیں گے، شہادت دیتی ہوں خدا کی وحدانیت کی، یہ ایک کلمہ ہے کہ اخلاص کو اس کا نتیجہ اور تاویل قرار دیا گیا ہے۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے اندر خلوص کا فقدان ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم غیر اللہ کی بھی اہمیت کے قائل ہیں اگر ہم یہ جان لیں کہ صرف خدا، پرستش کے لائق ہے اور جتنے بھی کمالات ہیں وہ خدا کے ساتھ مخصوص ہیں تو ہمارے اعمال میں خود بخود خلوص آجائے گا۔

اسی وجہ سے آپؑ نے فرمایا کہ: "کلمة جعل الاخلاص تاویلها" کہ خدا نے اخلاص عمل کو کلمہ توحید (کلمۂ اخلاص) کا باطن اور تاویل قرار دیا ہے. یعنی کلمہ توحید "لا الہ الا اللہ" کا نتیجہ اور مرجع، عمل میں خلوص نیت ہے. اگر (خدا نخواستہ) ہم اپنے اعمال میں مخلص نہیں ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری توحید (خدا کی وحدانیت پر ایمان) میں خلل اور نقص ہے۔

توحید کے ادراک میں افراد کا اختلاف:

"وضمّن القلوب موصولها"

(اور خدا نے کلمہ توحید کے مفہوم اور اس سے حاصل شدہ ادراک کو دلوں میں جگہ دی ہے)

لفظ "موصولها" کے بارے میں کئی احتمال دیئے جاتے ہیں، لیکن وہ معنی جو میرے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ کلمہ توحید اور "لا الــہ الا اللہ" کی پہچان کے لحاظ سے افراد کے درمیان کافی اختلاف اور فرق موجود ہے. "لا الہ الا اللہ" سے جو معنی و مفہوم اور حقیقت، پیغمبر اکرم (ص) درک فرماتے تھے وہ یقیناً ہماری پہچان اور معرفت سے مختلف ہے. اسی طرح خدا کی معرفت کے حوالے سے حضرت موسیٰؑ اور اس چرواہے کے درمیان (زمین سے آسمان تک کا) فرق موجود ہے. وہ چرواہا جو خدا کو اپنے جیسا ایک جسم اور انسان سمجھتا ہے (۱)۔

۱۔ اس سلسلے میں مثنوی مولوی کے اشعار قابل ذکر ہیں:

دید موسیٰ یک شبانی را بہ راہ   کو ہمی گفت ای خدا وای الہ

(موسیٰ نے راستے میں ایک چرواہے کو دیکھا جو ہمیشہ خدا خدا کیا کرتا تھا)

تو کجائی تا شوم من چاکرت   چارقت دوزم کنم شانہ سرت

(اے خدا! تم کہاں ہو بتاؤ تاکہ میں تجھ پر قربان جاؤں اور تیرے جوتے کو سی دوں اور تیرے بالوں کو کنگھی کروں) ==

"ضمن القلوب" یعنی دلوں میں جگہ دی ہے، دلوں میں رکھی ہے، "موصولہا" کلمہ توحید کے معنی و مفہوم کو ہر انسان اپنی مخصوص استعداد کے مطابق، کلمہ توحید سے ایک مخصوص معنی سمجھتا ہے۔ اس لفظ سے آپ جو درک کرتے ہیں اور خدا کی جو معرفت آپ کو حاصل ہوتی ہے وہ دوسرے شخص کے اس لفظ کی معرفت اور شناخت سے یقیناً مختلف ہے، لہذا اس کلمہ کے بارے میں ہر انسان کے درک اور شناخت کو خداوند نے اس کے دل میں رکھ دیا ہے۔ (یعنی وہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور اس کے ساتھ عشق رکھتا ہے) کیونکہ ہر انسان معانی کو درک کرنے کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

"وانار فی التفکر معقولہا"

(اور جس قدر اس کلمہ کے معانی درک کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں اسی قدر انسان کی فکر و تعقل کو روشنی بخشتا ہے)

اس جملے میں لفظ "معقولہا"، مفہوم کے اعتبار سے لفظ "موصولہا" کی مانند ہے جو پہلے جملے میں گزر چکا ہے۔ ہر انسان کا غور و فکر اور تعقل اس کی استعداد کے مطابق ہی ہوگا اور خداوند اسی قدر انسان کے دل کو نورانیت بخشتا ہے جس قدر اس نے کلمہ توحید کو سمجھنے کے سلسلے میں غور و فکر کیا ہو۔

آنحضرت (ص) سے منسوب ایک دعا میں یہ جملہ ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا: "اللّٰھم ارنی الاشیاء کما ھی" خداوندا! اشیاء جیسا کہ وہ ہیں ویسے ہی مجھے دکھا دے۔ (یعنی ہر چیز کو اس کی اپنی اصلی حالت اور حقیقت میں مجھے دکھا)۔

اس کا مطلب کیا ہے؟ ہم تو ہر چیز کے لئے ایک قسم کا وجود، قدر و قیمت اور شخصیت کے قائل ہیں،

== پھر کہتا ہے کہ: تو کجائی تا سرت شانہ کنم جامہ ات دوزم و بخیہ زنم

(تم کہاں ہو؟ تاکہ تیرے بالوں کنگھی اور لباس کے پھٹے ہوئے حصوں کو سی دوں)

جامہ ات شویم، شپشہایت کشم شیر پیش آورم ای محتشم

(تیرے کپڑوں کو دھوؤں اور تیری جوؤں کو نکالوں نیز تیرے سامنے دودھ پیش کر سکوں ای صاحب عزت)

آخر میں کہتا ہے کہ: ای فدای تو ہمہ بزہای من ای بہ یادت ہی ہی وہیہای من

(تجھ پر میری تمام بکریاں قربان ہوں، ای وہ ہستی کہ میری زندگی کے سارے زمزمے تیری ہی یاد ہے)۔

لیکن پیغمبر اکرم (ص) اشیاء کی طرف رابطے اور غیر مستقل نگاہ سے دیکھتے ہیں، جیسا کہ ربطی معانی (۱) اپنی جگہ پر غیر مستقل اور اسمی معانی سے وابستہ ہوتے ہیں. پیغمبر اکرم (ص) بھی تمام چیزوں کو خدا کے ساتھ وابستہ اور ذات حق تعالیٰ کی جھلک میں ہی دیکھتے تھے (یعنی آپ (ص) کی نظر میں ہر چیز خداوند کا جلوہ اور کرشمہ ہے اور یہ اشیاء ایسی کوئی الگ حقیقت اور وجود نہیں رکھتیں). مولا علی (ع) سے بھی نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا: " مارایت شیئاً الا ورایت اللّٰہ قبلہ وفیہ ومعہ (۲) " یعنی میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا مگر یہ کہ اس چیز سے پہلے، اسی چیز کے اندر اور اس کے ساتھ خدا کو بھی دیکھا ہے۔

پس (معلوم ہوا) کہ خدا کے برگزیدہ بندے اشیاء کو عارضی اور غیر مستقل نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کو ان چیزوں میں ذات حق کی تجلی اور جلوہ نظر آتا ہے. حالانکہ ہم ان اشیاء کے لئے استقلال اور مستقل حیثیت کے قائل ہیں. بنابریں (یہ ایک واقعیت ہے کہ) ہر شخص خدا، توحید اور موجودات کے بارے میں اپنا مخصوص فکر اور نظریہ رکھتا ہے۔

حضرت زہراء (ع) بھی یہاں یہ فرماتی ہیں کہ توحید کے بارے میں انسان کا درک اور فہم، جتنا عمیق اور صحیح ہوگا اسی قدر اور مناسبت سے خداوند دلوں کو نورانیت بخشتا ہے۔

خدا، ایک ناشناختہ حقیقت:

" الممتنع من الابصار رؤیتہ، ومن الالسن صفتہ "

(اللہ، وہ ذات ہے جسے نہ آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی زبان سے اس کی وصف بیاں ہو سکتی ہے)

چونکہ خداوند (سبحان) جسم نہیں رکھتا اور جسم سے پاک و منزہ ہے لہذا اسے آنکھوں یا دوسرے

۱۔ وہ معنی جو قطع نظر کسی دوسرے معنی کے، بذات خود قابل تصور ہو، اسے درک اور تصور کیا جاسکتا ہو اسے اسمی معنی کہا جاتا ہے جیسے چیزوں کے نام وغیرہ. اور وہ معانی جو مستقل طور پر قابل فہم نہ ہوں اور اس کا تصور ہمیشہ کسی دوسرے معنی کے ضمن ممکن ہو تو اسے حرفی یا ربطی معانی کہا جاتا ہے جیسے (ہر۔ کو۔ سے وغیرہ) کے معانی.

۲۔ اسی مطلب کی طرف حضرت علیؑ سے منسوب یہ جملہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ "ما عرفناک حق معرفتک" یعنی اے خداوندا! جس طرح تجھے پہچاننے کا حق تھا ہم نے تجھے نہیں پہچانا.

وسائل کے ذریعے دیکھا نہیں جاسکتا اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس کے وجود اور وجودی کمالات لامتناہی اور نامحدود ہیں. زبان اور دوسرے وسائل اظہار سے اس کی توصیف ممکن نہیں. اسی بناپر ذات خداوندی کی حقیقت سوائے خدا کے کسی مخلوق کے لئے قابل درک نہیں، یعنی ذات خداوندی کی حقیقت کو صرف خدا ہی جانتا ہے کسی اور کے لئے اس کی حقیقت کا صحیح ادراک اور معرفت ممکن ہی نہیں ہے۔

امیرالمؤمنین علیہ السلام نے بھی نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں دقیق اور مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ خدا کی ذات، لامتناہی اور اس کی توصیف، ناممکن ہے (۱)۔

" ومن الاوهـــام کیفیته "

(اس کی کیفیت کو قوۂ واہمہ۔ کے لطیف خیالات۔ بھی درک نہیں کرسکتے)

قوۂ واہمہ کے ذریعے بھی خدا کی کیفیت کا ادراک محال ہے. چونکہ خدا، کیفیت سے برتر و منزہ ہے. البتہ کیفیت اپنے عمومی معنی کے اعتبار سے، یہاں خدا کی اصلی ذات اور حقیقت حق مراد ہے اور یہ کہ خدا کی واقعیت اور حقیقت کیا ہے؟ اور کیسی ہے؟ یہ ایسی چیز ہے جسے انسان نہیں سمجھ سکتا، البتہ (لوگوں میں) ایک یہ خیال کرتا ہے کہ خدا، نور کا گنبد ہے تو دوسرا یہ تصور کرتا ہے کہ خدا دنیا کے بادشاہوں کی طرح تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہے اور حکمرانی فرما رہا ہے، لیکن حقیقت میں قوۂ واہمہ اور لطیف خیالات کے بل بوتے پر خدا کا تصور ممکن نہیں. کیونکہ کمیت اور کیفیت ممکنات کی صفات اور خصوصیات میں سے ہیں اور خدا، چونکہ ہر لحاظ سے واجب الوجود ہے، لہذا تمام مادی صفات اور خصوصیات سے بھی برتر و منزہ ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں: " الحمد للہ الذی لایبلغ مدحته القائلون . . . ولا یؤدی حقه المجتهدون، الذی لایدرکه بعد الهمم ولاینالہ غوص الفطن..." ۔ حمد وثنا اس اللہ کے لئے ہے کہ تعریف کرنے والے جس کی تعریف سے عاجز ہیں اور اس کی معرفت و مدح کی راہ میں جانفشانی کرنے والے اس کی معرفت کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں، ایسا خدا کہ عظیم ہمت اور عزم راسخ رکھنے والے نیز دریائے (معرفت کے ماہر و زیرک) غواص بھی جس کی اصلی حقیقت تک پہنچنے میں بے بس ہیں.

کائنات کی خلقت:

" ابتدع الاشیاء لا من شی کان قبلہا "

(اور خداوند (جل جلالہ) نے اشیاء کو خلق کیا ہے حالانکہ اس خلقت سے پہلے کوئی چیز تھی ہی نہیں)

بغیر نمونے کے کسی چیز کے ایجاد کرنے کو " ابداع " کہا جاتا ہے، در حالانکہ " اختراع " کسی نمونے کو دیکھ کر ایک نئی چیز ایجاد کرنے کا نام ہے. لہذا ابداع اور اختراع میں بڑا فرق ہے، جہاز کا مخترع کسی چیز کو خلق نہیں کرتا بلکہ دنیا میں موجود میٹریل اور پرندوں (کی اڑان) کو دیکھ کر جہاز بناتا ہے اور پھر ایک اور شخص آکر پرانے نمونوں کو دیکھ کر نیا ماڈل اور نیا جہاز بنا لیتا ہے. حالانکہ خداوند عالم نے کائنات کی خلقت میں کسی چیز سے کوئی استفادہ نہیں کیا، حقیقت میں کسی چیز کا وجود ہی نہیں تھا تاکہ یہ کہا جاسکے کہ خدا نے کائنات کی خلقت میں ان سے نمونہ اور نقشہ لیا ہے. لہذا ابتدا سے ہی بغیر کسی نمونے کے نیز کسی چیز سے مدد لئے بغیر اگر کوئی چیز بنالی جائے تو اسے ابداع کہا جاتا ہے۔

حضرت زہراء (ع) یہاں ارشاد فرماتی ہیں کہ: " ابتدع الاشیاء " یعنی خدا نے اشیاء کو ابداع فرمایا ہے اور وہ بھی " لا من شی کان قبلہا " کسی ایسی چیز سے نہیں کہ جو اس کی خلقت سے پہلے موجود ہو بلکہ ابتدا سے ہی کسی نقشے اور میٹریل کی مدد کے بغیر، اس کائنات کو پیدا کیا۔

" وانشاہا بلا احتذاء امثلۃ امتثلہا "

(خدا نے اشیاء کو ایجاد کیا ہے بغیر اس کے کہ پہلے سے موجود کسی نقشے اور نمونے کی تقلید کی ہو)

" کونہا بقدرتہ وذراہا بمشیتہ "

(خدا نے اپنی قدرت اور مشیت وارادے سے کائنات کو وجود بخشا)

اگرچہ ظاہری اسباب وعلل، موجودات کی پیدائش میں تاثیر رکھتے ہیں لیکن یہ تمام علل واسباب اپنے وجود اور تاثیر میں قدرت اور ارادۂ خداوندی کے تابع ہیں اور ان سب کی (علۃ العلل) بازگشت خدا کی قدرت اور اس کے ارادے کی طرف ہے۔

"من غیر حاجة منه الیٰ تکوینها، ولا فائدة له فی تصویرها"

(نہ خدا کائنات کی خلقت کی طرف محتاج تھا اور نہ ہی اس کی تصویر کشی میں اس کا کوئی فائدہ تھا)

خدا نے موجودات عالم کو مختلف شکلوں اور صورتوں میں پیدا کیا ہے تو اس میں خدا کا کوئی فائدہ ہے اور نہ خدا کو اس کی ضرورت، بلکہ یہ خدا کی بے پایان رحمت کا تقاضا تھا کہ مخلوقات کو مختلف شکلوں اور صورتوں میں پیدا کرے۔

خلاصہ یہ کہ کائنات کی خلقت کی خدا کو ضرورت تھی اور نہ ہی اس میں خدا کا کوئی فائدہ۔

هدف خلقت:

(۱) "الا تثبیتاً لحکمته"

(مگر یہ کہ کائنات کو پیدا کیا تاکہ اپنی حکمت کو ثابت کرے)

"حکمت" یعنی مصلحت کے مطابق کسی چیز پر قدرت رکھنا، چونکہ کائنات کی خلقت میں مصلحت ہے اور عقل و منطق کے بھی موافق ہے لہذا خالق کائنات نے اسے خلق فرمایا ہے، چونکہ فیاضیت (جود وسخا) خدا کے کمالات وجودیہ میں شمار ہوتی ہے (اور اس کمال کا تقاضا یہ ہے کہ ممکنات کو زیور وجود سے آراستہ کیا جائے) لہذا خداوند حکیم نے موجودات کو پیدا کیا اور اپنی حکمت کو اسی راہ سے ثابت اور ظاہر کیا ہے۔

(۲) "وتنبیهاً علیٰ طاعته"

(نیز اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی طرف آپ کو متوجہ کرے)

یعنی خداوند، دنیا کو خلق کر کے تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہے کہ تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ خدا کی بندگی اور اطاعت کرو، جب یہ دیکھتے ہو کہ خود تمہاری ہستی اور یہ سارے موجودات، خدا نے ہی پیدا کیے ہیں اور اسی کی خلق کردہ ہیں تو لازمی طور پر اسی کی اطاعت کرنی چاہیے اور واجبات پر عمل کرنا چاہیے اور جن

امور سے تمہیں نہی کی گئی ہے اور رد کا گیا ہے، اس کے ارتکاب سے باز رہیں اور خدا کی مخالفت نہ کریں۔

(۳) " واظھاراً لقدرته "

(اور اپنی قدرت اور طاقت کو ظاہر کرے)

خداوند عالم نے یہ ارادہ فرمایا کہ اپنی قدرت کی بزرگی اور عظمت کو آشکار کرے۔ حدیث قدسی میں بھی آیا ہے کہ: " کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف " (میں ایک مخفی خزانہ تھا چاہا کہ پہچانا جاؤں) لہذا کائنات کی خلقت کا ہدف اور مقصد پروردگار کی معرفت اور نتیجتاً جن وانس کی معنوی ترقی اور ان کا تکامل ہے۔

(۴) " وتعبّداً لبریّته "

(بندوں۔ کے ضمیروں۔ میں عبادت و بندگی کی روح پروان چڑھے)

جب لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ ایک خالق ہے جو ان تمام نعمتوں، رحمتوں اور کمالات کا سرچشمہ ہے تو ان کے دل میں خود بخود بندگی کا احساس پیدا ہو گا اور یہ احساس اور آگاہی، عبودیت اور بندگی کے مقام میں بندوں کے لئے ایک عظیم کمال شمار ہوں گے۔ قرآن میں بھی خداوند متعال ارشاد فرماتا ہے کہ: " وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون[۱] " (جن وانس کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں) عبادت و بندگی کو ہدف آفرینش اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ خدا کی عبادت اور اس کی پرستش انسان کے کمال اور خدا کے حضور میں اس کی قربت اور منزلت میں اضافہ کا سبب بنتی ہے اور جب انسان کے اندر بندگی اور تعبد کی روح بیدار ہوجائے تو خود بخود خدا کے سامنے جھک جاتا ہے اور غیر اللہ سے کٹ جاتا ہے۔

(۵) " واعزازاً لدعوته "

(اپنی دعوت۔ اور دین۔ کی تقویت اور استحکام کی خاطر۔ وہی دعوت جو انبیاء کے ذریعے انجام پائی۔)

۱۔ الذاریات /۵۶۔

"اعزاز" کے معنی ہیں تقویت اور کسی چیز کو استحکام بخشنا. انبیاء واولیاء جو لوگوں کو خدا کی جانب بلاتے ہیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنی دعوت کی سچائی پر دلیل اور برہان رکھتے ہوں، اس حوالے سے بہترین اور مستحکم ترین دلیل یہی نظام ہستی اور کائنات کی خلقت ہے (جو کہ یہ بتاتی ہے کہ) اس جہاں کا ایک خالق ہے اور تمام موجودات (اپنے وجود اور بقاء کے لحاظ سے) خدا کی طرف محتاج ہیں اور اس سے جدا ہو کر زندگی نہیں گزار سکتے. اسلامی روایات میں بھی خدائے واحد و حکیم کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے نظام ہستی میں موجود نظم وانضباط سے استدلال کیا گیا ہے.(1) پس کائنات کی خلقت کے مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ خدا کی اس دعوت میں استحکام پیدا کیا جائے جو انبیاء واولیاء کے ذریعے سے انجام پاتی ہے۔

فلسفہ ثواب وعقاب:

"ثم جعل الثواب على طاعته، ووضع العقاب على معصيته"

(پھر اس نے اپنی اطاعت کے لئے ثواب وجزا اور نافرمانی کے لئے عقاب وسزا مقرر فرمائی ہے)

"ذيادة لعباده عن نقمته"

(ایسے کام جو خدا کے قہر وغضب کا موجب بنتے ہیں ان سے اپنے بندوں کو دور رکھے)

لفظ "ذیادۃ" ذاد، یذود کا مصدر اور یہ "ذود" سے مشتق ہے اس کی اصل "ذوادۃ" تھی واو، الف میں بدل دی گئی ہے اور اس طرح "ذیادۃ" ہو گیا. اس کے معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں. اس جملہ کا مقصد یہ ہے کہ خداوند چاہتا ہے کہ اپنے بندوں کو ایسے امور سے دور رکھے جو خدا کے غیظ وغضب اور قہر کا سبب بنتے ہیں (لہذا ان امور کو حرام قرار دے کر ان سے روکا گیا ہے) اطاعت پر ثواب اور معصیت

1۔ اصول کافی کتاب التوحید باب حدوث العالم کی پانچویں روایت میں نقل ہوا ہے کہ: "... فلما رأينا الخلق منتظما والفلك جاريا والتدبير واحدا... دل صحة الامر... على ان المدبر واحد..." یعنی جب کائنات میں ایک خاص نظم وترتیب اور تدبیر کا مشاہدہ کرتے ہیں تو نظام کا صحیح ہونا اور اس کا استحکام، اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس نظام کو چلانے والا بھی صرف ایک ہی ہے، نیز روایت نمبر 1 سے 4 میں اسی مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پر عقاب و عذاب مقرر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ: عقاب کا باعث بننے والے کاموں سے انسان کو روکے اور اس طرح حضرت انسان کو جنت کی طرف لے چلے۔ بنابر ایں، ثواب و عقاب کے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ بندگان خدا اس کی (ابدی) نعمتوں (اور نوازشوں) سے فائدہ اٹھائیں۔ پس اطاعت کرنے اور نافرمانی سے اجتناب کا فائدہ صرف انسان کو ملتا ہے، خدا کا اس میں کوئی فائدہ اور اس کی کوئی (ذاتی غرض) نہیں ہے کیونکہ یہ انسان ہیں جو اطاعت کے نتیجے میں ثواب اور کمال کے (درجات) پر فائز ہوں گے اور معصیت و گناہ سے دور رہنے کی وجہ سے خدا کے قہر و غضب اور عذاب سے محفوظ رہیں گے۔

" وحیاشة لهم الیٰ جنته "

(۔ثواب و عقاب اس لئے کہ۔ بندوں کو جنت کی طرف جمع کرے)

"حیاشه" کا لفظ "حاش یحوش" کے مصدر سے ہے اور جمع کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جب مال مویشوں کو کسی جگہ پر جمع کیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ "حاشهم" یعنی ان کو اکٹھا کیا گیا ہے۔

"حیاشة لهم الی جنته" "جمعا لهم الی جنته" کے معنی میں استعمال ہوا ہے لہذا اس جملہ کا مقصد یہ ہوگا کہ: خدا چاہتا ہے کہ انسانوں کو اختلاف و تفرقے سے نجات دلائے اور ان کو (دین کے پلیٹ فارم پر) متحد کرے اور ان کو جمع کرے اور بہشت کا شوق دلا کر انہیں جنت کی راہ پر گامزن کرے۔

خلاصہ یہ کہ خدا کا مقصد یہ تھا کہ انسان (معنوی ترقی اور) تکامل پیدا کرے اور ایسے امور سے اجتناب کرے جو انساں کو خدا کے غیظ و غضب میں مبتلا کردیتے ہیں [۱]۔ البتہ کمال کے درجات ہیں اور وہ بہشت جس کا وعدہ خدا نے اپنے نیک بندوں کو دے رہا ہے اس بہشت سے کہیں بلند و بالاتر ہے جس کے انتظار میں ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔ قرآن اس بارے میں فرماتا ہے کہ: " ورضوان من اللّٰہ اکبر [۲]" (رضائے خداوندی کا مقام بہت بالاتر ہے)۔

۱۔ اس جملے سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ بہشت اور جنت کسی قوم کے اختلاف و تفرقہ کے ساتھ سازگار نہیں کیونکہ اختلاف اور افتراق کی وجہ سے (افراد اور معاشرے کے) بہت سے جائز حقوق ضائع ہوجاتے ہیں۔

۲۔ سورہ توبہ / ۷۲۔

بہشت رضوان ایسی ہے جہاں بندہ، اپنے بارے میں خدا کی رضا اور خوشنودی کا احساس کرتا ہے (کمال اور درجات کے اعتبار سے) اور یہ اس جنت کے مقابلے میں کہیں بلند و بالاتر ہے، جہاں مادی لذتوں کی تسکین کا سامان فراہم کیا گیا ہے (۱) (اور اس کی خصوصیات، حور و قصور اور باغ و بستان کے ضمن میں بیان کی گئی ہیں)۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۔ اہل معرفت دو قسم کی بہشت کے قائل ہیں، ایک جنت محسوس جو آخرت میں حواس کے ذریعے احساس کی جا سکے گی۔ دوسری جنت معقول، جو جنت محسوس سے بالاتر ہے۔ بہرکیف دونوں جنتوں کے مراتب اور درجات ہیں۔ بہشت رضوان اور بہشت لقاء جو اولیاء اللہ کے ساتھ مخصوص ہے جنت معقول کے (عالی) درجات میں شمار ہوتی ہیں۔

تیسرا درس:

- مقام بندگی، مقام رسالت کا سبب ہے
- رسالت سے قبل کے مقامات
- توراۃ اور انجیل کی پیشین گوئی
- خلقت کائنات سے قبل، پیغمبر اکرم (ص) کا انتخاب
- کائنات کے بارے خدا کا علم ازلی
- رسالت پیغمبر (ص) کے مقاصد
- عصر بعثت کی معاشرتی اور مذہبی صورت حال
- انسانوں کی ہدایت کے لئے پیغمبر (ص) کا قیام
- رسول خدا (ص) کی رحلت
- سامعین سے خطاب
- قرآن اور عترت (ع)، پیغمبر (ص) کی دو یادگار چیزیں
- ہدایت کرنے والی، قرآن کی خصوصیات

وَ أَشْهَدُ أنّ أبى مُحَمَّداًﷺ عَبْدُه وَ رَسُولُهُ، اخْتارَهُ وانْتَجَبَهُ قَبْلَ أن أرْسَلَه، وَ سَمّاهُ قَبْلَ أن اجْتَباهُ، وَ اصْطَفاهُ قَبْلَ أن ابْتَعَثَهُ؛ إذِ الخَلائق بالغَيْبِ مَكنُونَة و بِسِتْرِ الأَهاويلِ مَصُونَةٌ وَ بِنِهايَةِ العَدَمِ مَقْرُونَة، عِلْماً مِنَ اللهِ تَعالىٰ بِمَآيِلِ الأُمورِ، وَ إحاطَةً بِحَوادِثِ الدُّهور، وَ مَعْرِفَةً بِمَواقِعِ المَقْدُور؛ إبْتَعَثَهُ اللهُ إتْماماً لِأَمْرِه و عَزيمةً عَلىٰ إمْضاءِ حُكمِه وَ إنفاذاً لِمَقاديرِ حَتْمِه، فَرَأى الأُمَمَ فِرَقاً في أَدْيانِها، عُكَّفاً عَلىٰ نيرانِها، عابِدَةً لِأَوْثانِها، مُنْكِرَةً للهِ مَعَ عرفانها؛ فَأَنارَ اللهُ بِأَبى مُحَمَّدٍﷺ ظُلَمَها، وَ كَشَفَ عَنِ القُلُوبِ بُهَمَها، وَ جَلىٰ عَنِ الأَبْصارِ غُمَمَها؛ وَ قامَ فِى النّاسِ بِالهِدايَةِ، فَأنْقَذَهُمْ مِنَ الغِوايَةِ، وَ بَصَّرَهُم مِن العِماية، وَ هَداهُم إلَى الدّينِ القَويم، وَ دَعاهُم إلَى الصِّراطِ المُسْتَقيم؛ ثُمَّ قَبَضَهُ اللهُ إلَيْهِ قَبْضَ رَأْفَةٍ وَ اخْتِيارٍ، وَ رَغْبَةٍ و ايثارٍ؛ فَمُحَمَّدٌﷺ مِنْ تَعَبِ هٰذِهِ الدّار فى راحَةٍ، قَدْ حُفَّ بِالمَلائِكَةِ الأَبْرارِ، وَ رِضْوانِ الرَّبِّ الغَفّارِ، و مُجاوَرَةِ المَلكِ الجَبّار؛ صَلَّى اللهُ عَلىٰ أَبي نَبِيِّهِ وَ أَمينِهِ عَلَى الوَحْى و صَفِيِّهِ وَ خِيَرَتِهِ مِنَ الخَلْقِ وَ رَضِيِّهِ، وَ السَّلامُ عَلَيْهِ وَ رَحْمَةُ اللهِ وَ بَرَكاتُه.

ثُمَّ الْتَفَتَتْ إلىٰ أَهْلِ المَجلِسِ وَ قالَتْ:

أَنْتُمْ عِباد اللهِ وَ نصب أَمرِه و نَهْيِه، وَ حَمَلَة دينه وَ وَحْيِه، وَ أُمَناء اللهِ عَلىٰ أَنْفُسِكُمْ وَ بُلَغائه إلَى الأُمَم، وَ زَعَمْتُمْ حَقٌّ لَكُم، لِلّهِ فيكُمْ عَهْدٌ قَدَّمَهُ إلَيْكُمْ وَ بَقِيَّةٌ اسْتَخْلَفَها عَلَيْكُم، كِتابُ اللهِ النّاطِقِ وَ القُرآنُ الصّادِق وَ النُّور السّاطِع و الضِّياء اللّامع، بَيِّنَةٌ بَصائِرُهُ، مُنْكَشِفَةٌ سَرائرُهُ، مُنْجَلِيَةٌ ظَواهِرُهُ، مُغْتَبِطَة بِه أَشْياعُه، قائِدٌ إلَى الرِّضْوان اتباعه، مؤدٍّ إلَى النَّجاةِ اسْتِماعُه، بِه تنال حُجَج اللهِ المُنَوَّرَة و عَزائمه المُفَسَّرَة و مَحارِمه المُحَذَّرة، و بَيِّناتُه الجالية، و بَراهينهُ الكافِية، وَ فَضائِله المَنْدُوبَة، و رُخَصه المَوهُوبَة، وَ شَرايِعه المَكْتُوبَة.

❋❋❋

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

وبہ نستعین

مسجد نبوی میں حضرت زہراء(ع) کے خطبہ کو ہم عبد اللہ بن حسن (رضوان اللہ تعالیٰ علیہ) کی روایت کے مطابق نقل کر رہے تھے (البتہ تفصیل اور زیادہ تشریح نہیں ہے بلکہ تحت اللفظی ترجمہ اور مختصر سی وضاحت ہے اور اس میں تمام طبقوں کو مدنظر رکھا گیا ہے)۔

گزشتہ درس میں حضرت زہراء(ع) کی خدا کی وحدانیت پر گواہی (پر مشتمل ابحاث) کو بیان کیا گیا ابھی انہی کی زبانی، رسول خدا(ص) کی رسالت کی گواہی کو شروع کرتے ہیں۔

مقام بندگی، مقام رسالت کا سبب ہے:

" واشھد ان ابی محمداً عبدہ ورسولہ "

(میں گواہی دیتی ہوں کہ میرے پدر بزرگوار محمد (ص) خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہے)

یہاں پر حضرت (زہراء(ع)) نے "عبدہ" کے لفظ کو لفظ "رسولہ" سے پہلے ذکر کیا، تشہد میں بھی ہم کہتے ہیں کہ " اشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ " یعنی "عبدہ" کو پہلے اور "رسولہ" کو بعد میں ذکر کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام(ص) خدا کا بندہ تھا اور آپ بندگی و عبودیت میں انتہائی بلند و بالا مقام پر فائز ہو چکے تھے (اور مقام بندگی میں اس حد تک تکامل کی وجہ سے) آپ کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ آپ خدا کے پیغمبر اور رسول بن سکیں اور نبوت ورسالت کی ذمہ داری آپ کو سونپی جائے۔

قرآن میں خداوند " سبحان الذی اسریٰ برسولہ " کہنے کے بجائے یہ فرماتا ہے کہ : " سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ[1] " (پاک و منزہ ہے وہ خدا جو اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی جانب لے گیا)۔ یہاں پر بھی رسول کے بجائے لفظ عبد کو انتخاب کرنے کا سبب شاید یہی ہو سکتا ہے کہ : چونکہ آپ (ص) خدا کے ایک بندے ہونے کے اعتبار سے بندگی کے اعلیٰ ترین درجات پر فائز تھے تو خدا نے اس رات، آپ (ص) کو معراج کا شرف بخشا۔ پس عبودیت رسالت کا سبب اور اس سے مقدم ہے[2]۔

رسالت سے قبل کے مقامات؛

" اختارہ وانتجبہ قبل ان ارسلہ "

(خداوند (جل جلالہ) نے آپ (ص) کو رسول بنانے سے پہلے ہی آپ (ص) کو انتخاب کر لیا تھا)

" اختار " باب افتعال سے مفرد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اس کے معنی ہیں انتخاب کیا۔ " انتجب " بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

خدا نے آپ (ص) کو رسول بنا کر بھیجنے سے پہلے ہی آپ (ص) کو انتخاب کیا تھا۔ اس اعتبار سے کہ رسالت کا منصب سنبھالنے سے قبل ہی خدا کی خصوصی توجہ اور عنایات، آپ (ص) کے شامل حال تھیں۔ خدا نے آپ (ص) ہی کا انتخاب فرمایا تھا اور آپ (ص) کے اندر (رسالت کی ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے) کافی صلاحیت اور مکمل لیاقت موجود تھی۔ آپ (ص)، مقام رسالت پر فائز ہوئے، کیونکہ ہر کوئی خدا کا رسول اور پیغمبر نہیں بن سکتا۔

۱۔ سورۂ اسراء / ۱۔

۲۔ یہ معروف حدیث کہ " العبودیۃ جوہرۃ کنھھا الربوبیۃ "، یعنی مقام بندگی ایک ایسا گوہر ہے کہ جس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان ہی خدا کے لئے بن جائے) یہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ رسالت اور معراج انسان کا اصلی سبب، چاہے جسمانی ہو یا روحانی، اور اسی طرح دیگر معنوی کمالات کے بالاترین درجات پر فائز ہونے کی بنیاد، عبودیت ہی ہے۔ (عبودیت یعنی انسان اپنی فکر و نظر، اپنے قلب و ضمیر اور اعضاء و جوارح کو خدا کی حاکمیت کے حوالے کر کے اس کے تقاضوں کو پورا کرے)۔

" وسماہ قبل ان اجتباہ "

(اور خدا نے آپ (ص) کے انتخاب سے پہلے ہی آپ (ص) کے اسم مبارک کا ذکر فرمایا)

یہاں پر دو احتمال ہیں:

۱۔ شاید آپ (ع) کی مراد یہ ہو کہ پیغمبر اکرم (ص) کے اس دنیا میں مقام نبوت پر مبعوث ہونے سے پہلے ہی خدا نے حضرت آدم (ع) اور دوسرے انبیاء (ع) نیز فرشتوں کے سامنے آپ (ص) کا ذکر کیا ہو اور ان کو آپ (ص) کے نام مبارک سے آگاہ فرمایا ہو۔

۲۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپ (ص) کے رسالت پر مبعوث ہونے سے قبل خدا نے آپ (ص) کا اسم مبارک " محمد " تعیین فرمایا ہو۔

تورات اور انجیل کی پیشین گوئی:

" واصطفاہ قبل ان ابتعثہ "

(رسالت پر مبعوث ہونے سے قبل ہی خدا نے آپ (ص) کا انتخاب کیا)

پیغمبر اکرم (ص) کی اوصاف (حمیدہ) میں سے ایک صفت مصطفیٰ (یعنی برگزیدہ) ہے. تورات میں آپ (ص) کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک صفت "برگزیدہ" ہے. (۔ آپ کوشش کریں کہ تورات اور انجیل کا مطالعہ کریں کیونکہ وہاں مفید مطالب بیان ہوئے ہیں۔)

تورات میں (اپنے عام ترمعنی کے مطابق) کتاب "اشعیاء" کے بتالیسویں باب میں بیان ہوا ہے کہ "ابھی میرا برگزیدہ... " میرا برگزیدہ کے اس لفظ کے بعد ایسی صفتیں بیان ہوئی ہیں جو پیغمبر اکرم (ص) پر مکمل صادق آتی ہیں لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ وہاں پر بھی لفظ مصطفیٰ ہی ذکر ہوا ہو، لیکن تورات کا ترجمہ کرنے والوں نے مصطفیٰ کے لفظ کو بعینہ ذکر کرنے کے بجائے اس کا بھی ترجمہ کردیا ہو، کیونکہ تورات کے مترجمین کی ایک غلطی یہی تھی کہ وہ ناموں کا بھی ترجمہ کردیتے تھے. مثلاً انجیل میں آنحضرت (ص) کے جو مختلف نام ذکر ہوئے ہیں ان میں سے ایک "احمد" ہے جیسا کہ قرآن کریم نے

بھی حضرت عیسی (ع) کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ : " ومبشراً برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد [1] " لیکن ترجمہ کرنے والوں نے " احمد " کا ترجمہ کر کے متن میں ترجمے کو لکھ دیا۔ مثال کے طور پر فارسی میں "بسیار ستودہ " اور انگریزی میں " پری کلیٹس " لکھا ہے [2] در حالانکہ مناسب (بلکہ لازم) یہ تھا کہ تلفظ " احمد " ہی کو لکھ دیتے۔ لہذا ممکن ہے کہ تورات کی کتاب " اشعیاء " کے اصلی متن میں " مصطفیٰ " ہی ذکر ہوا ہو اور مترجمین نے اسے " برگزیدہ " کے لفظ سے ترجمہ کیا ہو۔ اس مطلب پر ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ وہاں ایسی صفات بیان ہوئی ہیں جو پیغمبر اکرم (ص) اور ان کی امت پر مکمل صادق آتی ہیں [3]۔

بہرصورت پیغمبر کے اوصاف میں سے ایک آپ (ص) کا مصطفیٰ (خدا کی طرف سے برگزیدہ) ہونا ہے اور یہاں پر حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ : " خدا نے آپ (ص) کو اس وقت چنا جب آپ (ص) پیغمبر کی حیثیت سے مبعوث نہیں ہوئے تھے "۔

۱۔ سورۂ صف / ۶ (میں تمہیں ایک " رسول " کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا)۔

۲۔ " پری کلیٹس " یعنی وہ شخص جس کی زیادہ تعریفیں کی جائیں۔ اس لفظ کا معرب " فارقلیط " ہے۔

۳۔ تورات، کتاب اشعیاء کے ۴۲ ویں باب میں آیا ہے کہ " اس وقت میرا وہ بندہ جس کی میں نے دستگیری کی اور میرا وہ " برگزیدہ بندہ " کہ میری جان اس سے خوشنود ہے، میں اپنی جان (یعنی رحمت) کو اسے دوں گا تا کہ وہ ساری قوموں کے لئے انصاف فراہم کرے، وہ فریاد و نالہ نہیں کرے گا۔ وہ اپنی آواز کو اونچا نہیں کرے گا اور اسے گلی کوچوں میں نہیں سنوائے گا، ٹوٹی ہوئی نی کو نہیں توڑے گا۔ ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کو خاموش نہیں کرے گا۔ یہاں تک کہ صحیح معنوں میں عدالت قائم کرے گا، وہ کمزور ہو کر شکست نہیں کھائے گا یہاں تک کہ زمین پر انصاف برقرار کرے گا اور (دنیا کے) جزیرے اس کی شریعت کے منتظر ہوں گے، یہوہ خدا، جس نے آسمانوں کو پیدا کیا اور ان کو پھیلایا، زمین اور اس کی نعمتوں کو بھی پھیلایا اور ایسی قوم کو جس میں جان ہو ان کو جان دے گا اور سالکان راہ کو روح عنایت کرے گا اس طرح فرماتا ہے کہ میں جو یہوہ ہوں تجھے عدالت کے ہمراہ پکارا ہے اور تیرے ہاتھ پکڑ کر تجھے برقرار اور قائم رکھوں گا اور تجھے امت کے لئے عہد و پیمان اور قوموں کے لئے نور قرار دوں گا تا کہ نابیناؤں کو بینائی دے، اسیروں کو زندان سے رہائی دے اور ظلمت کے باسیوں کو رہائی دلائے، میں یہوہ ہوں اور میرا نام یہی ہے، میں اپنی عظمت و جلال کو کسی دوسرے کو نہیں دوں گا اور اپنی حمد تراشے ہوئے بتوں کو ہرگز نہیں دوں گا، ابھی ابتدائی واقعات پیش آئے ہیں اور نئی چیزوں کے بارے میں ان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی تمہیں آگاہ کرتا ہوں،....

خلقت کائنات سے قبل، پیغمبر اکرم (ص) کا انتخاب،

"اذا الخلائق بالغیب مکنونۃ"

(ایسے زمانے میں آپ (ص) کا انتخاب عمل میں آیا کہ

تمام موجودات عالم غیب کے پردوں میں پوشیدہ (ومعدوم) تھے)

حضرت محمد (مصطفیٰ) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس وقت خدا نے اپنی خصوصی توجہ اور لطف وکرم سے انتخاب کیا جب دوسرے تمام ممکنات عالم معدوم تھے اور بالفاظ دیگر "عدمستان" تھا. جیسا کہ انسان اپنی خیالی قوت کے ذریعے سوچتا ہے کہ ایک ایسا زمانہ بھی تھا جسے زمانہ عدم کہا جاتا تھا اور تمام موجودات اس تاریک "عدمستان" میں خاموش پڑے ہوئے تھے پھر وہاں وجود کی نورانی کرنیں پڑیں اور انہیں روشن کیا اس طرح موجودات نے عالم عدم سے عالم وجود میں قدم رکھا. گفتگو اور تلفظ کے مقام پر بھی کہا جاتا ہے کہ "عالم عدم میں" یعنی ایسے دور میں جبکہ کسی چیز کا کوئی وجود ہی نہیں تھا. بہر حال چونکہ خدا کا علم ازلی ہے نظام وجود کی خلقت سے قبل ہی خدا کو معلوم تھا اور اس پر مکمل احاطہ کر رکھتا تھا کہ یہ نظام ہستی کب تحقق پذیر ہو گا اور کس مرتبہ اور مقام کا حامل ہو گا یہ سب خدا بہتر طور پر جانتا تھا. اسی مرتبہ میں جب کسی چیز کا کوئی وجود ہی نہیں تھا اور تمام خلائق معدوم اور پردہ غیب میں پنہان تھے تو خداوند سبحان نے پیغمبر (ص) کو چنا اور اپنی ذات کے لئے آپ (ص) کو انتخاب فرمایا (۱)۔

"وبستر الاھاویل مصونۃ"

(اور اس وقت پیغمبر (ص) کو اپنے لئے چنا جب مخلوقات خوف وہراس

اور وحشت واضطراب کے پردوں میں محفوظ تھیں)

"اھاویل" اہوال کی جمع اور اہوال، ہول کی جمع ہے. بنا بریں "اھاویل"، جمع الجمع (۲) ہے اور "ہول"

۱۔ رسول خدا چونکہ اشرف مخلوقات ہونے کی وجہ سے انسان کامل کا کاملترین مصداق ہیں اور یہی کائنات کا بنیادی مقصد بھی ہے اور حدیث قدسی: "لولاک لما خلقت الافلاک" بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ کائنات کی خلقت کا بنیادی مقصد اس کی تخلیق سے قبل ہی خدا کے علم میں تھا.

۲۔ یعنی ایک لفظ جو کہ جمع ہے اس کی بھی جمع ہو جیسے اھاویل جمع ہے اہوال کی اور اہوال جمع ہے ہول کی.

کے معنی ہیں، خوف وہراس اور وحشت۔

حضرت زہراء (ع) یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ خداوند عالم نے اس وقت پیغمبر اسلام (ص) کا انتخاب فرمایا جب تمام موجودات، عالم عدم میں خوف ووحشت کی حالت میں (سرگردان اور پنہان) تھے البتہ تعبیریں مجازی ہیں اور تقریر اور خطابہ کے مقام پر استعمال کی جاتی ہیں ورنہ موجود ہونے سے قبل، موجودات کی کوئی حیثیت ہی نہیں کہ جو عدمستان نامی کسی عالم میں دحشت واضطراب کی حالت میں پھنسے پھریں۔

" وبنھایۃ العدم مقرونۃ "

(اور تمام موجودات عدم کی آخری سرحدوں کے قریب تھے)

عالم وجود میں کوئی موجود نامی شئی نہیں تھی، تمام موجودات معدوم محض تھے۔ ممکن ہے کوئی یہ سوال کرے کہ اس وقت جبکہ کچھ بھی نہ تھا تو خدا نے کس طرح اس وقت پیغمبر اکرم (ص) کا انتخاب کیا؟ اس سوال کے جواب کو ذیل کے فقرہ میں خود حضرت زہراء (ع) نے بیان کردیا ہے۔

کائنات کے بارے میں خدا کا علم ازلی:

" علماً من اللہ تعالیٰ بمایل (۱) الامور ... "

(عدم محض کے دور میں پیغمبر کا انتخاب فرمایا کیونکہ خداوند ہر چیز کے انجام اور اس کی عاقبت سے آگاہ ہے)

(یہاں پہلے سوال کا جواب دیا جا رہا ہے کہ) اگرچہ اس وقت کوئی چیز نہیں تھی لیکن خداوند تبارک وتعالیٰ مستقبل سے آگاہ اور مطلع تھا، وہ نظام ہستی کے بارے میں بخوبی علم رکھتا تھا کہ مستقبل میں کیسے کیسے واقعات رونما ہوں گے اور اس نظام ہستی کا نچوڑ اور خلاصہ، حضرت محمد مصطفیٰ (ص) جیسے گل دستے کی شکل میں سامنے آئے گا۔

جب ایک کسان کوئی باغ لگاتا ہے تو پہلے دن سے ہی ان لذیذ میوہ جات کی طرف اس کی نظر ہوتی ہے جو اس کی جد وجہد اور سعی وعمل کے نتیجے میں اس کو نصیب ہوتے ہیں اس مقصد کو علت غائی

۱۔ بعض دوسرے نسخوں میں "بمآیل الامور" کے بجائے "بمایلی الامور" ذکر ہوا ہے۔

سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (اس مثال سے واضح ہوا کہ) خداوند عالم نے جو کہ علام الغیوب ہے (کائنات کی علت غائی) حضرت پیغمبر اسلام (ص) کو ازل سے ہی انتخاب کیا تھا اور آپ (ص) پر ابتداء ہی سے خصوصی توجہ تھی۔

حضرت زہراء (ع) پیغمبر اکرم (ص) کے کمال اور آپ (ص) کی عظمت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس سوال کا جواب بھی دینا چاہتی ہیں کہ جب کچھ بھی نہیں تھا تو کس طرح خدا نے آنحضرت کا انتخاب فرمایا؟ اس ممکنہ سوال کے جواب میں فرماتی ہیں کہ:

(۱) " علماً من اللہ تعالیٰ بمایل الامور "

(خدا ازل سے ہی تمام امور کے انجام کو جانتا ہے)

بنابریں خداوند یہ بھی بخوبی جانتا ہے کہ کائنات وجود میں آئے گی اور اس نظام کی علت غائی اور ہدف و مقصود میرے حبیب محمد مصطفیٰ (ص) ہوں گے۔

"مایل" (اول) سے مشتق ہے اور "اول" کے معنی ہیں کسی چیز کا مستقبل اور آئندہ۔

(۲) " واحاطۃ بحوادث الدھور "

(خداوند ازل سے حوادث روزگار پر مکمل علمی احاطہ رکھتا تھا اور بخوبی جانتا تھا)

ابتداء ہی سے خداوند جانتا تھا کہ یہ عالم، حوادث کا عالم ہوگا، اس میں مختلف حوادث اور گوناگوں واقعات رونما ہوں گے آخر کار (کائنات کے اس تکاملی سفر میں) ایک موڑ پر محمد مصطفیٰ (ص) نامی وہ بزرگوار پیغمبر (اپنے وجود سے اس نظام کو زینت بخشے گا) یہ پیغمبر اشرف مخلوقات اور انسانوں کا ایک مکمل نمونہ ہوگا۔

بعبارت دیگر: ابتداء ہی سے خداوند حوادث عالم سے آگاہ تھا لہذا رسول خدا (ص) کی ذات کو اپنے لئے انتخاب کیا، چونکہ آپ (ص) ایک انسان کامل کا مظہر اور خلقت کی علت غائی تھے اور (یہ واضح سی بات ہے کہ) مقصد اور علت غائی ابتدا ہی سے توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔

(۳) " ومعرفۃ بمواقع المقدور "

(خداوند ازل سے مخلوقات کے۔ اس کائنات میں کسب کرنے والے۔ مقام اور ان کی حیثیت سے آگاہی رکھتا تھا)۔

" مقدور " یعنی خدا کے مقدرات (موجودات عالم جن کی خلقت پر خدا قادر ہے اور خدا نے ان کی حیثیت، مقام و مرتبہ اور کردار و خصوصیات کو معین فرمایا ہے) " بمواقع المقدور " ممکنات عالم کی حیثیت اور مقام۔ اوپر کے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ خداوند ازل سے جانتا تھا کہ کائنات کا ہر ذرہ موجود ہونے کے بعد اس کا کیا مقام اور مرتبہ ہوگا۔ بطور مثال، خدا ابتداء سے ہی آگاہی رکھتا تھا کہ (مخلوقات میں سے) ایک پیغمبر اکرم (ص) ہوگا تو دوسرا، اس کے مقابل میں ابوسفیان اور ابوجہل اور کوئی امام حسین (ع) ہوگا تو کوئی دوسرا شمر۔ پس حضرت آدم (ع) کی خلقت سے قبل پیغمبر اکرم (ص) کے انتخاب اور چناؤ کے معنی یہ ہیں کہ عالم طبیعت کا یہ نطفہ اور یہ (آب و) خاک تکامل کے مراحل طے کرتے ہوئے اپنی آخری منزل پر جب پہنچے گا تو اس کا لذیذ پھل، حضرت محمد (ص) کی مقدس ذات کی شکل میں نمودار ہوگا (۱)

رسالت پیغمبر (ص) کے مقاصد،

(اس بارے میں چار امور کا ذکر خطبہ میں ہوا ہے: (۱) کائنات کی تکمیل (۲) حکم ازل کا جاری ہونا (۳) حتمی فیصلوں کا نفاذ (۴) انسانوں کی روشنیوں کی طرف ہدایت)

(۱) " ابتعثہ اللہ اتماماً لامرہ "

(خدا نے رسول خدا (ص) کو مبعوث فرمایا تاکہ اپنے امر۔ کائنات۔ کی تکمیل کرے)

وہ کمالات جن کا کائنات میں موجود ہونا ضروری تھا، خدا نے چاہا کہ ان کمالات کو آنحضرت (ص) کو مبعوث کرنے کے ذریعے سے متحقق کیا جائے، یعنی آپ (ص) تشریف لائیں، دوسروں کو ہدایت اور ان کی رہبری کریں اور جس کام کی تکمیل کا خدا خواہاں تھا اسے تکمیل اور تمام کریں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ خدا نے بشر کی ہدایت کے لئے بہت سے پیغمبروں کو مختلف دینوں کے ساتھ بھیجا، چونکہ وہ

۱۔ البتہ یہ جبر کے نتیجے میں نہیں بلکہ اپنی آگاہی اور ارادے کے ساتھ یہ تکاملی سفر طے کیا جائیگا، کیونکہ خدا کا ازلی علم، انسان نامی ایک ایسی مخلوق سے تعلق رکھتا ہے جو اپنے عقل و اختیار کی مدد سے معنوی تکامل کے مراحل کو اپنے ارادے اور اپنی معرفت کے ذریعے طے کر سکتا ہے اور اس راہ میں رسول اکرم (ص) جیسی بعض ہستیاں تکامل اور ترقی کی چوٹی تک پہنچ سکتی ہیں اور " کون جامع " (مخلوقات کا نچوڑ) کی اصطلاح کا مصداق بن جاتی ہیں۔

دین اپنے زمانے کے ساتھ مخصوص ہوتے تھے، بعد میں آنے والے پیغمبر کے ذریعے تکمیل کے مراحل سے گزرتے آئے، یہاں تک کہ خدا کا عظیم الشان نبی (ص) دین اسلام کے ساتھ مبعوث ہوا تاکہ انسانیت کو (خدا کی طرف) ہدایت کرے۔ اس دین کی تشریح اور توضیح کی ذمہ داری رسول خدا (ص) اور آپ (ص) کے گرانقدر اوصیاء کو سونپی گئی۔

دین اسلام دوسرے تمام ادیان سے جامع تر اور کاملتر ہے اور اسی دین کے ذریعے خدا نے اپنے بندوں پر حجت تمام کی، کیونکہ اسلام انسانیت کے لئے ایک جامع اور ہمہ گیر نظام (حیات) رکھتا ہے اور فردی و اجتماعی، عائلی اور سیاسی، غرض زندگی کے تمام شعبوں میں انسان کی راہنمائی کرتا ہے، نیز یہ دین کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں اور ہر قسم کی کمی اور نقص سے پاک ہے۔ اگر چند ایک مسائل میں ہم مشکلات کا شکار ہو جائیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے دین کو صحیح طریقے سے سمجھا نہیں ہے لہذا اس نقص اور کمی کا سبب ہم ہی ہیں نہ دین اسلام۔ اگر ظالم و جابر حکمران اور سلاطین، ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کو یہ موقع فراہم کرتے کہ وہ دین کو صحیح اور مکمل طریقے سے بیان فرماتے اور (ائمہؑ کو) صحیح معنوں میں اسلامی ریاست قائم کرنے کی فرصت ملتی اور آنحضرت (ص) کی احادیث، آپ (ص) کے بیانات اور آپ (ص) کی سیرت طیبہ، آنے والی نسلوں تک پہنچنے دیتے (اور اس راہ میں گمراہ کن اور خطرناک رکاوٹیں کھڑی نہ کرتے) تو انسانیت ہر دور میں اپنی فطرت کے مطابق خدا شناسی اور توحید کی طرف کھینچتی چلی جاتی کیونکہ توحید اور خدا شناسی جو دین اسلام کی بنیاد ہے، کی عمارت فطرت پر کھڑی کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ: "**فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیہا، لاتبدیل لخلق اللّٰہ**[1]" (خدا پر ایمان۔ وہی فطرت خداوندی ہے کہ جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، خدا کی خلقت میں کوئی تبدیلی ناممکن ہے)۔

احادیث اور اسلامی احکام کا وہ مجموعہ جو ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے، علوم و معارف کا عظیم سمندر ہے اور بعض موارد میں صدیاں گزرنے کے بعد آج کی دنیا جس حقیقت کو

۱۔ سورۂ روم / ۳۰۔

درک کررہی ہے اور صدیوں قبل کسی موضوع پر امام صادق علیہ السلام نے جو بات فرمائی تھی دانشور اور محققین آج اس کو سمجھ رہے ہیں. یہ بات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اسلام ایک خاص زمانے اور ماحول کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ قیامت تک، کاروان انسانیت کی ہدایت کا ضامن اور ان پر حجت ہے۔

بنابرایں خدا نے دین اسلام کو نازل فرمایا اور رسول خدا (ص) کو مبعوث فرمایا تاکہ بندوں پر اپنی حجت تمام کرے۔

(۲) " وعزیمۃ علی امضاء حکمہ "

(پیغمبر (ص) کی بعثت کے ذریعے خدا یہ چاہتا تھا کہ دستور و منشور ازل کو نافذ اور جاری کرے)

ابتداء ہی سے خدا یہ چاہتا تھا کہ اس دنیا میں کامل ہستیاں پیدا ہوجائیں اور انسان مکارم اخلاق کے زیور سے آراستہ ہوجائے اور اسی مقصد کے حصول کی خاطر آنحضرت (ص) کو پیغمبر بناکر بھیجا تاکہ رسول مقبول (ص) اور دین اسلام کے ذریعے اپنے اس حکم اور مشیت کو عملی جامہ پہنائے. رسول خدا (ص) سے (ایک) حدیث نقل ہوئی ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا ہے: " بعثت لاتمم مکارم الاخلاق " (مجھے پیغمبر کا منصب سونپا گیا تاکہ میں اخلاقی خوبیوں کی تکمیل کروں) درحقیقت، رسول خدا (ص) کی پیغمبری کا بنیادی مقصد اور فلسفہ یہ تھا کہ انسانوں کو کمال اور حق مطلق کی طرف ہدایت کی جائے اور خدا کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے محبوب کی بعثت کے ذریعے اپنے ازلی حکم اور منشور کو جاری کرے۔

(۳) " وانفاذاً لمقادیر حتمہ (۱) "

(۔ خدا نے رسول خدا (ص) کو بھیجا۔ تاکہ اپنے حتمی فیصلوں کو نافذ کرے)

کبھی موصوف، صفت کی طرف اور کبھی صفت موصوف کی طرف اضافہ ہوتے ہیں. اس عبارت میں موصوف یعنی "مقادیر" اپنی صفت "حتمہ" کی طرف اضافہ ہوا ہے. " انفاذ " کسی حکم کے جاری کرنے

۱۔ بعض دوسرے نسخوں میں " لمقادیر رحمتہ " مذکور ہے. بنابریں اس جملے کا معنی یہ ہوگا کہ چونکہ قرآنی تعبیر کے مطابق آپؐ " رحمۃ للعالمین " ہیں لہذا خدا کی تکوینی اور تشریعی رحمت کا نفاذ اور اجراء آپؐ کی بعثت سے مکمل ہوتا ہے.

کو کہتے ہیں " لمقادیر حتمۃ " یعنی، خدا کے حتمی اور اٹل فیصلے۔ خدا کے حتمی اور ناقابل تبدیل و تنسیخ فیصلوں میں سے ایک یہ تھا کہ رسول اکرم (ص) اس کائنات میں تشریف لائیں اور پیغمبری و ہدایت کا منصب سنبھال لیں، بنابریں آپ (ص) کے مبعوث ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ خداوند جل جلالہ نے اپنے اس فیصلے پر عمل درآمد فرمایا اور اس کو جاری فرمایا۔

عصر بعثت کی معاشرتی اور مذہبی صورت حال۔

" فرای الامم فرقاً فی ادیانہا "

(۔ جب بعثت کا وقت آیا۔ پس دیکھا کہ قومیں دین و مذہب کے لحاظ سے مختلف فرقوں میں بٹ چکی تھیں)

" رای " کے فعل میں جو ضمیر ہے وہ ممکن ہے لفظ اللہ کی طرف پلٹے اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسول خدا (ص) کی طرف پلٹے، اگر ضمیر کا مرجع لفظ اللہ ہو تو جملہ کا معنی یہ ہو گا کہ اگر آپ پوچھیں کہ خدا نے پیغمبر (ص) کو کیوں مبعوث فرمایا؟ تو آپ (ع) فرماتی ہیں کہ جب خدا نے دیکھا کہ لوگ گروہوں میں بٹ چکے ہیں، بعض بتوں کی پوجا کرتے ہیں تو کوئی سورج کی عبادت کرنے میں مشغول ہیں۔ اس وقت دوسرے بہت سارے گروہ چاند اور ستاروں کی پرستش پر کمر باندھے ہوئے ہیں۔ اس طرح انسانیت اپنے دین کے بارے میں تفرقہ کا شکار ہو کر گروہوں میں بٹ چکی ہے (جب خدا نے انسانوں کی اس حالت کو دیکھا تو آپ (ص) کو بھیجا تا کہ انسانیت کو اختلاف و پراکندگی سے نجات دلائیں) لیکن اگر "رای" کی ضمیر کا مرجع، پیغمبر اکرم (ص) ہو تو مذکورہ فقرہ کا معنی یہ ہو گا کہ جب آپ (ص) مبعوث ہوئے تو آپ (ص) نے دیکھا کہ لوگ مذہبی اختلافات کی وجہ سے گمراہی اور ضلالت کا شکار ہو چکے ہیں۔

" عکفاً علیٰ نیرانہا "

(یہ قومیں اس آگ کو سینے سے لگائے ہوئے تھیں کہ جسے خود انہوں نے جلایا تھا)

جس طرح " طالب " کی جمع " طلّب " ہے اسی طرح " عاکف " کا جمع " عکّف " ہے اور اس کا معنی " ساتھ رہنے والے " ہے۔

یہاں دو احتمال دئے جاسکتے ہیں: پہلا احتمال یہ کہ "نیرانہا" سے آتشکدے مراد ہیں اور "عکف" سے مجوسی، اس طرح یہ جملہ مجوسیت کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ لوگوں نے زندگی کا جو طریقہ اپنایا ہے وہ ان کو جہنم میں پہنچا دے گا اس طرح وہ اپنے ہاتھوں سے جہنم کی آگ کو جلا رہے ہیں (اور اس کے لئے ایندھن فراہم کرنے میں دن رات مصروف ہیں اس طرح وہ آتش جہنم کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں) (۱)۔

"عابدة لاوثانہا"

(اپنے بتوں کی پوجا کرتے تھے)

"اوثان" "وثن" کی جمع ہے اور "وثن" کے معنی ہیں بت۔ عصر رسالت میں پوری انسانیت مختلف گروہوں کی شکل میں گمراہی اور ضلالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہی تھی اور لوگ خدائے یکتا کی عبادت کے بجائے لکڑی اور پتھر سے بنے ہوئے بتوں کی پوجا کرتے تھے۔

"منکرة للّٰہ مع عرفانہا"

(خدا کی معرفت رکھنے کے باوجود اس کا انکار کرتے تھے)

ہر انسان کی سرشت میں خدا نے، خدا پرستی اور توحید کو ودیعت کیا ہوتا ہے لہذا خدا کی وحدانیت کا مسئلہ فلسفی اور علمی اعتبار سے ایک طے شدہ اور مسلم بات ہونے کے علاوہ ایک فطری مسئلہ بھی ہے۔ پس اگر ہر انسان، آلودگیوں سے پاک فطرت کی طرف رجوع کرے تو وہ یقین کے ساتھ خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت کا اقرار کرے گا۔ قرآن بھی فرماتا ہے کہ: "فطرة اللّٰہ التی فطر الناس علیہا، لاتبدیل لخلق اللّٰہ (۲)" (خدا پرستی ہی کی بنیاد پر انسانوں کی خلقت ہوئی ہے اور خدا کا یہ قانون تغییر پذیر نہیں)۔ عصر رسالت میں بھی لوگ خدا کی معرفت رکھتے تھے اور اس کی وجہ ان کی فطرت کی آواز تھی

۱۔ شاید حضرت زہراء کا مقصود یہ ہو کہ اس وقت کے انسان، اپنی جہالت و گمراہی کی بنا پر جس دین ومذہب اور آداب و رسوم پر اعتقاد رکھتے تھے وہ ان کی فکری صلاحیتوں اور شرافتمندانہ زندگی کے اصول کے خلاف آسمانی بجلی ثابت ہو رہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ انہی لایعنی آداب و رسوم اور باطل ادیان پر کٹ مرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

۲۔ سورۂ روم / ۳۰۔

جو دل کی گہرائیوں سے اٹھتی تھی لیکن عمل کے میدان میں ندائے فطرت سے روگردانی کرلیتے تھے اور بتوں کو پوجا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا "منکرۃ للہ" وہ خدا کے منکر تھے حالانکہ "مع عرفانہا" ان کے وجود میں خدا کی معرفت موجود تھی، فطرت اور باطن کے اعتبار سے وہ خدا کی پہچان تو رکھتے تھے لیکن ظاہر میں اور عمل کے میدان میں خدا کا انکار کرتے تھے یا کفار کی مانند عمل کرتے تھے۔

(۴) "فانار اللّٰہ بابی محمد ظلمہا"

(پس خدا نے میرے والد گرامی حضرت محمد (ص) کے ذریعے ان کی تاریکیوں کو روشنیوں سے منور کیا)

خداوند کریم نے رسول خدا (ص) کو مبعوث فرما کر، طاغوت، جھوٹے بتوں نیز بت پرستوں کی ظلمتوں کا خاتمہ کردیا اور ایمان، توحید اور خدا پرستی کی روشنیوں سے عالم کو روشن فرمایا۔ آنحضرت (ص) نے معاشرے کو خدا اور صرف خدا پر ایمان کی جانب دعوت دی، بت پرستی اور ظلم وستم سے مبارزہ کیا اور اس راہ میں مشکلات اور سختیاں برداشت کیں۔ اس طرح ۲۳ سال کی طویل کٹھن اور مشقت آور جدوجہد کے بعد کامیاب ہوئے اور بت پرستی کی جگہ خدا پرستی، دشمنی کی جگہ دوستی اور ظلم وستم کی جگہ عدالت اور مساوات قائم کی۔

حق بات یہی ہے کہ آنحضرت (ص) کے مبعوث ہونے کی برکت سے ہی خداوند عالم نے اس دور کی تاریکیوں اور ظلمتوں کو نور اور روشنی میں تبدیل فرمایا۔

"وکشف عن القلوب بُہَمَہا"

(اور خدا نے بندوں کے دل سے ابہامات کے پردے ہٹا دیے)

"بُہَم" کا لفظ "بہم" سے مشتق اور "بہتہ" کی جمع ہے۔ مشکوک اور غیر واضح امور کو "بہم" کہتے ہیں۔ اس زمانے کے لوگوں کے دلوں میں جو ابہامات تھے اور جو حقائق مشکوک اور غیر واضح تھے، خدا نے اپنے حبیب (ص) کے ذریعے ان شکوک کو دور کرکے واضح اور روشن فرمایا۔

اگر کوئی شخص موت وزندگی، کائنات کے مبدء، آخرت اور حشر نشر کی کیفیت وغیرہ کے بارے میں شکوک وشبہات سے دوچار تھا اور ذہن میں مختلف سوالات اٹھتے تھے تو آپ (ص) نے ان حقائق کو

بیان فرمایا اور ان کے دلوں میں موجود ابھامات کو دور فرمایا۔

" وجلیٰ عن الابصار غممھا "

(۔دل کی۔آنکھوں سے۔جہالت وتحیر۔کے پردے ہٹا کر اسے بینائی بخشی)

" غمم "" غمۃ " کی جمع اور پردے کے معنی میں ہے اور یہ لفظ حیرت کہ جو خود عقل وشعور پر پڑنے والا ایک پردہ محسوب ہوتا ہے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

خداوند عالم نے ہمارے نبی (ص) کو بھیج کر لوگوں کو تحیر اور حیرانگی سے نجات دی اور ان کے دل کی آنکھوں پر جو پردے پڑے ہوئے تھے انہیں ہٹایا، اس طرح وہ اس قابل ہوگئے کہ حق وعدالت اور انسانیت کی راہ پر گامزن ہوجائیں اور بربریت وجاہلیت سے دست بردار ہوجائیں۔

انسانوں کی ھدایت کے لئے پیغمبر (ص) کا قیام:

" وقام فی الناس بالھدایۃ "

(آپ (ص) نے لوگوں کی ہدایت کی خاطر قیام کیا)

انسانوں کی ہدایت کے لئے آپ (ص) نے کوئی کسر نہ چھوڑی، سختیوں اور شدید مشکلات کو تحمل فرمایا۔ دنیوی مقام ومنصب اور مال وثروت سے چشم پوشی فرمائی تاکہ ضلالت وگمراہی کی دلدل میں پھنسے ہوئے انسانوں کو نجات دلائیں اور صراط مستقیم اور خدا کی طرف ان کی رہبری کریں۔

" فانقذھم من الغوایۃ، وبصرھم من العمایۃ "

(پس لوگوں کو گمراہی سے نجات دلائی اور ان کو اندھے پن سے نکال کر بصیرت بخشی)

آپ (ص) کی ۲۳ سالہ زحمتوں اور محنت کا ثمر یہ نکلا کہ لوگوں کو گمراہی، باطل پر ضد اور ہٹ دھرمی سے نجات دلائی اور ان کے دلوں کو نور بصیرت سے منور کیا اور فسق وفجور میں غوطہ ور لوگوں اور اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کردینے والی قوم کو انسانیت کے اعلیٰ ترین درجات پر فائز کرنے میں آپ (ص) کامیاب ہوئے۔

" وهداهم الی الدین القویم، ودعاهم الی صراط مستقیم "

(آپ (ص) نے لوگوں کو محکم، قوی اور استوار دین کی طرف ہدایت کی نیز انہیں صراط مستقیم کی طرف بلایا)

آپ (ص) نے لوگوں کو ایک ایسے دین کی طرف ہدایت کی جو ان کے استحکام اور بقاء کا سبب بنا، ایسا دین اور مذہب لازمی طور پر، محکم اور استوار قوانین پر مشتمل ہو گا جو کسی عقب ماندہ معاشرے کو نجات دے سکے اور لوگوں کو ضلالت سے زندگی کے صحیح اور سیدھے راستے کی طرف لاسکے۔

رسول خدا (ص) کی رحلت:

" ثم قبضه الله الیه قبض رافة واختیار "

(پھر خدا نے آپ (ص) کی روح کو قبض فرمایا اور یہ قبض روح، خدا کی شفقت اور اختیار کی وجہ سے ہوئی)

خداوند عالم، اپنے حبیب سے محبت رکھتا تھا اور آپ (ص) پر مہربان تھا، اسی بنا پر آپ (ص) کو اپنی بارگاہ میں بلالیا تاکہ اس دنیا کی سختیوں کی قید سے آزاد اور خدا کی بے انتہار حمت سے ہمکنار ہو جائیں۔

" اختیار " کے لفظ میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ خدا نے آپ (ص) کا انتخاب کیا اور آپ کی قبض روح ہوئی. دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپ (ص) کی قبض روح آپ (ص) کے اپنے ارادہ واختیار سے ہوئی. روایات میں بھی ذکر ہوا ہے کہ عزرائیل کسی سے قبض روح کے بارے میں اجازت نہیں لیتا تھا اور صرف آنحضرت (ص) سے اس نے اجازت لی تو آپ (ص) نے اپنے اختیار سے عزرائیل کو قبض روح کی اجازت دی، اس طرح عزرائیل نے آپ (ص) کی روح مبارک کے ساتھ " ملکوت اعلیٰ " کی طرف پرواز کی۔

" ورغبة وایثار "

(۔ اور یہ قبض روح۔ آپ (ص) کی اپنی رغبت اور جان نثاری کی وجہ سے ہوئی)

پیغمبر خدا (ص) اپنی رغبت، خوشی اور ایثار کے ساتھ راضی ہوگئے کہ اس دنیا سے رخت سفر باندھ لیں، ایسا نہیں ہوا کہ آپ (ص) اپنی رحلت پر ناراض ہوں اور خدا سے مزید زندگی کی درخواست کریں بلکہ

آپ (ص) کو بہت خوشی ہوئی کہ اس پست وحقیر دنیا سے ملکوت اعلیٰ کی طرف پرواز کر رہے ہیں. اس طرح آپ (ص) نے دنیا کی زندگی پر اخروی زندگی کو ترجیح دی۔

" فمحمد (ص) من تعب هذه الدار فی راحة "

(پس حضرت محمد (ص) ۔ رحلت پاکر۔ اس دنیا کی سختیوں سے آرام وراحت پاگئے)

" قد حُفّ بالملائكة الابرار، ورضوان الرب الغفار، ومجاورة الملك الجبار "

(۔ خدا کے ۔ نیک سرشت فرشتوں کے حلقے، بخشنے والے پروردگار کی خوشنودی اور صاحب جبروت بادشاہ ۔ خدا ۔ کی ہمنشینی میں آپ (ص) ۔ آرامش کے ساتھ خدا کی رحمتوں سے مستفیض ہو رہے ہیں۔)

" جبار " صیغہ مبالغہ ہے اور اس کا معنی کمی اور نقائص کو پورا کرکے مکمل کرنے والا ہے، چونکہ خداوند عالم بھی ۔ مخلوقات ۔ کی کمی اور نقائص کو دور فرماتا ہے اور انسانوں کو معنوی کمالات کی طرف راہنمائی کرتا ہے لہذا خداوند عالم کو " جبار " کہا جاتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ " جبار " قہر وغلبہ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہو۔

" صلى الله علىٰ ابى، نبيه وامينه على الوحى "

(خدا کے درود وصلوات میرے والد بزرگوار پر ہوں کہ جو خدا کے پیامبر اور اس کی وحی کے امانتدار تھے)

" وصفيه وخيرته من الخلق ورضيه "

(۔ درود وسلام اس پیغمبر پر جو ۔ خدا کا برگزیدہ، مخلوقات میں سے انتخاب شدہ اور خدا کا پسندیدہ بندہ تھا)

" والسلام عليه ورحمة الله وبركاته "

(آپ (ص) پر خدا کی سلامتی، رحمت اور برکتیں نازل ہوں)

" صلوات " اور " سلام " کے معانی تقریبا ایک دوسرے کے قریب ہیں لیکن عموماً " صلوات " درود وتحیت اور " سلام " سلامتی کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

سامعین سے خطاب:

یہاں تک حضرت زہراء سلام اللہ علیہا نے اپنے خطبے میں خدا کی وحدانیت اور اپنے بابا کی رسالت کی

گواہی دی، پھر اہل مجلس اور انصار و مہاجرین جو مسجد میں موجود تھے کی طرف متوجہ ہوئیں اور ان سے خطاب کرتے ہوئے چند کلمات ارشاد فرمائے۔

" ثم التفتت الی المجلس وقالت، "

(پھر مسجد میں موجود سامعین کی طرف متوجہ ہوئیں اور فرمایا:)

" انتم عباد اللّٰہ؛ نُصب امرہ ونہیہ "

(خدا کے بندو! خدا کے امر و نہی کی نشاندہی کرنے والے تم ہی ہو)

"نصب" اس چیز کو کہا جاتا ہے جو علامت کے طور پر مقرر کی گئی ہو جیسے جھنڈا، پرچم، بیز اور ٹریفک سگنل وغیرہ۔ شاید اس جملے (آپ ہی خدا کے امر و نہی کے لئے نصب۔ علامت۔ ہیں) کا مقصد یہ ہو کہ تم ہی علامت کے طور پر منصوب کیے گئے ہو اور خدا کا امر و نہی تمہاری طرف متوجہ ہے۔

حقیقت میں آپ (ع) کا مقصد یہ ہے کہ پروردگار کے امر و نہی کا بنیادی ہدف بندگان خدا ہی ہیں دوسرے موجودات نہیں، کیونکہ قانون گزاری اور تشریع کو صرف انسانوں کے لئے عمل میں لایا گیا ہے دوسرے موجودات چونکہ مکلف نہیں ہیں اسی لئے ان کو نہ امر کیا گیا ہے اور نہ نہی (۱) شاید اس فقرہ کا مطلب یہ ہو کہ خدا کے اوامر و نواہی کا محور تم ہو اور احکام شریعت کی علامت بھی تم ہو اور دوسرے لوگ۔ شریعت کے مسائل میں۔ تمہاری پیروی کرتے ہیں۔ ذیل کا فقرہ بھی دوسرے احتمال کی تائید کر رہا ہے۔

" وحملۃ دینہ ووحیہ "

(اور تم خدا کے دین اور وحی کے حامل ہو)

تم ایسے مہاجر و انصار ہو کہ جنہوں نے وحی اور قرآن کو نازل ہوتے دیکھا، پیغمبر (ص) کی ہمنشینی سے فیضیاب ہوئے۔ اس طرح تم دین اور وحی کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے ہو۔ لہذا دین کو آنے والی

۱۔ سورۂ جن میں صراحت کے ساتھ جنوں کو صالح و مؤمن اور کافر میں تقسیم کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں پر بھی احکام خداوندی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

نسلوں تک منتقل کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ پس دین اور وحی کے حامل ہونے کا معنی و مقصود یہ ہے کہ دین اور وحی کی تعلیمات کو صحیح اور مکمل طریقے سے آنے والی نسلوں تک پہنچائیں۔ اور اس امانت کو مکمل دیانت داری کے ساتھ ادا کریں۔

" وامناء اللّٰہ علیٰ انفسکم، وبلغائہ الی الامم "

(خدا نے آپ کو آپ کے اوپر امین قرار دیا ہے۔ پس اپنی ذات کے ساتھ خیانت نہ کریں۔

اور آپ نے ہی اسلام کو دوسری قوموں تک پہنچانا ہے)

رسول خدا (ص) پوری انسانیت اور ساری دنیا کے لئے اسلام لائے تھے لیکن جب آپ (ص) اس دنیا سے جا رہے تھے تو اسلام نے ابھی جریزۃ العرب کی حدود سے باہر قدم نہ رکھا تھا لہذا انصار و مہاجرین کی ذمہ داری بنتی تھی کہ وہ اسلام کو دنیا کی تمام قوموں تک پہنچائیں اس لئے آپ (ع) فرماتی ہیں کہ: " بلغائہ " یعنی تم خدا کے دین کو پہنچانے والے ہو " الی الامم " دوسری قوموں تک۔ آپ (ع) کا مقصد یہ ہے کہ۔ اے اصحاب رسول (ص)۔ آپ پر فرض ہے کہ اسلام اور عدالت کا عملی نمونہ بن جائیں تاکہ دوسری قومیں آپ کی پیروی کریں اور اسی راہ کو اپنائیں جس پر آپ چل رہے ہیں، لیکن تم نے اسلام کے آغاز میں ہی راستے کو بدل دیا اور اصلی راہ سے منحرف ہوگئے ہو تو دوسری قومیں کس طرح تمہاری پیروی کر سکتی ہیں؟ اور تم کس طرح اسلام کو ساری دنیا تک پہنچا سکتے ہو؟۔

" وزعمتم حق لکم "

(اور تم خیال کرتے ہو کہ۔ مذکورہ۔ مقامات۔ اور الٰہی منصب۔ تمہارا حق ہیں)

یہاں پر آپ (ع) اعتراض آمیز طنز سے کام لیتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ آپ تو اپنے آپ کو دین کے پیشوا اور وحی کے امین سمجھتے ہو حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں، چونکہ آپ اس وقت دین خدا کو تبدیل کر چکے ہو اور اسے کسی دوسری راہ پر لگا چکے ہو۔ لہذا اب تم وحی کے نگہبان نہیں رہے۔ اسی لئے آپ (ع) فرماتی ہیں کہ: " وزعمتم حق لکم " (تم گمان کرتے ہو کہ تم ان مناصب الٰہیہ کا استحقاق رکھتے ہو) حالانکہ تم میں اب یہ صلاحیت نہیں رہی کہ تم وحی و دین کے حامل اور نفس کے امین اور دین

کے مبلغ کے مقام پر فائز ہو چونکہ نہ صرف تم خود منحرف ہوگئے ہو بلکہ اسلام کو بھی انحراف کا شکار بنایا ہے. البتہ بعض دوسری کتابوں میں مندرجہ بالافقرہ کے بجائے " وزعمتم حق له فیکم " ذکر ہوا ہے. اس صورت میں معنی یہ ہو گا کہ۔ تم اپنے آپ کو ناحق دین کا حامل، وحی کا امین اور مبلغ شریعت سمجھتے ہو، حالانکہ دینی نصوص کی حوالے سے ۔ دین کا صحیح اور برحق پیشوا تمہارے درمیان موجود ہے. اس صورت میں یہ جملہ ابوبکر کے ذریعے خلافت اور امت کی رہبری کے غصب ہونے کی طرف اشارہ ہے، لیکن بظاہر پہلا احتمال مناسب نظر آتا ہے اور یہ فقرہ ایک جملہ معترضہ (۱) ہو گا (۲)۔

قرآن اور عترت، پیغمبر (ص) کی دو یادگار چیزیں:

" للّٰہ فیکم عهد قدمه الیکم "

(خدا کا تمہارے ساتھ ایک عہد و پیمان ہے جو پہلے ہی تمہیں بتا دیا ہے)

اس عہد و پیمان کے بارے میں دو احتمال موجود ہیں: پہلا احتمال یہ کہ اس عہد و پیمان سے مراد وہ عہد ہے جو عترت کے بارے میں رسول خدا (ص) نے اپنی زندگی میں لوگوں سے لیا اور فرمایا کہ: " انی اوشک ان ادعیٰ... انی تارک فیکم الثقلین، کتاب اللّٰہ وعترتی... (۳)

۱۔ جملہ معترضہ اس جملے کو کہا جاتا ہے جو اپنے سیاق وسباق سے کوئی خاص ربط نہیں رکھتا لیکن کسی خاص مقصد اور بات کو سمجھانے کے لئے گفتگو کے دوران بولا جاتا ہے۔

۲۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان جملات کے ذریعے صحابہ کو اہل بیتؑ پر ہونے والے مظالم کے بارے میں ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلانا مقصود ہو اور آپؑ نے یہ بتانا چاہتی تھیں کہ: اے اصحاب رسولؐ! جب تمہارا یہ مقام ہے دینی حقائق تمہارے سامنے ہیں اور پوری انسانیت کو اسلام کی جانب بلانا چاہتے ہو تو بتاؤ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تمہارے سامنے وصی رسول اور پیغمبر کے برحق جانشین سے خلافت چھینی جارہی ہے اس کے اہل بیتؑ پر طرح طرح کے مظالم کے پہاڑ ڈھائے جارہے ہیں، اسلام کو پیغمبرؐ کے مدینے میں ہی مسخ کیا جارہا ہے، ہدایت کے ضامن اور قرآن کے نعم البدل ونظیر، اہل بیتؑ معاشرے سے مکمل طور پر ختم کیے جارہے ہیں، قرآن صامت سے ترجمان قرآن اور قرآن ناطق کو جدا کرکے گمراہی اور ضلالت کے دروازے کھولے جارہے ہیں، شریعت محمدیؐ اور حضورؐ کا عملاً مذاق اڑایا جارہا ہے آخر تم ان سب کو دیکھنے کے باوجود حق کی حمایت کیوں نہیں کرتے اور ظالم کی مدد اور اس کی حمایت کیوں کررہے ہو؟!

۳۔ یہ حدیث ثقلین کے نام سے معروف ہے اور شیعہ وسنی دونوں نے تواتر کے ساتھ نقل کی ہے۔

(عنقریب مجھے بلایا جائے گا. میں دو قیمتی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، خدا کی کتاب اور میری اہل بیتؑ ...) اور بعد میں آنے والا جملہ " وبقیة استخلفها علیکم " قرآن کریم کی طرف اشارہ ہے اور " للّٰہ فیکم " سے مراد اہل بیت کرامؑ ہیں. خلاصہ یہ کہ: ان دو فقروں سے الگ چیزیں مراد ہوں، پہلے فقرے سے اہل بیت اور دوسرے فقرے سے قرآن کریم۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ان دونوں فقروں سے قرآن کریم ہی مقصود ہو اس صورت میں، خدا کی کتاب قرآن خود ہمیں اہل بیت (ع) کی طرف راہنمائی کرے گی کیونکہ خدا نے قرآن میں صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ: " قل لا اسئلکم علیه اجراً الا المودة فی القربیٰ(۱) " (اے ہمارے حبیب، ان سے کہدو کہ: تبلیغ رسالت کے حوالے سے سوائے اہل بیت کی محبت کے اور کوئی اجر تم سے نہیں مانگتا (۲)) ۔

" وبقیـة استخلفها علیکم "

(اور تمہارے درمیان خدا کی ایک یادگار ہے جسے اس نے تم پر خلیفہ مقرر کیا ہے)

جس طرح تم پیغمبر (ص) کی اطاعت کرتے تھے اسی طرح تم اس ۔یادگار۔ کی بھی اطاعت کرو ابھی جب پیغمبر (ص) اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں تو اس چیز کی اطاعت کریں جسے پیغمبر (ص) چھوڑ کر گئے ہیں. اب یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ چیز کیا ہے ؟

ہدایت کرنے والی قرآنی خصوصیات:

(۱) " کتاب اللّٰـــه الناطـق "

۱۔ سورۂ شوریٰ / ۲۳ .

۲۔ دوسرا احتمال زیادہ مناسب نظر آتا ہے کیونکہ اہل بیتؑ کی محبت، سندیت اور اس کے عہد و پیمان الٰہی ہونے سے صحابہ نے انکار کیا اور اسی انکار کے نتیجہ میں تاریخ اسلام کی سب سے پہلی بغاوت رونما ہوئی، اور حسبنا کتاب اللّٰہ کا نعرہ بلند کیا گیا، لہذا حضرت زہراءؑ قرآن سے استدلال کرنا چاہتی ہیں وہی قرآن جسے طرفین مانتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے اپنی زندگی میں اس کو عہد خداوندی کے طور پر پیش کیا اور اپنے بعد اسی کو حاکم بنایا.

(خدا کی کتاب جو۔ اس کے حکم کو۔ بیان کرتی ہے)

پیغمبر (ص) کی ایسی یادگار جسے خدا نے تمہارے اوپر اپنا جانشین بنایا ہے اور رسول خدا (ص) کے بعد اس کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ خدا کی کتاب۔ قرآن۔ ہے اور یہی کتاب خدا کے احکام کو بیان کرنے والی ہے، ہم نے پہلے بھی کہا کہ خدا کی یہی کتاب صراحت کے ساتھ لوگوں کو پیغمبر (ص) کی عترت (ع) کی طرف۔ رجوع کرنے کی۔ دعوت دیتی ہے۔

(۲) "والقرآن الصادق، والنور الساطع"

(یہ کتاب وہی قرآن ہے جو برحق، درخشاں نور اور عالمگیر حقیقت ہے)

"الصادق" وہ چیز جس میں کسی قسم کی غیر حقیقی باتوں اور باطل کا شائبہ تک نہیں ہے "سطوع" کے معنی بلندی اور پھیلنے کے ہیں "النور الساطع" یعنی بلندی اور نور کا پھیلنا۔ اس فقرے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن میں باطل کے لئے راہ نہیں اور باطل کی گنجائش نہیں، اس کے ساتھ قرآن کا نور ہدایت (تمام روشنیوں سے) بلند تر و فروزاں تر ہے جو پوری دنیا کو اپنے نور سے منور کر رہا ہے۔

(۳) "والضیاء اللامع"

(اور درخشند روشنی۔ کتاب۔ ہے)

"ضیاء" یعنی روشنی، "لامع" روشنی کر دینے والا۔ اس جملے سے مراد یہ ہے کہ قرآن وہ کتاب ہے جو خود نور اور روشنی ہے۔ (جہل و گمراہ کے اندھیرے میں گھرے ہوئے دلوں) نور ہدایت سے روشن کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآن بذات خود روشنی ہونے کے علاوہ دوسری چیزوں کو بھی روشنی دیتا ہے اور دوسروں کو ظلمتوں سے روشنیوں کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

(۴) "بینة بصائرہ"

(اس کے۔ بصیرت افروز۔ دلائل واضح اور روشن ہیں)

قرآن کے دلائل اور براہین واضح اور روشن ہیں اور ہر کوئی اگرچہ عالم اور دانشور نہ بھی ہو اپنی صلاحیت کے مطابق خدا کو قرآن کی دلیلوں سے سمجھ سکتا ہے۔

(۵) " منکشفة سرائرہ "

(اس کے اسرار و رموز قابل فہم ہیں)

قرآن کے اندر موجود اسرار اور رموز انسان کے لئے قابل فہم ہیں البتہ اسرار قرآنی کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان اور قرآن کے اپنے مخصوص انداز بیان سے آگاہ اور آشنا ہو۔

(۶) " منجلیة ظواھرہ "

(قرآن کے ظواہر بھی واضح اور آشکار ہیں)

خطبے کے اس حصہ میں آپ (ع) یہ بیان فرماتی ہیں کہ یہ سب چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ قرآن انسان کی زندگی کا دستور العمل اور تکامل ہونا چاہیئے اور ایسا نہ ہو کہ صرف مردوں کی مغفرت اور دلہن کے سر پر رکھنے کے لئے اس سے استفادہ کیا جائے (لیکن اپنی عملی زندگی سے اسے دور رکھا جائے) یا بعض اخباری مسلک حضرات کی طرح قرآن کے ظاہری معانی (وہ معانی جو اہل محاورہ، قرآن کی آیتوں سے سمجھتے ہیں) کو حجت نہ مانیں، ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ہماری زندگی کی تمام سرگرمیاں قرآن کی راہنمائی میں طے ہونی چاہیں اور ہمارے ہر فعل اور حرکت میں قرآن حجت ہونا چاہیئے۔ البتہ روایات کی طرف رجوع کرنا ضروری اور لازم ہے تاکہ قرآن کو بہتر اور دقیق تر سمجھا جاسکے۔

(۷) " مغتبطه به اشیاعه "

(قرآن کے پیروکار، قرآن ہی کی وجہ سے قابل رشک ہیں)

" مغتبط " قابل رشک، وہ شخص جسے دیکھ کر رشک کیا جائے " بہ " قرآن کے سبب سے " اشیاعہ " قرآن کے پیروکار، قرآن کی صحیح معنوں میں پیروی کرنے والے یہ لفظ شیعہ کی جمع ہے۔ ہمیں بھی شیعہ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ہم اہل بیت پیغمبر (ص) کے پیروکار ہیں اور ان کو رسول خدا (ص) کے برحق جانشین مانتے ہیں نیز ان کی اطاعت اور پیروی کو واجب سمجھتے ہیں۔

یہاں پر حضرت زہراء (ع) یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ: اگر کوئی صحیح معنوں میں قرآن کی پیروی کرے اور اس کی انسان ساز تعلیمات پر عمل کرے تو کمال و بزرگی کے ایسے مقام پر فائز ہوجائے گا کہ دوسرے

اسے دیکھ کر رشک کریں گے۔

(۸) " قائد الی الرضوان اتباعه "

(قرآن اپنے پیرو کاروں کو مقام رضوان۔ یا جنت۔ کی طرف رہبری کرتا ہے)

" رضوان " کی اصل " رضا " ہے یعنی خوشنودی۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ قرآن کے واقعی پیرو کاروں پر، دنیا و آخرت دونوں میں خدا راضی اور خوشنود ہو گا (۱) (یہ وہ عظیم مقام ہے جہاں پر خدا کی طرف سے نفس مطمئنہ کو " ارجعی " اور " ادخلی " کے حیات آفریں خطاب سے نوازا جاتا ہے)۔

(۹) " مؤد الی النجاۃ استماعه "

(قرآن اپنے۔ تدبر سے۔ سننے والوں کو نجات کی شاہراہ پر گامزن کرتا ہے)

" استماع " باب افتعال کا مصدر اور دقیق و غور سے سننے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے حالانکہ " سماع " یا " اسماع " صرف سننے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بنابریں جو بعض نسخوں میں " استماع " کے بجائے " اسماع " ذکر ہوا ہے، وہ صحیح نہیں بلکہ " استماع " ہی صحیح ہے کیونکہ وہ چیز جو انسان کو بدبختی اور ہلاکت سے نجات دلاتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کو غور سے سنیں اور اس کے معانی کو صحیح و درست سمجھ کر اس کے مطابق عمل بھی کریں (۲)۔

(۱۰) " وبه تنال حجج الله المنورة "

(خدا کے نورانی دلائل، قرآن ہی کے واسطے سے حاصل ہوتے ہیں)

تمام امور میں خدا کی راہنمائی اور واضح دلیلیں، قرآن ہی کے ذریعے انسان کو حاصل ہوتی ہیں، یہاں تک کہ سنت رسول (ص) اور عترت پیغمبر (ع) جیسی شریعت کے روشن دلائل اور حجیت بھی قرآن کی رہنمائی سے حاصل ہوتے ہیں کیونکہ قرآن فرماتا ہے کہ: " ما آتاکم الرسول فخذوه وما نهاکم

۱۔ شاید مراد، بہشت رضوان ہو جو اہل معرفت کے نزدیک ایک معنوی بہشت ہے اور مادی لذتوں سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

۲۔ اسی مطلب کی جانب سورہ اعراف کی آیت نمبر ۲۰۴ بھی اشارہ کرتی ہے کہ: " واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون " جب بھی قرآن کی تلاوت کی جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو شاید کہ تم پر رحم کیا جائے۔ یہاں پر بھی سماع کے بجائے استماع کا لفظ استعمال ہوا ہے اور مراد یہ ہے کہ تلاوت قرآن کے وقت، دقت اور مکمل توجہ سے قرآن سنیں۔

عنه فانتهوا[۱]" (جو چیز تمہیں رسول (ص) دیدے اسے لے لو اور جس سے روکے رک جاؤ) سنت پیغمبر کی حجیت کے لئے قرآن کی یہی آیت کافی ہے۔

(۱۱)" وعزائمه المفسرة، ومحارمه المحذرة"

(خدا کی جانب سے بیان کئے ہوئے واجبات اور منع کیے ہوئے محرمات کو قرآن بیان کرتا ہے)

قرآن کے ذریعے واجبات بیان ہوئے ہیں، آیات قرآنی نازل ہوئیں ہیں اور واجبات کو معین کردیا ہے، اور " اقیموا الصلاۃ[۲]" (نماز قائم کرو) " آتوا الزکاۃ[۳]" (زکات دو) " کتب علیکم الصیام[۵]" (تم پر روزہ واجب کیا گیا ہے) " واتموا الحج والعمرۃ للّٰہ[۶]" (خدا کی راہ میں حج اور عمرہ کو مکمل طریقے سے ادا کرو) " وقاتلوا فی سبیل اللّٰہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا[۷]" (خدا کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور تجاوز نہ کرو) " قل اطیعوا اللّٰہ والرسول[۸]" (کہدو کہ تم خدا اور رسول خدا کی اطاعت کرو). مذکورہ آیتیں اور اس کے علاوہ دوسری بہت سی آیات، نماز، روزہ، زکات، حج اور جہاد کے وجوب اور دوسرے قوانین خداوندی کو بیان کرتی ہیں، انہی بیان شدہ واجبات کو "عزائم مفسرہ" کہا جاتا ہے۔ (واجبات کو بیان کرنے والی آیات کے مقابلے میں کچھ آیات ایسی بھی ہیں کہ جو محرمات کو بیان کرتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے)۔

" لاتقربوا الزنیٰ[۹]" (زنا کے نزدیک مت جاؤ) " انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان[۱۰]" (بتحقیق شراب اور جوا شیطان کے ناپاک عمل میں سے ہیں) " ولا یغتب بعضکم بعضاً[۱۱]" (ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو) " یمحق اللّٰہ الربیٰ[۱۲]" (خدا سود کا خاتمہ کرتا ہے) ان کے علاوہ بھی بہت ساری آیات ایسی ہیں جو شریعت میں منع کی ہوئی چیزوں (محرمات) کو بیان کرتی ہیں اور "محارم محذرہ" سے یہی محرمات مراد ہیں۔

پس حضرت زہراء (ع) کا مقصد یہ ہوا کہ یہ قرآن ہے جو تمہیں خدا کے واجبات اور محرمات سے

۱۔ سورۂ حشر / ۷۔ ۲۔۳۔۴۔ سورۂ بقرہ / ۴۳۔

۵۔ بقرہ / ۱۸۳۔ ۶۔ بقرہ / ۱۹۶۔ ۷۔ بقرہ / ۱۹۰۔ ۸۔ آل عمران / ۳۲۔ ۹۔ اسراء (بنی اسرائیل) / ۳۲

۱۰۔ مائدہ / ۹۰۔ ۱۱۔ حجرات / ۱۲۔ ۱۲۔ بقرہ / ۲۸۶۔

آگاہ کرتا ہے. البتہ جہاں تفسیر اور وضاحت کی ضرورت ہو تو وہاں رسول خدا (ص) اور ان کے اہل بیت (ع) ان وضاحت طلب آیات کی تشریح فرماتے ہیں. مثال کے طور پر قرآن کا حکم ہے کہ " واقیموا الصلاۃ " نماز قائم کرو. اب نماز پڑھنے کی کیفیت کیا ہے ؟ یہ پیغمبر اکرم (ص) اور ائمہ ہدیٰ (ع) کی طرف سے بیان ہونی چاہیئے۔

(۱۲) " وبيناته الجالية وبراهينه الكافية "

(خدا کے روشن اور آشکار دلائل نیز۔ ضمیر کو مطمئن کرنے والے۔ برہان قرآن ہی کے ذریعے تم تک پہنچے ہیں)

" بینات " بینہ کی جمع اور " براہین " برہان کی جمع ہے. خدا کے آشکار اور کافی (یقین کی منزل تک پہنچانے والے) بینات سے مراد قرآن کی وہ واضح روش ہے جسے علوم ومعارف اور اصول وفروع دین کے بیان کے لئے خدا نے اپنایا. اس سلسلے میں قرآن بھی فرماتا ہے کہ: " ان هـذا القرآن يهدى للتى هى اقوم (۱) " (بتحقیق یہ قرآن، محکم، قوی۔ اور انحراف وکجی سے منزہ۔ علوم ومعارف کی طرف راہنمائی کرتا ہے)۔

(۱۳) " وفضائله المندوبة ورخصه الموهوبة وشرايعه المكتوبة "

(مستحبات کی فضیلتیں۔ مباح چیزوں۔ میں خدا کی طرف سے دی ہوئی آزادی عمل اور۔ قرآن میں۔ لکھی ہوئی شریعت۔ سے قرآن ہی کی بدولت آگاہی حاصل ہوتی ہے۔)

قرآن کریم میں واجبات اور محرمات کے علاوہ مستحبات اور مباحات بھی ہیں. بطور مثال مستحب پر یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ: " لن تنالوا البر حتى تنفقوا ممـا تحبون (۲) " (اس وقت تک کمال اور بھلائی حاصل نہیں کرسکو گے جب تک کہ تم اپنی عزیزترین چیزوں کو انفاق نہ کرو گے) اسی طرح یہ آیت مباحات پر دلالت رکھتی ہے کہ: " قل من حرم زينة الله التى اخرج لعباده والطيبات من الرزق (۳) " (اے ہمارے رسول ان سے فرمائیے کہ: پاکیزہ نعمتوں اور دنیوی زینت۔ کے اسباب۔ کو جسے خدا نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کیا ہے، کس نے حرام قرار دیا ہے ؟) البتہ علامہ مجلسی نے بحار الانوار

۱۔ اسراء / ۹.　　۲۔ آل عمران / ۹۲.　　۳۔ اعراف / ۳۲.

میں فرمایا ہے کہ " رخصه الموهوبة " میں مباح چیزوں کے علاوہ مکروہات بھی شامل ہیں[1] (مکروہ ہر وہ کام ہے جس میں بندے کو آزادی عمل موجود ہو اور اس فعل کے ارتکاب پر پابندی نہ ہو) ۔

(۱۴) " وشرايعه المكتوبة "

(اور شریعت کے (دوسرے) مکتوب قوانین بھی قرآن بیان کرتا ہے)

واجبات، محرمات اور مستحبات کے علاوہ دوسرے تمام شرعی قوانین، جیسے حدود ودیات وغیرہ جو کہ قرآن میں مذکور ہیں، بطور مثال ملاحظہ فرمائیے کہ: " الزانية والزاني فاجلدوا كل واحد منهما مائة جلدة [2] " (زنا کرنے والے مرد اور عورت میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو) یہ غیر شادی شدہ افراد کے حد زنا کو بیان فرمایا ہے ۔

خلاصہ یہ کہ: قرآن کریم جو کہ پیغمبر اکرم (ص) کی یادگار ہے، خدا کے تمام احکام اور قوانین کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ البتہ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا ہے کہ اس کا مقصد یہ نہیں کہ مسلمین ائمہ ہدیٰ علیہم السلام سے بے نیاز ہوجائیں اور " حسبنا کتاب اللہ " کا نعرہ لگائیں کیونکہ اسی قرآن نے صراحت کے ساتھ یہ حکم دیا ہے کہ مسلمان اہل بیت اور عترت رسول (ص) کی طرف رجوع کریں (اور ان سے اسرار ورموز قرآن وشریعت کو حاصل کریں) ۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۔ بحار الانوار (طبع قدیم) ج ۸ ص ۱۱۶ ۔

۲۔ سورۂ نور / ۲ ۔

چوتھا درس:

⊖ فلسفہ احکام الٰہی:

- ☼ تقویٰ کی وصیت
- ☼ خدا کی معرفت اور علم کا رابطہ
- ☼ اپنی اور اپنے پدر بزرگوار کی شخصیت کا تعارف
- ☼ پیامبر اسلام (ص) اور علی (ع) کی اخوت اور یکجہتی
- ☼ آغاز رسالت کی کیفیت
- ☼ دعوت کے تین مرحلے
- ☼ پیغمبر (ص) کی بت شکنی
- ☼ توحید کا پرچار اور کفر کا خاتمہ
- ☼ نفاق اور کفر کی شکست

فَجَعَلَ اللهُ الإيمانَ تَطهيراً لَكُمْ مِنَ الشِّرْكِ، و الصَّلوة تنزيهاً لَكُمْ عَنِ الْكِبْرِ، و الزَّكوٰة تَزْكِيَةً لِلنَّفْسِ وَ نِماءاً فِى الرِّزْقِ، و الصِّيامَ تَثْبِيتاً لِلإِخْلاص، و الحَجَّ تَشْييداً لِلدّينِ، وَ العَدْلَ تَنْسِيقاً لِلقُلوبِ، وَ طاعَتَنا نِظاماً لِلْمِلَّةِ، وَ إمامَتَنا أماناً من الفرقة، وَ الجِهادَ عِزّاً لِلإسْلامِ [وَ ذُلّاً لِأَهْلِ الْكُفْرِ و النِّفاق]، و الصَّبْرَ مَعُونَةً عَلى اسْتيجابِ الأَجرِ، وَ الأَمْرَ بِالمَعْرُوفِ مَصْلَحَةً للعامَّةِ، وَ بِرَّ الوالِدَيْنِ وِقايَةً مِنَ السَخَطِ، وَ صِلَةَ الأرْحامِ مَنْسَأَةً فِى العُمْرِ و مَنْماةً لِلْعَدَدِ، وَ القِصاصَ حَقْناً لِلدِّماءِ، وَ الْوَفاءَ بِالنَّذْرِ تَعريضاً لِلمَغْفِرَةِ، وَ توفيةَ المكائيل و المَوازين تغييراً لِلْبَخْسِ، و النَّهىَ عَنْ شُرْبِ الْخَمْرِ تَنْزيهاً عَنِ الرِّجْسِ، وَ اجْتِنابَ القَذْفِ حِجاباً عَنِ اللَّعْنَةِ، و تَركَ السَّرْقَةِ إيجاباً لِلْعِفَّةِ؛ وَ حَرَّمَ اللهُ الشِّرْكَ إخْلاصاً لَهُ بِالرُّبُوبِيَّةِ؛ فَاتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقاتِهِ وَ لاتَمُوتُنَّ إلّا وَ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ، وَ أَطيعُوا اللهَ فيما أَمَرَكُمْ بِهِ وَ مانَهاكُمْ عَنْه، فَإنَّهُ إنَّما يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبادِهِ العُلَماء.

ثُمَّ قالَتْ: أَيُّها النّاسُ إعْلَمُوا: اَنى فاطِمَة، وَ أَبى مُحَمَّدٌ ﷺ، أَقولُ عوْداً وَ بَدْواً وَ لاأَقُولُ ما أَقولُ غَلَطاً، وَ لاأَفْعَلُ ماأَفْعَلُ شططاً؛ لَقَدْ جاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ، عَزيزٌ عَلَيْهِ ماعَنِتُّم، حَريصٌ عَلَيْكُمْ بِالمُؤْمِنينَ رَئُوفٌ رَحيمٌ؛ فَإِنْ تعزوهُ و تَعْرِفُوهُ تَجِدُوهُ أَبى دُونَ نِساءِكم، وَ أَخا ابنِ عَمّى دُونَ رِجالِكُمْ، وَ لَنِعْمَ المعزىٰ إليه؛ فَبَلَّغَ الرِّسالَةَ صادعاً بِالنّذارة، مائلاً عَنْ مدرجةِ المُشْرِكينَ، ضارِباً ثَبَجَهُم، آخِذاً بِأَكْظامِهِم، داعِياً إلىٰ سَبيلِ رَبِّهِ بِالحِكْمَةِ وَ المَوْعِظَةِ الحَسَنَةِ، يكسر الأَصْنام و يَنكت [ينكث] الْهام، حَتّى انْهَزَمَ الجمع و ولّوُاالدّبر، حَتّى تفرّىٰ اللَّيْل عَنْ صُبْحِهِ وَ أَسْفَرَ الحَقّ عَنْ مَحْضِه و نَطَقَ زَعيمُ الدّين وَ خرسَتْ شَقاشِقُ الشَّياطين وَ طاحَ وَشيظُ النِّفاقِ وَ انْحلّتْ عُقَدُ الكُفْرِ وَ الشِّقاقِ، وَ فُهْتم بِكَلِمَةِ الإخْلاصِ فى نَفرٍ مِنَ البيض الخِماصِ، الّذينَ أذْهَبَ اللهُ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَ طَهَّرَهُمْ تَطْهيراً.

❁❁❁

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

وبہ نستعین

خطبے کے گزشتہ حصے میں (حضرت زہراء (ع)) نے قرآن کی اہم اہم خصوصیات بیان فرمائیں جو قرآن کے اعلیٰ وارفع اور نورانی معانی، غنی اصول ومعارف اور دلائل اور دین کے اصول وفروع نیز قرآن کے روشن اور واضح ظاہری معانی سے مربوط تھیں. اس حصے میں آپ (ع) فروع دین اور دین کے اصول ومعارف کے معاشرتی اور معنوی ثمرات اور فوائد کو بیان فرماتی ہیں۔

فلسفہ احکام الٰہی:

۱۔ ایمان اور نماز:

" فجعل اللّٰہ الایمان تطہیراً لکم من الشرک "

(خدا نے ایمان کو لازم اور واجب قرار دیا کہ تمہیں شرک سے پاک کرے)

خداوند عالم نے قرآن میں ایمان کو فرض کیا اور ہمیں ایمان لانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ: صاحب ایمان بنو یعنی کسی چیز کو خدا کا شریک نہ ٹھہراؤ. یہ اس لئے تھا کہ تمہیں شرک کی آلودگی سے پاک کرے. قرآن میں طاغوت (خدا کے علاوہ ہر وہ چیز جس کی عبادت کی جائے) کی اطاعت اور پرستش کرنے والوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ: " والذین کفروا اولیائہم الطاغوت یخرجونہم من

النور الی الظلمات...(۱)" (وہ لوگ جو کافر ہوئے اس طرح انہوں نے طاغوت کو اپنا سرپرست بنایا۔ تو اس کے نتیجے میں۔ طاغوت ان کو۔ خدا شناسی اور خدا پرستی کی فطرت کے۔ نور سے نکال کر۔ ضلالت دگمراہی کی۔ تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ گمراہی وضلالت اور عذاب۔ میں رہیں گے)۔

" والصلوۃ تنزیہا لکم عن الکبر "

(تکبر سے پاک رکھنے کے لئے خدا نے تم پر نماز فرض کی)

خود خواہی سے مقابلہ کا ذریعہ نماز ہے، خصوصا اس دور میں جب بعض انسان کچھ زیادہ ہی متکبر تھے، عرب کے بعض آدمیوں کے لئے رکوع اور سجدے بہت گراں گزرتے تھے ان کا غرور اور تکبر اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ اگر کوئی دروازہ چھوٹا ہو اور وہاں سے ان کو جھک کر جانا پڑتا ہو تو وہ جھکنے کے بجائے دروازے کو خراب کر دیتے تھے! اس طرح وہ جھکے بغیر وہاں سے گزرتے تھے۔ یہ اس لئے کرتے تھے کہ ان کو ذرا سا بھی سر خم کرنا نہ پڑے۔ ایسے معاشرے میں جہاں تکبر اور انانیت حد سے بڑھ چکی تھی، نماز فرض کی گئی تاکہ وہ رکوع کریں، سجدے میں گر پڑیں اور اس طرح ان کے تکبر اور غرور کے بت پاش پاش ہوجائیں۔ قرآن میں ارشاد خداوندی ہے کہ: " اقم الصلاۃ لذکری (۲)" (نماز قائم کرو تاکہ تم میری یاد میں رہو۔ میری ربوبیت اور عظمت سے غافل نہ رہو۔) نماز کا نتیجہ اور ثمر یہ ہے کہ جب انسان خدا کی یاد میں رہے اور اس کی عظمت و کبریائی کی طرف متوجہ رہے تو خود بخود تکبر اور غرور سے پاک ومنزہ ہوجاتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ بزرگی وعظمت صرف خدا کے ساتھ مخصوص ہے اس طرح وہ خدا کے سامنے۔ اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے۔ زمین پر گر پڑتا ہے اور عظمت خداوندی کے مقابلے میں اپنے آپ کو ہیچ سمجھتا ہے۔

۱۔ سورۂ بقرہ / ۲۵۷۔ ۲۔ سورۂ طہ / ۱۴۔

۲۔ زکات،

"والزکوۃ تزکیۃ للنفس ونمآء فی الرزق"

(خدا نے زکوۃ کو واجب فرمایا تاکہ انسان کے نفس کو آلودگیوں سے پاک کرے

اور اس کی روزی میں وسعت عطا کرے۔ یعنی تزکیہ نفس اور وسعت رزق کی خاطر زکوۃ کو واجب فرمایا۔)

لغت میں "زکوۃ" کے دو معنی ذکر ہوئے ہیں: ایک تطہیر، پاک کرنا اور دوسرے، نشو ونما۔ قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے کہ: "خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا[۱]" (اے میرے رسول (ص) لوگوں کے مال سے زکوۃ وصول کر تاکہ اس ذریعے سے انہیں پاک اور منزہ کرے) بنابریں یہ کہا جاسکتا ہے کہ زکوۃ کی ادائیگی، انسانوں کی پاکیزگی اور تزکیہ نفس کا موجب بنتی ہے، کیونکہ عموماً دنیا کی مال ودولت، انسان کے دل وجان پر مسلط ہے اور وہ اسی مال ودولت سے محبت رکھتا ہے اور اسی مال کو جسے اس نے زحمتوں اور کافی محبت سے کمایا تھا جب خدا کی خاطر، اس سے ہاتھ اٹھاتا ہے اور اپنے شرعی واجبات کو منجملہ زکوۃ کو ادا کرتا ہے تو یہ واقع میں ایک تزکیہ نفس ہے۔ یعنی اپنے مال کو خدا کی راہ میں دے کر۔ اس نے دنیا اور مادیات کی وابستگی اور آلودگی سے اپنے آپ کو پاک اور منزہ کرلیا ہے۔

اگر زکوۃ کا معنی، نشو ونما ہو تو زکوۃ دینے کی وجہ سے انسان کے مال سے کچھ کم نہیں ہوتا، بلکہ اس میں برکت اور اضافہ ہی ہوتا ہے کیونکہ خداوند عالم زکوۃ کے بدلے میں نہ صرف دنیا میں اس کی روزی میں اضافہ فرماتا ہے بلکہ آخرت میں بھی اس کو کئی گنا زیادہ عنایت فرماتا ہے۔ واقع میں زکوۃ انسان کی جائیداد کا بیمہ ہے۔ جس میں انسان خدا کے ساتھ بیمہ کا معاہدہ کرتا ہے۔ روایات میں بھی آیا ہے کہ: "حصّنوا اموالکم بالزکوۃ" (زکوۃ کی ادائیگی کے ذریعے اپنے جائیداد کی حفاظت کیا کرو)۔

حضرت زہراء (ع) نے یہاں پر زکوۃ کے دونوں معانی کو ذکر فرمایا ہے کہ: "والزکوۃ ترکیۃ للنفس ونمآء فی الرزق" (خدا نے زکوۃ کو واجب قرار دیا تاکہ اس کے ذریعے تمہاری جانوں کو مال دنیا کی

۱۔ سورۂ توبہ / ۱۰۳۔

وابستگی اور آلودگی سے پاک ودپاکیزہ کرے اور ساتھ ہی تمہارے رزق میں برکت اور وسعت عطا کرے(۱)

۳۔ روزہ:

" والصیام تثبیتاً للاخلاص "

(اور روزے کو واجب فرمایا تاکہ بندوں کے اخلاص کو مستحکم کیا جائے)

نماز اور حج جیسے بعض اعمال، وجودی ہیں یعنی ایسے عمل ہیں جنہیں انجام دینا پڑتا ہے اور کسی چیز کو وجود عطا کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، حالانکہ روزہ ایک امر "عدمی" ہے۔ یعنی ایسا عمل جس کے لئے کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ اسی لئے بہت ہی کم لوگوں کو پتہ ہوتا ہے کہ فلاں شخص کو روزہ ہے، اسی لئے روزے میں ریاکاری کی گنجائش بہت ہی کم ہے. اسی طرح ریاکاری کے لئے روزہ رکھنے والے بھی بہت ہی کم ہوتے ہیں. لہٰذا اگر کوئی صحیح معنوں میں روزہ رکھے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نیت خالص ہے اور وہ بہت ہی اخلاص رکھتا ہے. اسی لئے آپ (ع) فرماتی ہیں کہ: " والصیام تثبیتا للاخلاص " (خداوند عالم نے روزہ کو فرض فرمایا تاکہ اپنے بندوں کے اخلاص کو ثابت قدم رکھے۔ روزے سے اخلاص اس لئے ظاہر ہوتا ہے کہ۔ روزہ ایک عدمی امر ہے اور یہ دوسروں کی توجہ اپنی طرف جذب کرنے کا بہت ہی کم سبب بنتا ہے اور عموماً ایسے لوگ ہی روزہ رکھتے ہیں جن کا قصد اور نیت صرف خدا کی رضا ہوتی ہے. شاید اسی نکتہ کی وجہ سے ہو کہ بعض روایات میں مذکور ہے کہ خداوند متعال نے فرمایا کہ: " الصوم لی وانا اجزی به (۲) " (روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا (۳)) ۔

۱۔ بحار الانوار میں علامہ مجلسیؒ " نماء فی الرزق " کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ یہ جملہ سورۂ روم کی ۳۹ آیت شریفہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ: " وما آتیتم من زکوۃ تریدون وجہ اللہ فاولئک ہم المضعفون ". البتہ یہ اشارہ اس صورت میں صحیح ہوگا کہ اس آیت میں لفظ زکوۃ سے زکوۃ واجب مراد ہو نہ کہ ہر صدقہ۔

۲۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ "اجز" کے بجائے "اجزی بہ" فعل مجہول ہو، بنابریں معنی یہ ہوں گے کہ (میں خود روزہ کا اجر ہوں گا) یعنی واقعی روزہ کا اجر وصول الی اللہ اور خدا کے۔ جمال۔ کا شہود ہے. در حقیقت روزہ کا اجر وثواب، پروردگار کا مشاہدہ اور اس کی روحانی لقاء ہے۔

۳۔ علامہ مجلسیؒ بحار الانوار میں حضرت زہراءؑ کے اس جملے کے لئے ایک اور معنی ذکر فرماتے ہیں وہ یہ کہ " خدا نے روزے کو =

۴۔ حج :

" والحج تشییداً للدین "

(اور حج کو دین کی تقویت و استحکام کی خاطر فرض کیا)

حضرت زہراء (ع) نے جو فرمایا کہ حج دین کے استحکام کا سبب بنتا ہے اس کی ایک تو وجہ یہ ہے کہ حج میں انسان، حضرت ابراہیم (ع) کی پیروی کرتا ہے اور چونکہ حضرت ابراہیمؑ نے تمام دنیوی وابستگیوں اور محبتوں کو ترک کر دیا تھا یہاں تک کے خدا کی راہ میں اپنے عزیز فرزند کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے، اس طرح انہوں نے توحید اور خدا پرستی کے آخری درجے کا مظاہرہ کیا۔ اب چونکہ ہم حضرت ابراہیمؑ کی پیروی کرتے ہیں تو در اصل ہم توحید اور وحدانیت کی بنیادوں کو مستحکم اور دین کی تقویت کر رہے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ حج ایک اسلامی کانفرنس ہے جہاں مسلمانوں کو باہمی تفاہم کے ساتھ دین کی تقویت اور استحکام سے مربوط امور کا جائزہ لینا چاہیے۔ روایات، حج کے اس پہلے پر بھی دلالت کرتی ہیں۔ بنابریں حج میں جہاں انفرادی اور عبادی پہلو ہے تو وہاں سیاسی اور معاشرتی پہلو بھی موجود ہے۔ اسی لئے آپؑ ارشاد فرماتی ہیں کہ: " والحج تشییداً للدین " (حج دین کے استحکام کا سبب بنتا ہے) یہ اس لئے کہ ایک طرف سے یہ ایک اسلامی کانفرنس ہے جس میں دین کی تقویت کے لئے مسلمانوں کے درمیان یکجہتی پائی جاتی ہے اور دوسری طرف سے حجاج توحید پر اپنے ایمان کو مکمل کرتے ہیں کیونکہ احرام کی حالت میں انسان، لباس اور دنیا کے ظاہری مقام و منصب وغیرہ کے خول سے باہر قدم رکھتا ہے اور شیطان کو سنگسار کرنے کے بعد قربانی پیش کرتا ہے تو یہاں گویا وہ۔ مسلخ عشق پر۔ اپنے نفس کو قربان کر دیتا ہے۔ یہ سب اعمال اور حج کے لئے جو فلسفے ذکر کئے جاتے ہیں ایک دوسرے سے مل کر انسان کے دین کی تقویت کا سبب بنتے ہیں۔

== اخلاص کے استحکام اور بقاء کے لئے واجب قرار دیا ہے) چونکہ بعض دوسری روایات کے مطابق " تثبیتا " کے بجائے " تبیینا " (بیان کرنے کی خاطر) ذکر ہوا ہے۔ علامہ مجلسیؒ بھی اسی معنی کی تائید فرماتے ہیں جسے ہم نے متن میں ذکر کیا ہے اور اس کی تائید میں کئی روایات نقل کر کے اس کی وضاحت فرماتے ہیں۔

۵۔ عدالت،

"والعدل تنسیقاً للقلوب"

(دلوں کو باہم مرتبط اور ہم آہنگ بنانے کے لئے خدا نے عدل وانصاف کو واجب فرمایا)

ظلم دلوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتا ہے لیکن۔ کسی معاشرے میں۔ جب عدل وانصاف ہو تو دلوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے. ظلم اور بے انصافی کے نتیجے میں معاشرے کا نظام پاش پاش ہوجاتا ہے اور ظلم مختلف طبقوں، حکومتوں اور قوموں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں لے آتا ہے لیکن عدل وانصاف اس بات کا موجب بنتا ہے کہ افراد، قومیں اور حکومتیں ایک دوسرے پر اعتماد کریں نیز ۔ملکی اور بین الاقوامی سطح پر۔ تعلقات اور معاشرتی یکجہتی کو فروغ دیں۔

۶۔اھل بیت علیہم السلام کی امامت،

"وطاعتنا نظاماً للملة"

(اور ہماری اطاعت کو واجب قرار دیا تاکہ دین اسلام اپنے اصلی نظم اور حالت پر برقرار رہے)

اہل بیتؑ کی پیروی وفرمانبرداری اس لئے دین کی حفاظت اور اس کے نظم کا سبب بنتی ہے کہ تمام امور کا محور دین ہے اور اس محور کا بیان اور۔ اس کی پاسداری۔ ایسے امام اور پیشوا کے ذریعے سے ہی ممکن ہے کہ جو سب سے زیادہ دین شناس اور پرہیز گار ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے تمام کمالات کا حامل بھی ہو۔ اور یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ۔ اہل بیت علیہم السلام دین شناسی میں دوسروں سے آگاہ تر اور قرآنی حقائق سے زیادہ آشنا ہیں، کیونکہ ان کے علم کا سرچشمہ مبدء وحی سے پھوٹتا ہے لہذا دینی امور کا نظم وضبط اور ان کی ہم آہنگی کا راز ان کی اطاعت میں ہی مضمر ہے۔

"وامامتنا اماناً من الفرقة"

(خدا نے ہم اہل بیتؑ کی امامت کو واجب قرار دیا تاکہ۔ ملت اسلامیہ۔ کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے)

یہاں پر حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ واقع میں امامت ہمارا حق ہے اور یہ حق خدا نے ہمیں

عنایت فرمایا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ: لوگ اختلاف کا شکار نہ ہوں اور لوگ مختلف سمتوں میں بکھر نہ جائیں بلکہ سب ایک ہی مرکز میں جمع ہوجائیں، البتہ ایسا مرکز جسے عقل نے بھی تسلیم کیا ہو اور یہ اس وقت ممکن ہے کہ ایک شخص، علم، تقویٰ، تدبیر، عدالت اور خدا کے ساتھ رابطے کے علاوہ دوسرے پہلوؤں سے بھی عام لوگوں پر برتری رکھتا ہو۔ ایسی صورت میں تمام لوگوں کو چاہئے کہ اس کامل شخص کی پیروی کریں اور پھر اختلاف وپراکندگی وجود میں نہیں آئے گی۔ بلکہ یہ ایک منسجم اور طاقتور قوم بن کر ابھرے گی۔ اب اگر۔ اس عقل پسند اور شریعت کی طرف سے تعیین شدہ۔ حقیقت پر لوگوں کو جمع نہ ہونے دیا اور باہمی اختلاف کی بنیاد رکھی تو یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔

۷۔ جہاد اور صبر:

"والجهاد عزاً للاسلام۔ وذلاً لاهل الكفر والنفاق۔"

(اور جہاد کو واجب فرمایا تاکہ اسلام کی عزت وعظمت کا باعث بنے۔ اور کفار ومنافقین کو ذلیل رسوا کردے)

جہاد کی اسی خصوصیت کی بناپر قرآن میں اس کو کافی اہمیت دی گئی ہے۔ اسی بناپر جہاد کے بارے میں قرآن اور روایات نے جتنی توجہ دی ہے فروع دین کی کسی دوسری فرع پر شاید ہی اتنی توجہ دی ہو۔

رسول خدا (ص) اور ائمہ معصومین (ع) کے اقوال میں، جہاد کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام، نہج البلاغہ میں جہاد کو بہشت کا ایک مخصوص دروازہ قرار دیتے ہیں [۱] نیز امام جعفر صادق علیہ السلام نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ: "بہشت میں باب المجاہدین نامی ایک مخصوص دروازہ ہے جہاں سے خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے، ایک خاص وقار کے ساتھ بہشت میں داخل ہوں گے"۔ آپؑ ترک جہاد کو دین کی نابودی، زندگی میں ذلت ورسوائی اور معاشی بدحالی کا سبب سمجھتے ہیں [۲]۔

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ / ۲۷

۲۔ وسائل الشیعہ ج ۱۱ باب الجہاد حدیث ۲۔ جناب استاد حضرت آیت اللہ منتظری کی ولایت فقیہ نامی کتاب کی ج ۱ میں اس موضوع پر تفصیلی بحث ہوئی ہے۔

"والصبر معونة علی استیجاب الاجر"

(اور صبر کو اجر وثواب کے استحقاق کا ذریعہ قرار دیا)

ہماری بعض روایات کے مطابق صبر کی تین قسمیں ہیں[1]:

ا۔ مصیبت پر صبر: جب انسان پر کوئی مصیبت آئے یا اس کا بیٹا یا بیٹی یا کوئی اور عزیز اس دنیا سے چلا جائے تو وہ جذبات میں نہ آئے۔ زمین وآسمان کو فحش نہ دے، خدا اور پیغمبر (ص) کا انکار نہ کرے، بلکہ صبر سے کام لے۔ کیا صبر کے علاوہ کوئی دوسرا چارۂ کار بھی ہے؟ اگر انسان صبر نہ کرے اور عجلت کرے، اپنے آپ کو پیٹے، چیخے اور چلائے، تو کیا اسے کچھ حاصل ہوگا؟ لہذا کیا یہ بہتر نہیں کہ انسان مصیبت کے اوقات میں صبر کرے اور اپنے امور کو خدا کے حوالے کردے، تو خداوند متعال بھی اس صبر کے عوض میں اس کو اجر عظیم عنایت فرمائے گا۔ خداوند بزرگ وبرتر قرآن میں ارشاد فرماتا ہے کہ: "ولنبلونکم بشئی من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات، وبشر الصابرین[2]" (خوف، بھوک، جان ومال اور اولاد میں کمی کے ذریعے، ہم تمہیں آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو بشارت دے) یعنی ہم تم پر خوف اور بھوک مسلط کریں گے، تمہارے مال اور تمہاری اولاد کو واپس لے لیں گے اس طرح تم سے امتحان لیا جائے گا تاکہ جو لوگ واقعی مؤمن ہوں گے دوسروں سے الگ ہوں ے اور صبر کرنے والوں کو بشارت دو۔ پھر۔ صبر کی علامت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ: "الذین اذا اصابتهم مصیبة قالوا انا للّٰه وانا الیه راجعون[3]" (صابر وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو عجلت، داد وفریاد اور خدا ورسول (ص) کی اہانت کرنے کے بجائے کہتے ہیں: "انا للّٰـه وانا الیه راجعون" ہم خدا کی مخلوق ہیں اور ہمیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے)۔ اور اپنے آپ سے کہتا ہے کہ۔ یہ مصیبت جو آئی اور وہ عزیز جو اس دنیا سے چلا گیا ہے۔ تو یہ کوئی اضطراب کی بات نہیں۔ عنقریب تم بھی چلے جاؤ گے اور ان کے ساتھ مل جاؤ گے

ا۔ اصول کافی ج ۲ کتاب الایمان الکفر، باب الصبر، حدیث ۱۵۔

۲۔ سورۂ بقرہ / ۱۵۵۔

۳۔ سورۂ بقرہ / ۱۵۶۔

کیونکہ اس دنیا سے ۔ہم سب نے جانا ہے۔

۲۔ اطاعت پر صبر: خدا کی اطاعت کرے اس کے واجبات اور دستورات پر عمل کرے اور اس سلسلے میں جو تکلیفیں اور مشقتیں اٹھانا پڑیں تو خوشی کے ساتھ ان کو برداشت کرے، کیونکہ بہشت ہمیں مفت میں نہیں دی جاتی بلکہ اس کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے، ایسا ہرگز نہیں کہ ہم دین کی خاطر کسی بھی زحمت، تکلیف اور سختی کو تحمل نہ کریں اور اسی طرح بہشت میں چلے جائیں، قرآن میں خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ: " ام حسبتم ان تدخلوا الجنة و لما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم " (کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ اسی طرح بہشت میں داخل ہو جاؤ گے جبکہ تم سے وہ امتحان نہیں لئے جائیں گے جو گزشتہ امتوں سے لئے گئے تھے) پھر خدا گزشتہ قوموں سے لئے گئے امتحانی پرچے کی وضاحت اسی آیت کے ذیل میں اس طرح فرماتا ہے کہ: " مستهم الباسآء والضرآء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین آمنوا معه متیٰ نصر اللّٰه[1] " (ان پر اس قدر سختی اور مشکلات آئیں اور ان کو اتنا جھنجھوڑا گیا کہ خدا کا رسول اور اس پر ایمان لانے والے، پکار اٹھے کہ، خدا نے نصرت اور مدد کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ کہاں گیا؟ اور کب پورا ہو گا؟)

خلاصہ کلام یہ کہ: آسائش و سکون اور خدا کی راہ میں سختیاں اور مشکلات جھیلے بغیر بہشت کی توقع نہیں رکھی جاسکتی بلکہ ضروری ہے کہ خدا کی راہ اور دین اسلام کی سربلندی کے لئے سختیوں اور بھوک و پیاس کو تحمل کریں اور یہ یقین پیدا کریں کہ اس راہ میں صبر کرنے والوں کا اجر و ثواب خدا ہی عنایت فرمائے گا۔

۳۔ معصیت (گناہ) پر صبر: صبر کی یہ قسم پہلی دو قسموں سے افضل ہے۔ گناہ و معیصت پر صبر کا مقصد یہ ہے کہ گناہ کے تمام ذرائع اور وسائل فراہم ہوں لیکن اس کے باوجود خدا کی رضا کو سامنے رکھ کر گناہ سے باز رہے۔ صبر کی یہ قسم دوسری قسموں سے اہم تر ہے اور اس کا ثواب بھی زیادہ ہے۔

بہرصورت اس جملے میں حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: خدا نے صبر کا حکم اس لئے دیا کہ تمہیں

۱۔ سورۂ بقرہ / ۲۱۴

خدا کی طرف سے اجر وثواب ملے ۔ لہذا صبر، ثواب اور آخرت میں اجر لینے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس طرح کہ آپؑ کا کلام، اس آیہ شریفہ کی طرف اشارہ ہے کہ: " انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب(۱) " (صبر کرنے والوں کو خداوند بے حساب اجر وثواب عنایت فرماتا ہے)۔

۸۔ امر بالمعروف:

" والامر بالمعروف مصلحۃ للعامۃ "

(اور امر بالمعروف کو معاشرے کی مصلحت کی خاطر واجب کیا)

دین اسلام نے تمام انسانوں کو یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ وہ احکام الٰہی کو نافذ کریں۔ ہر شخص پر جہاں اس کی اپنی انفرادی ذمہ داریوں کو انجام دینا لازم ہے وہاں یہ بھی واجب ہے کہ دوسروں کو بھی اپنے فرائض کی ادائیگی کی نصیحت کرے اور ان کو محرمات سے دور رکھے۔ لہذا امر بالمعروف تمام لوگوں کے مفاد میں ہے کیونکہ اگر اسے ترک کیا جائے تو خدا کے احکامات متروک ہوکر معاشرے میں محرمات عام ہوجائیں گے اور اس سے یقینا معاشرے کو نقصان پہنچے گا۔ قرآن میں ارشاد ربانی ہے کہ: " ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر(۲) " (تمہارے درمیان ایک ایسے گروہ کا ہونا لازم ہے جو بھلائی کی جانب دعوت دے، نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے) البتہ امر بالمعروف اور نہی از منکر کے کچھ مراتب اور شرائط ہیں کہ جو اس کے اپنے مقام پر لکھے جاچکے ہیں(۳)۔

۹۔ والدین کے ساتھ نیکی اور صلہ رحم:

" وبرّ الوالدین وقایۃ من السخط "

۱۔ سورۂ زمر / ۱۰۔ ۲۔ آل عمران / ۱۰۴۔

۳۔ امر بالمعروف ونہی از منکر سے مربوط مباحث، ولایت فقیہ کی دوسری جلد، بارہویں مبحث میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

(اور خدا نے ماں اور باپ کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم دیا ہے تا کہ آپ کو اپنے غضب سے محفوظ رکھے)

والدین کے ساتھ احسان اور نیکی اسلام کی اہم تعلیمات میں سے ایک ہے. قرآن میں کئی مقامات پر اس کی تاکید کی گئی ہے ان میں سے ایک سورۂ بقرہ کی یہ آیت کریمہ ہے کہ: " واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل ان لا تعبدون الا اللّٰہ وبالوالدین احساناً...(۱)" (جب ہم نے بنی اسرائیل سے یہ عہد و پیمان لیا کہ خدا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں اور اپنے والدین کے ساتھ نیکی کریں) یہاں خداوند عالم نے اپنی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے اور یہ اس مسئلہ کی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔

حضرت۔ فاطمہ زہراء (ع)۔ یہاں فرماتی ہیں کہ خدا نے ماں باپ کے ساتھ احسان اور اچھے سلوک کرنے کو واجب قرار دیا ہے تا کہ تمہیں اپنے قہر و غضب اور عذاب سے بچایا جائے کیونکہ اگر کوئی شخص اپنے والدین کو اذیت پہنچائے اور اس کو والدین عاق کردیں تو وہ حقیقت میں خدا کے غضب کا شکار ہوجاتا ہے۔

" وصلۃ الارحام منساۃ فی العمر ومنماۃ للعدد "

(خدا نے صلہ رحم کو واجب کیا تا کہ عمر طولانی عمر اور تعداد میں اضافے۔ نسل میں برکت۔ کا سبب بنے)

" منساۃ اور نسا " تاخیر کے معنی میں آتے ہیں یہاں پر اگر " منساۃ " میم کو زبر دے کر پڑھیں تو یہ اسم مکان ہے اور اس کے معنی ہوں گے، عمر میں تاخیر ہونے کی جگہ، لیکن اگر " مِنساۃ " پڑھا جائے تو یہ اسم آلہ ہے اور اس کا معنی ہو گا تاخیر کرنے کا ذریعہ یا آلہ. ہم " منساۃ " کو اسم مکان قرار دیں یا اسم آلہ، بہر صورت منساۃ فی العمر کا مقصد طول عمر ہی ہے۔

" مِنماۃ " بھی اسم آلہ ہے یعنی نشو و نما اور تعداد میں اضافہ کرنے کا وسیلہ " منماۃ للعدد " کا معنی و مقصد یہ ہے کہ اگر تم صلہ رحم کرو گے اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک رکھو گے تو مرگ مفاجات ۔ اور جان لیوا حادثات اور بیماریوں۔ سے محفوظ رہو گے اس طرح خود بخود تمہارے۔ خاندان کے افراد۔ کی تعداد میں اضافہ ہو گا۔

۱۔ سورۂ بقرہ / ۸۳۔

اصول کافی (ج ۲ ص ۱۵۰، ۳۴۶) میں مرحوم کلینیؒ نے صلہ رحم اور قطع رحم، ہر ایک کے ساتھ ایک ایک باب مخصوص کیا ہے اور وہاں پر صلہ رحم کی تاکید واہمیت، قطع رحم کی مذمت اور دنیا وآخرت میں ان کے نتائج کے بارے میں رسول خدا (ص) اور ائمہ معصومین (ع) سے انتہائی اہم روایات نقل کی ہیں۔ بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیے کہ حضرت امیر المؤمنین (ع) فرماتے ہیں: "جب بھی کوئی قوم صلہ رحم سے روگردانی کرے تو ان کی جائیداد شریر اور بدقماش افراد کے ہاتھوں چڑھ جاتی ہے"۔

۱۰۔ قصاص

" والقصاص حقنا للدماء "

(خدا نے قصاص مقرر فرمایا تاکہ لوگوں کی جانیں محفوظ رہیں)

قانون قصاص کا فلسفہ یہ ہے کہ انسانی جانیں محفوظ رہیں اور خونریزی سے روکا جائے۔ قرآن کریم اس بارے میں فرماتا ہے کہ: " ولکم فی القصاص حیوٰۃ یا اولی الالباب لعلکم تتقون [۱] " (اے صاحبان عقل وخرد! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے، شاید کہ تم تقویٰ اختیار کرو)۔ قصاص میں زندگی کا راز مضمر ہونے سے مراد یہ ہے کہ۔ جب انسان دیکھتا ہے کہ قاتل کو قصاص میں قتل کیا جاتا ہے تو یہ اس بات کا سبب بنتا ہے کہ کسی کو قتل نہ کرے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ قتل کرنے کی صورت میں اسے بھی قتل کیا جائے گا۔ اس طرح معاشرے پر قانون قصاص کا یہ اثر پڑتا ہے کہ لوگوں کی جانیں محفوظ رہیں اور کوئی قتل وخونریزی اور جنایت کا ارتکاب نہ کرے۔

۱۱۔ نذر پوری کرنا

" والوفاء بالنذر تعریضا للمغفرۃ "

(خدا نے نذر پوری کرنے کو واجب قرار دیا ہے تاکہ اس کی وجہ سے خدا کی مغفرت وعفو کی اہلیت پیدا ہوجائے)

۱۔ سورۂ بقرہ / ۱۷۹۔

اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نذر پوری کرنا مغفرت اور گناہ کی بخشودگی میں اثر رکھتا ہے. نذر پر عمل کی اہمیت اس آیہ شریفہ سے بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ: " یوفون بالنذر ویخافون یوماً کان شرہ مستطیراً(۱)" (وہ اپنی نذر پر عمل کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کا شر ہمہ گیر ہے) کیونکہ۔ اس آیت میں۔ خدا کے نیک اور صالح بندوں کی ایک نشانی، نذر پر عمل کرنا بتایا گیا ہے اور دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ: " فوقھم اللّٰہ شر ذلک الیوم ...(۲)" (پس خدا نے اس دن کی سختیوں سے ان کو بچایا۔ اور نجات دی۔) یہ آیت کریمہ، مغفرت اور قیامت کے دن کی سختی اور عذاب سے نجات کے بارے میں، نذر پر عمل کرنے کی تاثیر کو بیان کرتی ہے۔

۱۲۔ معاملات میں عدل وانصاف:

" وتوفیة المکائیل والموازین تغییراً للبخس "

(صحیح ناپ تول اس لئے واجب قرار دیا گیا ہے کہ کم فروشی نہ ہو اور کسی کا حق ضائع نہ ہو جائے)

" بخس " کے معنی ہیں گھٹانا۔ کم کرکے بیچنا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ کوئی دکاندار لوگوں کو مال کم دے اور قیمت پوری وصول کرے، خداوند عالم نے صحیح ناپ تول کا حکم دیا ہے تاکہ کسی کا حق ضائع نہ ہو اگر ناپ تول کا سسٹم نہ ہوتا تو لوگوں کے حقوق میں کمی بیشی ضرور ہوجاتی، لہذا خداوند عالم نے صحیح طریقے سے ناپ تول کرنے کا حکم دیا اور اسے واجب اور کم فروشی کو حرام قرار دیا ہے. قرآن کے کئی مقامات پر، صحیح ناپ تول اور کم فروشی کے مسئلے کی طرف توجہ دی گئی ہے اور کم فروش افراد کی سختی سے مذمت کی گئی ہے۔ اور یہ مسئلہ اتنا حساس اور اہمیت کا حامل ہے کہ مطففین۔ یعنی کم فروش افراد اور کم کرکے بیچنے والے۔ کے نام سے ایک سورہ نازل ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ کہ صحیح ناپ تول اور پیمانے کی امانت کا حکم اس لئے دیا گیا کہ کاروبار اور تجارت میں کسی کا استحصال نہ ہو کاروبار کے استحصالی نظام کو ایک صحت مند اور انصاف پر مبنی نظام میں بدل دیا جائے.

۱۔ ۲۔ سورۂ دہر / ۱۰..

۱۳۔ شراب کی حرمت،

" والنہی عن شرب الخمر تنزیھاً عن الرجس "

(شراب نوشی سے منع فرمایا تاکہ۔ تمہیں۔ آلودگیوں سے دور اور پاک رکھے)

جب کوئی شخص شراب پیتا ہے تو وہ اپنی عقل کھو بیٹھتا ہے کیونکہ شراب عقل کو زائل کردیتی ہے، جب کوئی عقل کھو بیٹھے تو ممکن ہے کہ ہر قسم کی بدکاری (خلاف شرع کام) اس سے سرزد ہوجائے یہاں تک کہ۔ مستی کی حالت میں۔ کسی کو قتل کردے. انہی مفاسد کی بنا پر خداوند متعال نے شراب نوشی حرام قرار دی ہے۔

حضرت فاطمہ زہراء (ع) کا یہ فقرہ قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے کہ: " انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان[1] " (شراب، جوا، وہ بت جن پر قربانی ذبح کی جاتی ہے اور وہ تیر جن سے استخارہ کے لئے استفادہ کیا جاتا ہے۔ یہ سب۔ پلید اور ناپاک چیزیں ہیں اور شیطانی کاموں میں سے ہیں[2]) شراب نوشی گناہ کبیرہ ہے اور صراحت کے ساتھ شرابی کو عذاب سے ڈرایا گیا ہے نیز اس کا غلط انجام بھی کسی سے پوشیدہ نہیں اور حاکم شرع شراب پینے والے پر شرعی حد، کہ جو اسی کوڑے ہیں، جاری کرے گا۔

۱۴۔ قذف کی حرمت،

" واجتناب القذف اجتناباً عن اللعنة "

(اور۔ تمہیں۔ غلط تہمتوں سے روکا گیا تاکہ تم خدا کی لعنت۔ قہر وغضب۔ سے بچ سکو)

"قذف" کے معنی ہیں کسی کو ناروا نسبت دینا۔ مثال کے طور پر کسی کو جان بوجھ کر زنا یا لواط کی

۱۔ سورۂ مائدہ / ۹۰.

۲۔ "ازلام، زلم" کی جمع ہے اور " زلم" تیز نوک والے تیر کو کہا جاتا ہے جس کے سرے پر افعل۔ کرو۔ لکھا ہوتا تھا اسے اچھا ہونے پر دلیل بنا کر انجام دیا جاتا اور جس کے سرے پر لاتفعل۔ نہ کرو۔ لکھا ہوتا تھا اسے کام کے برے ہونے پر دلیل بنا کر انجام نہیں دیا جاتا تھا۔

نسبت دی جائے، تو خدا نے لوگوں کو اس غلط کام سے منع فرمایا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کہ: " ان الذین یرمون المحصنٰت الغافلات لعنوا فی الدنیا والاخرة[1] " (وہ لوگ جو پاکدامن مگر غافل عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، یقیناً دنیا و آخرت دونوں میں وہ لعنت کیے گئے ہیں) اسی بنا پر حضرت زہراء فرماتی ہیں کہ: " واجتناب القذف " یعنی خدا نے ناروا تہمتوں سے تمہیں روکا ہے. " اجتناباً عن اللعنة " تاکہ تم خدا کی لعنت ۔ قہر و غضب ۔ سے محفوظ رہ سکو. قذف بھی گناہ کبیرہ ہے. حاکم شرع، فقہی کتابوں میں مذکورہ شرائط کے مطابق اس پر شرعی حد جاری کرے گا جو کہ اسی کوڑے ہیں. جنسی امور سے مربوط بہت ساری گالیاں ۔ جیسے ماں، بہن وغیرہ سے مربوط گالیاں ۔ اگر عمداً دی جائیں اور معنی کی طرف متوجہ ہو تو وہ بھی قذف میں شامل ہیں[2]۔

۱۵۔ چوری کی حرمت.

" وترک السرقة ایجاباً للعفة "

(خدا نے لوگوں کو چوری سے منع فرمایا تاکہ ان کے ہاتھ پاک اور عفیف رہیں)

چوری بھی گناہ کبیرہ ہے. اگر فقہی کتابوں میں مذکور شرائط پوری ہو جائیں تو اس پر شرعی حد جاری ہوتی ہے۔ ۔ یہ حد اس طرح جاری ہوگی کہ ۔ پہلی مرتبہ چوری پر دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں کاٹی جائیں گی، دوسری دفعہ چوری کرنے پر بائیں طرف کے قدم کا آدھا حصہ کاٹ دیا جائے گا، اگر تیسری دفعہ چوری کرے تو عمر قید کی سزا ہوگی، اب اگر کوئی زندان میں چوری کرے تو اس دفعہ اسے پھانسی دی جائے گی۔

چوری کے لئے جو کڑی سزائیں مقرر کی گئی ہیں، ان سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ چوری کی حرمت کس قدر شدید ہے ۔ اور شریعت کو اس سے کس قدر نفرت ہے۔

۱۔ سورۂ نور ۲۳۔

۲۔ قذف سے خاندان کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور اس کی وجہ سے لوگ طرح طرح کی برائیوں کا شکار ہو جاتے ہیں اس طرح انسانی معاشرہ انسانیت سے دور ہو کر غیر قابل اصلاح بحران کا شکار ہو جاتا ہے. جیسا کہ آج ہم مغربی دنیا میں دیکھ رہے ہیں.

۱۶۔ شرک کی حرمت:

" وحرم اللّٰہ الشرک اخلاصاً له بالربوبیة "

(خدا نے شرک کو حرام کیا تا کہ اس کی ربوبیت کے بارے اخلاص پیدا کریں)

کیونکہ وہ ہستی جو کائنات کی خالق اور رازق ہے، قدرت کاملہ اور کمال مطلق ہے، تو وہ۔ صرف۔ اللہ ہی کی ذات ہے اور خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے جھکنا۔ ایک قسم کی۔ غیر معقول حرکت ہے. پس ہمیں چاہیئے کہ صرف خدا کے سامنے جھکیں، اسی لئے تواضع کریں اور اس کے لئے اخلاص پیدا کریں اور اپنے نفس کے بتوں کو۔ دل۔ سے نکال باہر کریں، ایسا نہ ہو کہ مقام عمل میں، ہم خواہشات نفسانی کو اپنا معبود اور خدا بنالیں اور ان۔ خواہشات۔ کے مطابق زندگی گزاریں، جیسا کہ قرآن نے بھی اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ: " افرایت من اتخذ الٰھه ھواہ...(۱) " (کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا کہ جس نے اپنی خواہشات نفسانی کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔ اور خواہشات کی پرستش کرتا ہے۔) لہذا حضرت زہراءؑ اس جملہ میں فرماتی ہیں کہ: " حرم اللّٰہ الشرک " خدا نے شرک کو حرام قرار دیا ہے۔" اخلاصاً له بالربوبیه " تاکہ اس کی ربوبیت کے بارے میں سب اپنے اندر اخلاص پیدا کریں۔

اخلاص، شرک کا نقطہ مقابل اور اس کی ضد ہے. ان میں سے ہر ایک کے مراتب اور درجے ہیں اور یہ عین ممکن ہے کہ ایک انسان مؤمن بھی ہو اور نچلے درجے کے شرک۔ شرک خفی۔ میں بھی مبتلا ہو، جیسا کہ قرآن میں بھی آیا ہے کہ: " وما مؤمن اکثرھم باللّٰہ الا وھم مشرکون (۲) " (اکثر لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے ہیں مگر یہ کہ وہ۔ اب بھی۔ مشرک ہیں)۔ یعنی جو لوگ ایمان لاتے ہیں تو ان کے ایمان میں شرک کی آمیزش ہے اور وہ کسی نازلتر درجہ پر شرک میں مبتلا ہیں اور اس لحاظ سے مشرک ہیں۔ بنابریں، ایمان کامل، تو صرف انبیاءؑ، اولیاء اور خدا کے مقرب بندوں کا ایمان ہے کہ جو ہر قسم کے شرک سے پاک اور منزہ ہوتا ہے۔

۱۔ سورۂ جاثیہ / ۲۳۔ ۲۔ سورۂ یوسف / ۱۰۶۔

تقوی کی وصیت:

" فاتقوا اللہ حق تقاتہ "

(پس لوگو؛ حریم کبریائی کا اس طرح پاس رکھو جس طرح پاسداری کا حق ہے)

ہر شخص، ایک مخصوص مقام و منزلت رکھتا ہے اور اسی مقام و منزلت کے لحاظ سے اس کی شخصیت کو محفوظ ہونا چاہیے۔ اب خدا کی عظمت اور بزرگی و کبریائی کا عالم یہ ہے کہ عقل انسانی اس کی معرفت کی وادی میں حیران اور دنگ رہ جاتی ہے تو یہ واضح سی بات ہے کہ حریم کبریائی کی پاسداری اور تقویٰ کی ذمہ داری کس قدر سنگین ہوگی۔

" ولا تموتن الا وانتم مسلمون "

(۔اس طرح زندگی گزارو کہ۔ تم پر موت نہ آجائے مگر یہ کہ تم مسلمان ہو)

۔ ہر وہ شخص جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے۔ اسلام کی موت نہیں مرتا، بلکہ مادیات کے ساتھ اس کی دلبستگی اور دنیا کی محبت اس بات کا سبب بنتی ہے کہ وہ عمر کے آخری لمحوں میں ہر چیز کا انکار کردے! انسان اپنی پوری زندگی میں خدا اور پیغمبر (ص) کا نام لیتا رہتا ہے لیکن پھر بھی وہ ہر چیز کا منکر ہوجاتا ہے۔ انسان کو ایسے مواقع پر خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔

اسلام کے ساتھ موت آنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دنیوی وابستگیوں کی قید سے خود کو رہا کریں اور جیسا کہ حضرت زہراء (ع) نے بھی اپنے خطبے میں فرمایا کہ خدا کی حریم کبریائی کا پاس رکھنا چاہیے کیونکہ صرف ان لوگوں کا انجام اچھا ہوسکتا ہے کہ جو متقی اور پرہیز گار ہوں، " والعاقبة للمتقین (۱)"

" واطیعوا اللّٰہ فیما امرکم بہ وانہاکم عنہ "

(خدا کی اطاعت کرو ان چیزوں میں کہ جن کا خدا نے امر کیا ہے یا اس سے روکا ہے)

۔ یعنی خدا کے اوامر اور نواہی میں اس کی اطاعت کرو۔ مقصد یہ ہے کہ واجبات کو ادا کریں اور محرمات سے بچے رہیں، بعض لوگ واجبات پر عمل کرنے کے بجائے، مستحبات پر عمل کرتے ہیں

۱۔ سورۂ اعراف / ۱۲۸

حالانکہ یہ سراسر غلطی ہے. ضروری ہے کہ انسان سب سے پہلے واجبات اور محرمات کو اہمیت دے اور دوسرے مرحلے میں مستحبات پر عمل کرے۔ البتہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم مستحبات سے غفلت برتنے لگیں۔ بلکہ حتی المقدور مستحبات پر بھی عمل کرنا چاہئے کیونکہ انسان کی روح کی پاکیزگی اور معنوی درجات کے حصول میں مستحبات کا بڑا عمل دخل ہے. در حقیقت مستحبات کو بجالانا، واجبات کی تکمیل ہے۔

خدا کی معرفت اور علم کا رابطہ،

" فانہ انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء(۱) "

(کیونکہ فقط خدا کے صاحبان علم بندے ہی خدا سے ڈرتے ہیں)

اگر کوئی صحیح معنوں میں عالم ہو، خدا کی معرفت رکھتا ہو اور حق تعالیٰ کی صفات اور کمالات سے آگاہی رکھتا ہو تو وہ خود بخود خدا کی عظمت کے سامنے مرعوب ہوتا ہے. اس طرح کی خدا شناسی سائنسی علوم کے ذریعے بھی حاصل ہوتی ہے اور " انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء " کی اس آیت میں لفظ علماء سے مراد صرف علم فقہ اور اصول کے دانشور ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے ذکر شدہ آیات کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سائنس اور معاشرتی علوم کے دانشور بھی شامل ہیں، کیونکہ وہاں ارشاد ہوتا ہے کہ: " الم تر ان اللّٰہ انزل من السماء ماءً فاخرجنا بہ ثمرات مختلفاً الوانہا ومن الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانہا وغرابیب سود ومن الناس والدواب والانعام مختلف الوانہ کذلک (۲) " (کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ: خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے رنگارنگ میوے پیدا کئے اور پہاڑوں میں بھی سفید، سرخ، بہت سیاہ اور دوسرے مختلف رنگوں کی نشانیاں بنائیں اور اسی طرح انسانوں، جنبندگان اور چارپاؤں کو بھی مختلف رنگ اور شکل میں پیدا کیا) ان آیات میں خداوند عالم، نظام خلقت کی طرف اشارہ فرماتا ہے اور اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ یہ

۱۔ سورۂ فاطر / ۲۸۔ ۲۔ سورۂ فاطر / ۲۷۔ ۲۸۔

سارے موجودات انتہائی ظرافت اور عظمت کے ساتھ خلق ہوئے ہیں اور اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ان کا کوئی خالق ہے اور وہ قادر مطلق اور حکیم علی الاطلاق ہے. یہاں پر زمین شناسی، معدن شناسی، انسان شناسی اور حیوان شناسی سے مربوط چند مسائل کو بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ: " انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء " تو اس کا مقصد یہ ہے کہ جو بھی ان علوم سے باخبر ہو اور یہ جانتا ہو کہ کائنات کی خلقت میں کس قدر دقت، طاقت، ہنرمندی اور نفاست سے کام لیا گیا ہے تو یہ خود بخود خدا کے سامنے مرعوب ہوگا اور خدا ترس بنے گا. پس معلوم ہوا کہ اس آیہ شریفہ میں لفظ علماء سے مراد صرف فقہ اور اصول ۔ وہ علم جس میں فقہ کے ماخذ اور منابع سے بحث کی جاتی ہے ۔ کے جاننے والے علماء ہی نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جو انسان بھی، انسانی، معاشرتی اور سائنسی علوم میں دسترسی رکھتا ہو اور یہ جان لے کہ اس کائنات کا کوئی حکیم، دانا اور قادر توانا خالق ہے تو وہ خود بخود خدا کی عظمت کے سامنے جھک جائے گا ۔ اور اپنی بے چارگی اور بے بسی کا اس کو بھرپور احساس ہوگا ۔ (۱)

اپنی اور اپنے پدر بزرگوار کی شخصیت کا تعارف:

" ثم قالت، ایہا الناس اعلموا: انی فاطمة وابی محمد (ص) "

(پھر آپؑ نے فرمایا کہ لوگو! جان لو کہ میں فاطمہ ہوں اور میرے باپ محمد (ص) ہیں)

یہاں پر آپؑ لوگوں کے احساسات وجذبات کو بیدار کرنا چاہتی ہیں کہ تمہیں کس طرح گوارا

۱۔ البتہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مادی علوم کا ہر دانشور اور ہر سائنسدان، خدا شناس ہو کیونکہ بہت سارے ایسے سائنسدان بھی ہیں جن کے دلوں میں خدا سے خوف اور خشوع کا دور دور تک بھی کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا، بلکہ مقصد یہ ہے کہ: سائنسی علوم، کائنات کی خلقت کی عظمت اور ان کی تخلیق میں پائی جانے والی دقت اور نظم سے آگاہی کے ذریعے خداوند متعال کی عظمت اور اس کی قدرت کاملہ کو پہچانا جاسکتا ہے اور جو بھی خدا کی عظمت وبزرگی کو درک کرے گا تو فطری طور پر اس میں خدا کے لئے خشوع پیدا ہوگا.
دوسرے الفاظ میں، کائنات اور اس کے اندر موجود نظام اور قانون کی معرفت ہی خدا شناسی اور خدا ترسی ہے لیکن ہر سائنسدان کا اس راہ پر گامزن ہونا یا نہ ہونا دوسری بات ہے. سائنسی علوم کے کتنے ہی ایسے ماہرین ہیں کہ جو اپنے علم واپنی معرفت کے برخلاف قدم اٹھاتے ہیں.

ہے کہ ہمارے اوپر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے جائیں اور تم خاموش تماشائی بنے رہو!

" اقول عوداً وبدواً ولا اقول ما اقول غلطاً "

(ایک بار کہتی ہوں پھر بھی کہوں گی۔ یعنی بار بار کہوں گی۔ لیکن جو بات بھی کہوں گی اس میں کوئی غلطی نہیں ہوگی)

" ولا افعل ما افعل شططاً "

(اور جو کام کروں گی اس میں خلاف حق کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی)

"شطط" وہ چیز جو حق کے خلاف ہو. حضرت زہراء(ع) یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ: میں جو کچھ کہہ رہی ہوں یا انجام دے رہی ہوں وہ حق کے عین مطابق ہے اور حق سے ہٹ کر نہ تو کوئی بات کرتی ہوں اور نہ ہی کوئی قدم اٹھاتی ہوں۔

" لقد جاء کم رسول من انفسکم(۱) "

(بتحقیق تمہارے پاس ایک ایسا رسول آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے اور اسی معاشرے سے اٹھا ہے)

پیغمبر(ص) انہی لوگوں اور اسی معاشرے میں سے تھے اور پیغمبر(ص) کا کسی ایسے طبقے سے تعلق نہ تھا کہ جس کا تعلق معاشرہ سے کٹ کر ایک الگ تھلگ طبقے سے ہو، بلکہ پیغمبر(ص) کا تعلق اسی معاشرے سے تھا اور وہ شخص جو اسی معاشرے سے اٹھا ہو وہ معاشرے کے تمام دکھ درد اور ان کی مشکلات سے واقف ہوتا ہے کیونکہ وہ خود بھی اس معاشرے میں موجود مشکلات اور سختیوں کا مزہ چکھ چکا ہوتا ہے لہذا اس قسم کے افراد ہی معاشرے کے خیر خواہ اور دلسوز راہنما ثابت ہوتے ہیں۔

" عزیز علیہ ما عنتم "

(اگر تم پر سختیاں اور مشکلات آتی تھیں تو وہ ان پر بہت ہی گراں گزرتی تھیں)

اگر کوئی صحیح معنوں میں اسی معاشرے کا فرد ہو تو وہ اس معاشرے کا دلسوز بھی ہوتا ہے لہذا اگر اس معاشرے کے کسی بھی فرد پر کوئی سختی یا دباؤ بھی آئے تو وہ غمگین ہوتا ہے اور لوگوں کے دکھ درد میں ان کا شریک ہوتا ہے اور اپنے آپ کو ان سختیوں سے الگ تھلگ نہیں سمجھتا۔ " عزیز علیہ " یعنی

۱۔ یہاں سے وہ باتیں شروع ہوتی ہیں جن کے بارے میں آپ نے فرمائی تھیں کہ "میں جو کچھ بھی کہوں گی صحیح اور حق کی بات کہوں گی"

پیغمبر اسلام (ص) پر بہت ہی سخت اور گراں گزرتا ہے کہ " ماعنتم " اگر تم پر کوئی مشکل یا سختی آپڑے تو.
یہاں ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ: خدا پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے تم پر جو ضرر واقع ہو رہا تھا،
رسول خدا (ص) کو اس سے بہت دکھ ہوتا تھا، اسی لئے وہ بہت ہی چاہتے تھے کہ تم خدا پر ایمان لاؤ اور
سیدھے راستے کی طرف ہدایت پاؤ۔

" حریص علیکم، بالمؤمنین رؤف رحیم "

(تمہاری بھلائی کے خواہاں اور مؤمنین پر شفیق اور مہربان تھے)

پیغمبر (ص) تمہاری بھلائی چاہتے تھے اور اس بات کے متمنی تھے کہ جس میں تمہاری بہتری ہو اسے انجام دے اور اہل ایمان پر بہت بہت مہربان اور شفقت رکھتے تھے. آپؐ کے یہ جملے قرآن سے ماخوذ ہیں اور بعینہ یہی الفاظ قرآن میں ذکر ہوئے ہیں (۱)۔

دوسری آیت میں ارشاد ربانی ہے کہ: " وما ارسلناک الا رحمة للعالمین (۲) " (۔اے ہمارے حبیب۔ ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ ۔ آپ کو ۔ دونوں جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے) حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ آپ (ص) تمام انسانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے لیکن مؤمنین پر آپ (ص) زیادہ مہربان اور ان پر آپ (ص) خصوصی نظر رحمت رکھتے تھے۔

پیغمبر اسلام (ص) اور حضرت علی (ع) کی اخوت اور ہمبستگی:

" فان تعزرہ وتعرفوہ تجدوہ ابی دون نسائکم "

(اگر تم پیغمبر اکرم (ص) کے نسب کو دیکھو اور اسے پہچانو تو تم جان لوگے کہ وہ میرا باپ ہے، تمہاری عورتوں کا نہیں)

" واخا ابن عمی دون رجالکم "

(اور میرے چچازاد۔ حضرت علیؑ۔ کے بھائی ہیں نہ کہ تمہارے مردوں میں سے کسی کے بھائی)

یہ تو سب جانتے تھے کہ جب پیغمبر اسلام (ص) مدینہ تشریف لائے تو آپ (ص) نے مہاجرین اور انصار

۱۔ سورۂ توبہ / ۱۲۸.   ۲۔ سورۂ انبیاء / ۱۰۷.

غرض تمام مسلمانوں کے درمیان عقد اخوت (مؤاخات) باندھا اس وقت آپ (ص) نے حضرت علیؑ کے ساتھ عقد اخوت جاری فرمایا اور حضرت علیؑ کو اپنے بھائی کے عنوان سے انتخاب فرمایا۔

یہاں پر حضرت زہراء (ع) پیغمبر (ص) کے ساتھ حضرت امیر المؤمنینؑ کی قرابت اور رشتہ داری کی طرف لوگوں کو متوجہ کرانا چاہتی ہیں اور یہ بتا دینا چاہتی ہیں کہ امیر المؤمنینؑ میرے چچازاد بھائی ہونے کے علاوہ رسول خدا (ص) کے ساتھ اخوت بھی رکھتے ہیں اور اس اخوت کا لازمہ یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان معنوی اور روحانی لحاظ سے ایک قسم کی ہم آہنگی بھی موجود ہے. اس طرح آپؑ یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ امیر المؤمنینؑ کی معنویت اور ان کے روحانی درجات اور کیفیت پیغمبر اکرم (ص) کی طرح ہیں اور وہ اسی مقام و عظمت کے حامل ہیں۔

"ولنعم المعزیٰ الیہ"

(اور کس قدر خوش قسمت ہے وہ شخص کہ جس کی نسبت۔ رسول خدا (ص)۔ سے ہو)

البتہ یہاں پر نسبت سے مراد، پیغمبر (ص) کے ساتھ معنوی اور روحانی نسبت ہے، کیونکہ اگر صرف رشتہ داری کی نسبت مراد ہوتی تو ابو بکر اور عمر بھی پیغمبر (ص) کے رشتہ دار تھے، کیونکہ ابو بکر عائشہ کا باپ، اور عمر حفصہ کا باپ تھا اور یہ دونوں پیغمبر (ص) کی زوجات میں سے تھیں، پس۔ جس نسبت پر افتخار کیا جا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ (ع) کا۔ مقصد ظاہری رشتہ داری ہی نہیں۔ بلکہ روحانی، معنوی اور فکری اتحاد ہے کہ جو حضرت علیؑ اور۔ پیغمبر (ص) کے درمیان پایا جاتا تھا اور یہی اتحاد اس بات کا سبب بنا کہ مدینہ میں پہنچتے ہی پیغمبر اکرم (ص) آپؑ کو اپنے بھائی کے عنوان سے انتخاب کریں اور آپؑ کے ساتھ عقد اخوت باندھیں۔

آغاز رسالت کی کیفیت:

"فبلّغ الرسالۃ صادعاً بالنذارۃ"

(پھر رسول خدا (ص) نے۔ جہالت اور شرک۔ سے لوگوں کو ڈراتے ہوئے پیغام رسالت پہنچایا)

" صدع " پھاڑنے اور ظاہر کرنے کے معنی میں آتا ہیں اور اس اعتبار سے کہ ۔ تبلیغ رسالت ۔ سکوت کو توڑ دیتی ہے اور کسی ایسی بات کو سامنے لاتی ہے کہ معاشرے میں موجود ماحول کو دگرگوں کردیتی ہے۔ ذیل کی آیت کریمہ میں ۔ تبلیغ رسالت کے حوالے سے ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ : " فاصدع بما تؤمر (۱) " (یعنی اظہر بما تؤمر: جس چیز کی تمہیں ذمہ داری سونپی گئی ہے اسے بیان اور ظاہر کر) حقیقت یہ ہے کہ ۔ رسول خدا (ص) کی رسالت، اس دور کی معاشرتی صورت حال کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ وہ ان شرائط اور حالات کے سراسر برخلاف تھی جو اس وقت (عرب) کے معاشرے میں پائے جاتے تھے ۔ اسی لئے رسول خدا (ص) کے ذریعے ابلاغ رسالت اور لوگوں کو ۔ گمراہی وشرک ۔ سے ڈرانا، اس بات کا سبب بنا کہ اس وقت معاشرے میں پائے جانے والی خاموشی کے طلسم ٹوٹ جائیں ۔

" مائلأ عن مدرجة المشرکین "

(مشرکین کی روش کو ٹھکراتے ہوئے ۔ لوگوں کو توحید ویکتا پرستی کی طرف دعوت دی ۔)

اگرچہ پیغمبر (ص) کے رشتہ داروں، خاندان کے افراد اور دوسرے لوگوں کی اکثریت مشرک اور بت پرست تھے، رسول خدا (ص) نے ان کی راہ وروش کی کوئی پرواہ نہیں کی اور جس راستے پر وہ چلتے تھے اس کی مخالفت کرتے ہوئے توحید کا راستہ اختیار فرماتے اور لوگوں کو خدا پرستی کی دعوت دیتے اور شرک وبت پرستی سے ڈراتے تھے ۔

" ضارباً ثبجهم ، اخذاً باکظامهم "

(۔ اپنی تبلیغ کے ذریعے ۔ آپ (ص) نے کفار کی کمر توڑ دی تھی اور ان کی سانس کو سینوں میں بند کردیا تھا)

" ثبج " فرس کے وزن پر کمر اور کسی چیز کے درمیانی حصہ کے معنی میں آتا ہے اور " کَظَم " بھی فرس کا ہم وزن ہے اور اس کے معنی ہیں سانس کی نالی اور گلہ ۔ ان دو فقروں کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اکرم (ص) کفار کے ساتھ انتہائی شدت اور سخت طریقے سے پیش آتے تھے اسی لئے قرآن میں بھی ارشاد ہوا ہے کہ : " اشداء علی الکفار (۲) " (پیغمبر (ص) اور اس کے ساتھی، کفار کے ساتھ سختی سے پیش آتے

۱۔ سورۂ حجر / ۹۴ ۔ ۲۔ سورۂ فتح / ۲۹ ۔

تھے) البتہ کفار کے ساتھ انتہائی سختی اور شدت سے پیش آنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اخلاقی اور انسانی اصولوں کا لحاظ نہ رکھا جائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ دینی امور میں۔ کسی قسم کی لچک، سودا بازی اور سہل انگاری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ۔ اپنی پوری طاقت اور ہمت کے ساتھ منطقی طریقہ سے استقامت کرنی چاہیے۔

دعوت کے تین مراحل:

" داعیا الی سبیل ربه بالحکمة والموعظة الحسنة "

(اور یہ اس وقت تھا کہ جب آپ (ص) لوگوں کو حکمت۔ واستدلال۔ اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے، خدا کیطرف بلاتے تھے)

ان فقروں میں آپؑ دعوت کے مراتب کا ذکر فرماتی ہیں، جیسا کہ قرآن بھی فرماتا ہے کہ: " ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن (۱) " (حکمت، اچھی نصیحت اور بہترین مجادلہ کے ذریعے اپنے پروردگار کی راہ۔ توحید۔ کی طرف دعوت دو) آیہ شریفہ دعوت کے تین مرحلے بیان فرما رہی ہے:

۱۔ استدلال اور برہان کا مرحلہ: وہ افراد جو استدلال اور منطق کے پابند ہیں اگر ان کو کوئی بات دلیل کے ذریعے بتائی جائے تو قبول کر لیتے ہیں، ایسے افراد کو استدلال اور حکمت کے ذریعے خدا کی طرف دعوت دینی چاہیے۔

۲۔ موعظہ کا مرحلہ: بعض افراد ایسے ہیں جو استدلال کو نہیں سمجھتے ہیں بلکہ ان کی عقلیں ان کے جذبات کے تابع ہیں، مثلاً ایسے افراد کہ جو امام رضاؑ کو ان کے سنہری گنبد کے ذریعے سے پہچانتے ہیں جبکہ ان کے مقابلے میں علم و فضل اور منطق و استدلال سے سروکار رکھنے والے افراد ہیں کہ جو امام رضاؑ کو ان کے کمالات کے ذریعے پہچانتے ہیں۔ بہر صورت۔ احساسات و عواطف سے مغلوب۔ افراد کو موعظہ و نصیحت کے ذریعے ہدایت کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ موعظہ و نصیحت میں تقریر کا پہلو نمایاں

۱۔ سورۂ نحل / ۱۲۵۔

ہوتا ہے اور ایسی باتوں سے استفادہ کیا جاتا ہے جو سننے والے کو متاثر کریں۔

۳۔ جدل کا مرحلہ: بعض افراد ضدی اور ہٹ دھرم ہوتے ہیں وہ نہ منطق واستدلال کو قبول کرتے ہیں اور نہ ہی نصیحت کا ان پر کوئی اثر ہوتا ہے، ایسے افراد کے ساتھ جدل سے کام لیا جائے اور وہ جن چیزوں کو مانتے ہیں ان کے ذریعے ان پر حجت تمام کرکے۔ اور۔ انہیں بحث میں شکست دے کر راہ راست کی طرف دعوت دی جائے۔

پیغمبر (ص) کی بت شکنی،

"یکسر الاصنام وینکت۔ینکث۔الھام"

(پیغمبر (ص) نے بتوں۔اور جھوٹے معبودوں۔کو توڑ دیا اور اپنے ہاتھوں سے مشرکین کے سروں کو کچل دیا)

پیغمبر اکرم (ص) اپنے ہاتھوں سے بتوں کو توڑتے تھے۔ آپ (ص) نے ۳۶۰ بتوں کو توڑا، جنگوں میں بنفس نفیس شرکت فرماتے تھے اور مشرکین پر کاری ضرب لگاتے تھے۔

مندرجہ بالا دوسرا جملہ، دو صورتوں میں نقل ہوا ہے، بعض نسخوں میں "ینکت" اور بعض میں "ینکث" ذکر ہوا ہے، لیکن بظاہر "ینکت" صحیح نظر آتا ہے کیونکہ "ینکت" کے معنی ہیں ہاتھ سے کسی پر ضرب لگانا۔ الھام یعنی کھوپڑی۔ اس طرح "ینکت الھام" کے یہ معنی ہوں گے کہ رسول خدا (ص) مشرکین پر اپنے طاقتور ہاتھوں سے وار کرتے اور ان کا خاتمہ کردیتے تھے، لیکن اگر "ینکث الھام" ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ (ص) بتوں کو منہ کے بل گرادیتے تھے۔

"حتی انھزم الجمع وولوا الدبر"

(یہاں تک کہ مشرکین کی جمعیت نابود ہوگئی اور وہ سب بھاگ گئے)

پیغمبر اسلام (ص) اور مسلمانوں کی مقاومت اور فداکاری کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکین نے ہر میدان میں شکست کھائی اور اپنے مورچے خالی کرکے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگئے (۱)۔

۱۔ آپ کا یہ فقرہ شاید سورۂ ص آیت ۱۱ کی طرف اشارہ ہو جہاں ارشاد ہوتا ہے کہ: "جند ما ھنالک مھزوم من الاحزاب" یعنی (وہ ==

توحید کا پرچار اور کفر کا خاتمہ:

"حتی تفری اللیل عن صبحہ"

(یہاں تک کہ اندھیری رات کا خاتمہ ہو گیا اور صبح آشکار ہوئی)

پیغمبر اسلام (ص) نے جو زحمتیں اور تکلیفیں برداشت کی تھیں اور جس ایثار و فداکاری کا مظاہرہ کیا تھا، اس نے رنگ لایا، اسلام کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں اور شرک و بت پرستی نابود ہو گئی اور۔ کفر وضلالت کی گھٹاٹوپ اندھیری۔ رات ختم ہو گئی اور۔ حق وحقیقت نیز ہدایت کی۔ نورانی صبح آشکار ہوئی. اس جملے میں تشبیہ اور استعارہ سے کام لیا گیا ہے اور کفر وشرک کو شب تاریک سے اور حق وحقیقت۔ اسلام۔ کو صبح سے تشبیہ دی گئی ہے، جب اندھیری رات ختم ہوجاتی ہے اور صبح نمودار ہوتی ہے تو سورج کی نورانی کرنیں دنیا کو روشن کررہی ہوتی ہیں. اسی لئے آپ فرماتی ہیں کہ: "تفری اللیل عن صبحہ" (رات کی۔ ہولناک دیواروں میں۔ صبح کی وجہ سے شگاف پڑگیا) آپ کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح رات کی تاریکی کے اندر سے صبح کی روشنی نمودار ہوتی ہے اسی طرح اس وقت کے ماحول میں جو کفر وشرک کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، شگاف پڑگیا اور توحید کی روشنی نمایاں ہوئی۔

"واسفر الحق عن محضہ"

(اور حق اپنی حقیقی اور اصلی شکل میں آشکار ہو گیا)

"اسفر" کے معنی ہیں ظاہر اور آشکار۔ یہاں "اسفر الحق" سے صحیح اور خالص توحید مراد ہے، حق اور خدا پرستی کا نور، زمانہ جاہلیت کی خرافات اور جہالت ونادانی کے دبیز پردوں میں مخفی ہوچکا تھا، لیکن رسول خدا (ص) کی بعثت نے ان پردوں کو چاک کردیا اور معاشرے کی تطہیر کی اور حق وعدالت کی راہ کو نمایاں کیا (۱)۔

== ساری جماعتیں اور لشکر جنہوں نے اسلام اور عدالت کے مقابلے میں شکست کھائی) مقصود یا جنگ بدر ہے یا مجموعی طور پر حق کے مقابلے میں باطل کا محاذ۔

۱۔ قرآن میں جو ارشاد ہے کہ "ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ" (آل عمران / ۱۶۴) پیغمبرؐ نے انہیں پاک کیا اور کتاب وحکمت سکھائی تو وہ اس واقعیت کو بیان کرنا چاہتا ہے کہ تعلیم کتاب وحکمت کا مقدمہ، تزکیہ نفس ہے جب تک انسان کا دل ودماغ خرافات اور جہالت سے پاک نہ ہو تو حکمت ودانش کا دل میں ترقی کرنا ممکن ہی نہیں۔

"ونطق زعيم الـدين وخرست شقاشق الشياطين"

(اور دین کے زعیم اور رہبر نے جب بولنا شروع کیا تو ان شیاطین کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اور وہ خاموش ہوگئے)

دین کے پیشوا اور رہبر نے بولنا شروع کیا یعنی، ختمی مرتبت (ص) نے جب دین کی تبلیغ آغاز کی اور گفتگو شروع فرمائی کی تو کفر کے بولنے والے خاموش ہوگئے۔

"شقاشق، شقشقہ" کی جمع ہے۔ جب اونٹ غضب میں آتا ہے آواز نکالتا ہے تو اس کا منہ جھاگ سے بھر جاتا ہے اور اس کے منہ سے جھاگ جیسی ایک چیز نکلتی ہے کہ جسے۔ عربی میں۔ "شقشقہ" کہتے ہیں۔ یہاں پر کفار کو اس طرح کے اونٹ کے ساتھ تشبیہہ دی گئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب پیغمبر (ص) نے گفتگو اور بولنے کی ابتدا فرمائی تو ان شیاطین کی بلند آواز کٹ گئی اور خاموش ہو گئی جبکہ ان کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

منافقت اور کفر کی شکست:

"وطاح وشيظ النفاق" (اور منافقین کی جماعت نابود ہو گئی)

"طاح" ہلاک ہوا، "وشيظ النفاق" اہل نفاق کی جماعت۔ لغت میں۔ وشیظ۔ پست، حقیر اور بے نام ونسب افراد کو کہا جاتا ہے اور منافقین بھی عموماً اسی قسم کے افراد ہی ہوا کرتے ہیں، ورنہ صاحب کردار اور اچھے خاندان کے افراد بہت کم ہی منافقت اور دو روئی کا شکار ہوتے ہیں اور کبھی۔ منافقت نہ کرکے۔ بہت سارے مادی مفادات کو ٹھکرا دیتے ہیں اور کئی خطروں کو مول لیتے ہیں۔

"وانحلت عقد الكفـر والشقاق" (اور کفر و دشمنی کی گرہیں کھل گئیں)

کفر اور دشمنی کی گرہ سے مراد، شاید کفر اور اسلام دشمن طاقتوں کے درمیان ہونے والے عہد و پیمان اور معاہدے ہوں کہ جن کی بنا پر وہ اسلام کے مقابلے میں متحد ہوجاتے تھے اور ایک محاذ تشکیل دے رکھا تھا اور اسلام کی کامیابی اور مرحلہ وار پیشرفت کے نتیجے میں ان کے عہد و پیمان اور معاہدے بھی خود بخود ختم ہوگئے۔

"وفهتم بكلمة الاخلاص"

(اور تم سب کلمہ اخلاص وتوحید پڑھنے لگے)

"فاہ" اس نے زبان سے کوئی بات کہی، اس کا مضارع "یفوہ" ہے۔ مقصود یہ ہے کہ: تم پیغمبر اسلام (ص) پر ایمان لائے، اسلام اختیار کیا اور کلمہ اخلاص یعنی "لا الٰہ الا اللّٰہ" کو زبان پر جاری کیا۔ جب اسلام کے راستے سے رکاوٹیں دور ہوجائیں اور کفار واسلام دشمن عناصر کے معاہدے ختم ہوجائیں تو لوگ اپنی خداداد فطرت کی رو سے توحید اور اخلاص کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔

"فی نفر من البیض الخماص"

(اور تم ایک ایسے گروہ میں تھے کہ جو نورانی چہرے اور خالی شکم۔ روزہ دار۔ انسانوں پر مشتمل تھا)

"بیض" "ابیض" کی جمع ہے یعنی سفید، "خماص" "خمص" کی جمع ہے اور اس کے معنی ہیں بھوکے، جن کے پیٹ خالی ہوں۔ "البیض الخماص" سے روزہ دار اور نورانیت کے حامل افراد کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور آپؑ یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ تم ایک ایسے گروہ کے درمیان رہ رہے تھے جو نورانی اور سفید چہرے رکھتے تھے اور روزہ زیادہ رکھنے کی وجہ سے جن کے پیٹ ہمیشہ خالی رہتے تھے، اس گروہ سے آپؑ کی مراد اہل بیت پیغمبر (ص) ہیں چونکہ اس جملہ کی تشریح آپؑ خود فرماتی ہیں کہ:

"الذین اذھب اللّٰہ عنھم الرجس وطھّرھم تطھیراً"

(وہی افراد کہ جن سے خدا نے آلودگیوں کو دور کیا اور پاکیزگی۔ وطہارت۔ عطا کی)

یہ جملہ، سورۂ احزاب کی آیت ۳۳ کی جانب اشارہ ہے جو بہت ساری روایات کے مطابق اہل بیت علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی اور ان ہستیوں کی عصمت کے بارے میں بنی نوع انسان کو آگاہ کیا(۱)۔ ان کے شکم خالی ہونے کی یہ صفت کنایہ ہے اس بات سے کہ اہل بیتؑ کے شکم، مشکوک

۱۔ تفسیر المیزان ج ۱۶ ص ۳۱۱ میں مذکور ہے کہ "ام سلمہ اور عائشہ کی اسناد سے اہل سنت کی مختلف کتابوں میں تقریباً ۴۰ روایتیں اور شیعہ کتب میں تقریباً ۳۰ روایتیں، امیر المؤمنینؑ، امام سجادؑ، امام باقرؑ وامام صادقؑ کی طرف سے نقل ہوئی ہیں۔ یہ ساری روایتیں صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آیۂ تطہیر، اہل بیتؑ کی شان ہی میں نازل ہوئی ہے"۔

غذاؤں سے خالی ہیں۔ یعنی کوئی ایسا لقمہ وہ نہیں اٹھاتے تھے کہ جس میں کوئی شبہ ہو۔ یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کثرت روزہ کی وجہ سے ان کے شکم اکثر خالی ہی رہتے تھے اور وہ بہت کم ہی کھانا کھاتے تھے۔

چہرے کی نُورانیت اور سفید روئی بھی، اہل بیتؑ کے معنوی اور معاشرتی مقام و منزلت اور ان کی خاندانی شرافت نیز حسب ونسب کی عظمت کی طرف اشارہ ہے. البتہ علامہ مجلسی مرحوم نے ان دو جملوں کے بارے میں اور کئی احتمالات بھی نقل فرمائے ہیں کہ جو ہماری نظر میں صحیح نظر نہیں آتے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پانچواں درس:

- زمانہ جاہلیت میں،

جـــزیرۃ العرب میں انحطاط وپستی کے چند نمونے :-

۱۔معنوی کمزوری　　　۲۔سیاسی اور معاشرتی کمزوریاں

۳۔معاشی کمزوری　　　۴۔نفسیاتی کمزوری

- پیغمبر (ص) کے ذریعے انسانیت کی نجات
- اسلام کی ترویج میں حضرت علی (ع) کا کردار
- مختلف جنگی محاذوں میں،

  حضرت علی (ع) کی دلیری اور شجاعت کے نمونے
- حضرت امیرالمؤمنین (ع) کی چند خصوصیات
- کل کے گوشہ نشین، آج کے مفاد پرست
- مفاد پرستوں کی خصوصیات
- رحلت پیغمبر (ص) اور اس کے اثرات
- گھات میں بیٹھے ہوئے شیطان صفت لوگ
- بے وقوف تابعـــدار

وَ كُنْتُمْ عَلىٰ شَفٰاحُفْرَةٍ مِنَ النّٰارِ، مذقة الشّٰارِب وَ نُـهزَة الطـامع وَ قُـبْسَةِ العجلان و موطيء الأَقْـدام؛ تَشْـرَبُونَ الطَّـرَق وَ تَـقْتاتُونَ القـدّ [الورق]، أَذِلَّـةً خٰاسِئِينَ، تَخٰافُونَ أن يَتخطَّفَكُمُ النّٰاسُ مِنْ حَوْلِكُمْ، فَأَنْقَذَكُمُ اللّٰهُ تَبٰارَكَ وَ تَعٰالىٰ بِأَبى مُحَمَّدٍ ﷺ بَعْدَ اللَّتَيّٰا و الَّتى وَ بَعْدَ أن مُنى بِبُهمِ الرِّجال، وَ ذُؤْبان العَرَبِ، وَ مردةِ أَهْلِ الكتاب، كُلَّما أَوْقَدُوا ناراً لِلْحَرْبِ أَطْفَأَها اللّٰه، أَوْ نَجَم قَرْنُ الشَّيْطٰانِ أَوْ فغرَتْ فاغِرَةٌ مِنَ المُشْرِكين، قذف أَخٰاه فى لَهواتها، فَـلا يَـنْكفىء حـتى يَـطَأَ صماخها بِأَخْمُصِهِ و يَخمد لهبها بِسَيْفِهِ، مَكْدُوداً فى ذٰاتِ اللّٰه، مُجْتَهداً فى أَمْرِ اللّٰه، قَريباً مِنْ رَسُولِ اللّٰه، سَيِّداً فى أَوْلِيٰاءِ اللّٰه، مشمّراً نـاصِحاً، مُـجِدّاً كـادِحاً، لاتَأْخُذُهُ فِى اللّٰهِ لَوْمَةَ لائِم؛ وَ أَنْتُمْ فى رِفٰاهِيَّةٍ مِنَ الْعَيْشِ، وادِعُونَ فٰاكِهون آمِنُونَ، تَتَرَبَّصُونَ بناالدَّوٰائر، و تتوكَّفون الأَخبار، وَ تنكصون عِنْد النّزال، و تفرّونَ مِنَ القِتٰالِ؛ فَلَمّا اخْتٰارَ اللّٰهُ لِنَبِيِّهِ دٰارَ أَنبيائه وَ مَأوى أَصْفِيٰائه، ظَـهَرَ فـيكم حسْكَـةُ النِّفٰاق، و سمل جِلْبٰاب الدين، وَ نَطَقَ كاظم الغاوين، وَ نبغ خامل الأَقلّين، و هدر فنيق المُبْطلين، فخطر فى عَرَصٰاتِكُمْ و أطلع الشيطان رَأْسَه مِنْ مَغْرزِه، هـاتفاً بِكُمْ فَأَلْفاكُم لِدَعْوَتِهِ مُسْتَجيبِينَ، وَ لِلْعِزَّةِ [للغرّة] فيه ملاحظين، ثُمَّ اسْتَنْهَضَكُمْ فَوَجَدَكُمْ خفافاً، وَ أَحْمَشَكُمْ فَأَلْفاكُمْ غضاباً، فَوَسَمْتُمْ غير إبلكم، وَ وردْتُمْ غير مشربكم.

❋❋❋

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبہ نستعین

کفر ونفاق پر اسلام کی فتح و کامیابی، اسلام دشمن عناصر کی شکست اور شرک کا خاتمہ کرکے توحید کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں اہل بیت علیہم السلام کے کردار اور امت کے درمیان ان کے مقام ومنزلت کے بارے میں مختصر اشارہ فرمانے کے بعد اب ۔ خطبے کے اس حصے میں ۔ اسلام سے قبل مسلمانوں کی حیثیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں:

زمانہ جاھلیت میں جزیرۃ العرب میں انحطاط وپستی کے چند نمونے :

۱۔ معنوی کمزوری۔

" وکنتم علی شفا حفرۃ من النار (۱)"

(اور تم جہنم کے دھانے پر کھڑے تھے)

"شفا" کسی چیز کے دہانے کو کہتے ہیں اور "حفرہ" گڑھے کو کہتے ہیں. تم جہنم کے دہانے پر کھڑے تھے. اس جملے کا مقصد یہ ہے کہ جاہلیت کے دور میں تمہاری زندگی بت پرستی میں گزر رہی تھی، اگر پیغمبر خدا (ص) تشریف نہ لاتے اور تمہیں اس وقت کی برائیوں اور تباہ کاریوں سے نجات نہ دیتے اور

۱۔ حضرت ؑ نے یہ جملہ آل عمران کی آیت / ۱۰۳ سے اخذ کیا ہے ۔

تمہیں مسلمان نہ بناتے تو تم جہنم کی آگ میں گر پڑنے کے لئے تیار تھے۔

یہاں پر بعثت سے پہلے کے معاشرتی حالات کو آپ اختصار کے ساتھ ان کے گوش گزار کرتی ہیں تاکہ وہ یہ سمجھ جائیں کہ وہ کیا تھے اور ابھی کیا بن چکے ہیں اور یہ بنیادی اور عمیق تبدیلی کس ہستی کی مرہون منت ہے؟ اور وہ یہ سوچیں کہ آج پیغمبر (ص) کے اہل بیتؑ اور آپ (ص) کے باقی ماندہ آثار کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جا رہا ہے؟ اور خود اصحاب کس قسم کی سیاست کا شکار ہو چکے ہیں؟

۲۔ سیاسی اور معاشرتی کمزوریاں،

"مذقۃ الشارب"

(تم تو پیاسے لوگوں کی پیاس بجھانے کا ذریعے بنے ہوئے تھے)

حضرت زہراء (ع) یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ: تم جو ایک ضعیف اور کمزور قوم تھے کہ جسے ہر طرف سے ہر کوئی اپنے ہر مقصد کے لئے استعمال کرتا تھا، بالکل اس وقت تیسری دنیا کی قوموں کی طرح، کہ یہاں کے اکثر لوگ غیر تعلیم یافتہ اور غریب ہوتے ہیں اور استعمار گر جب بھی چاہیں ان کے پاس آجاتے ہیں. امریکہ اور برطانیہ، تیل کی خاطر حملہ آور ہوتے ہیں، کوئی گیس کو دیکھ کر، کوئی یہاں کے سونے کے ذخائر سے استفادہ کرنے کی غرض سے، تو کوئی اپنی مصرفی پیداوار کی کھپت اور ناکارہ اسلحوں کی فروخت اور اس کے لئے مارکیٹ کی تلاش میں، تیسری دنیا کا رخ کرتا ہے اور ان کو اپنے۔ وحشیانہ۔ حملوں کا نشانہ بناتا ہے. کیونکہ ہمیشہ سے کمزور قومیں، طاقتور قوموں کے حملوں کا نشانہ بنتی رہی ہیں اور طاقتور قوموں نے ہمیشہ ان سے غلط فائدہ اٹھایا ہے. حضرت زہراء (ع) ایسے ہی لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ: تم اتنے کمزور تھے کہ جو کوئی، جو بھی چاہتا تھا تمہیں اپنے ہجوم اور حملے کا نشانہ بنا لیتا تھا۔

"مذق یا مذقہ" اس دودھ کو کہا جاتا ہے جس میں پانی ملا دیا گیا ہو۔ "مذقۃ الشارب" کا معنی یہ ہے کہ وہ پانی ملا ہوا دودھ، جس سے ہر پیاسا شخص اپنی پیاس بجھاتا ہے اور یہاں یہ مراد ہے کہ عربوں کی حالت یہ تھی کہ جو بھی تمہیں استعمال کرنا چاہتا تھا بآسانی تمہیں استعمال کر لیتا تھا. ان کی مثال اس مال کی طرح

تھی کہ جس کا کوئی مالک نہ ہو اور ہر کوئی اپنی مرضی سے اس سے فائدہ اٹھائے۔

"ونہزۃ الطامع"

(لالچی افراد کی فرصت اور موقع کے آلہ کار بنے رہے)

"نہزۃ" نون پر پیش کے ساتھ فرصت اور موقع کے معنی میں آتا ہے. تم لالچی افراد کی طمع اور ان کے لالچ کو پورا کرنے کے لئے بہترین جگہ تھے۔ یعنی ہر طاقتور۔ شخص یا قبیلہ۔ جس کو لالچ ہوتا تھا وہ تمہارے پاس آتا اور تمہارے منابع اور ذخائر سے استفادہ کرتا تھا اور اپنی لالچ تک رسائی کے لئے تمہیں آلہ کار بناتا تھا۔

"وقبسۃ العجلان"

(اور تم جلد باز اشخاص۔ کے آگ کے شعلے لینے۔ کا مقام تھے)

زمانہ قدیم میں جلانے اور پکانے کے وسائل کم تھے، کھانا پکانے اور اپنے آپ کو گرم کرنے کے لئے آگ جلاتے تھے اس مقصد کے لئے عموماً لکڑی استعمال کرتے تھے. اگر کوئی آگ جلانا چاہتا تھا تو بڑی مشکل سے لکڑیاں جمع کرتا تب جا کر آگ جلاتا تھا. اگر کسی کو آگ کی ضرورت ہوتی لیکن لکڑیاں جمع کرنے کی فرصت نہ ہوتی اور وہ جلدی میں ہوتا تو وہ جا کر کسی دوسرے کی جلائی ہوئی آگ سے کوئی جلتی ہوئی لکڑی اٹھا کر لے جاتا تھا اور اس طرح اس شخص کی آگ بجھ جاتی تھی اور ختم ہو جاتی تھی اسی طرح اگر کئی افراد جلدی میں وہاں سے آگ کے جلتے ہوئے شعلے لے جاتے تو وہ آگ مطلوبہ ایندھن نہ ہونے کی وجہ سے مکمل طور پر بجھ جاتی تھی۔ "قبسۃ العجلان" اس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں سے جلد باز اور شتابزدہ انسان جلدی میں آگ کے شعلے اٹھا اٹھا کر لے جائیں اور ان کے پاس اتنی فرصت نہ ہو کہ خود جا کر لکڑی جمع کریں اور اپنی لکڑیاں لا کر اس کے ذریعے آگ لگا کر گرمی کا ساماں فراہم کریں اور اچانک آکر وہاں سے کوئی جلتی ہوئی لکڑی اٹھا کر چلے جائیں۔

دراصل حضرت زہراء (ع) تشبیہ سے کام لے رہی ہیں اور یہ بیان کرنا چاہتی ہیں کہ: تم ہر طرف سے غارت اور ہجوم کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے، مختلف مقامات سے لوگ آتے تھے اور تمہارے قدرتی ذخائر اور

مال وثروت کو غارت کر کے چلے جاتے تھے لیکن تم اس قدر ضعیف، ناتوان اور کمزور تھے کہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے تھے یہ طاقتور افراد اور قبائل تمہیں اپنے مقاصد کے لئے لقمہ تر کی طرح نگل لیتے تھے. ہاں! کمزور اور قوت ارادی سے عاری افراد کا ہمیشہ سے یہی حشر ہوتا ہے۔

"وموطیء الاقدام"

(اور تم قدموں تلے روندے جاتے تھے)

یعنی جہاں سے بھی کوئی آدمی آجاتا تمہارے سروں پر قدم رکھ کے گزر جاتا تھا، علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں کہ: یہ ایک مشہور ضرب المثل ہے جو لوگوں کی ذلت اور شکست کو بیان کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔

۔ حضرت زہراء(ع) یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ ۔جب اسلام کے ذریعے تمہیں عزت وقدرت حاصل نہیں ہوئی تھی اس وقت تم اس قدر کمزور تھے اور ذلت کی زندگی گزار رہے تھے کہ دوسروں کے پاؤں تلے تم روندے جاتے تھے ۔

۳۔ معاشی کمزوری:

"تشربون الطرق"

(تم گڑھوں میں جمع شدہ گندا پانی پیتے تھے)

آپ یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ دینی اور مذہبی لحاظ سے تم اس قدر پستی کا شکار تھے کہ جہنم کے دھانے پر کھڑے تھے. معاشرتی لحاظ سے بھی تم کمزور اور بد بخت تھے کہ اسلام نے تمہیں عزت اور طاقت سے نوازا ۔

"تشربون الطرق" تم گڑھوں کے گندے پانی پیتے تھے. "طرق" ایسے گڑھوں کو کہا جاتا ہے جو راستے کے بیچ میں ہوں اور مختلف قسم کے حیوانات اس میں پیشاب بھی کرتے ہوں۔

۔حضرت فاطمہ (ع) فرماتی ہیں کہ ۔کیا تم وہی افراد نہیں کہ جو اس قسم کے گڑھوں کے گندے پانی

پیتے تھے۔ اور پینے کے لئے پاک اور صاف پانی کے چند گھونٹ فراہم کرنے کی تم سکت نہیں رکھتے تھے۔

" وتقتاتون القدٓ۔ الورق۔"

(تمہارا کھانا جانوروں کا وہ چمڑا ہوتا تھا جسے صاف نہ کیا گیا ہوتا۔ یا درختوں کے پتے تھے۔)

"تقتاتون" کی اصل "قوت" ہے اور یہ باب افتعال سے مضارع کا جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے۔ باب افتعال میں "اقتوت" کی واو ایک صرفی قاعدے۔ متحرک حرف علت سے قبل زبر ہو تو وہ حرف علت الف میں بدل جاتا ہے۔ کے مطابق، الف میں بدل گئی اور "اقتات" بن گیا۔ "قدٓ" اس چمڑے کو کہا جاتا ہے جس کو صاف نہ کیا گیا ہو۔

اس فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی غذا کو اس چمڑے سے تیار کرتے تھے جس کو صاف نہیں کیا گیا تھا، کیونکہ ایسے چمڑوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ چربی ہوتی تھی، وہ بے چارے لوگ جو خالی ہاتھ۔ غریب۔ ہوتے تھے اسی چمڑے کو ابال کر ایک قسم کا سالن اپنے اور اپنے بچوں کے لئے تیار کرتے تھے۔ ان کی معاشی بد بختی اور پسماندگی کی حالت زار یہ تھی۔

بعض دوسرے نسخوں میں قدٓ کے بجائے "الورق" ذکر ہوا ہے۔ ورق یعنی درختوں کے پتے۔ پس اس جملے کا مقصد یہ ہو گا کہ تمہارا کھانا درختوں کے پتے تھے اور تم اسی کے ذریعے اپنی بھوک مٹاتے تھے۔

بہر صورت آپؑ اپنے مخاطبین کو یہ یاد دلانا چاہتی ہیں کہ، اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ کس قدر بد بخت اور بے چارے تھے اور تاسف انگیز زندگی گزار رہے تھے اور اب۔ مسلمان ہونے کے بعد۔ ان کی حالت کیا ہے۔ اور کتنی نعمتوں سے نوازے گئے ہیں۔

۴۔ نفسیاتی کمزوری۔

" اذلۃ خاسئین"

(تم۔ معاشرے میں۔ ذلیل و رسوا اور دھتکارے ہوئے لوگ تھے)

"اذلہ" ذلیل و رسوا اور کمزور لوگ کے معنی میں ہے۔ "خاسئین" معاشرے کے دھتکارے ہوئے

افراد کو کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ تم معاشرہ اور معاشرتی وتہذیبی آداب ورسوم سے کوسوں دور تھے اور نفسیاتی اعتبار سے بھی پست، کمزور اور انسانی شخصیت سے عاری افراد تھے۔

" تخافون ان یتخطفکم الناس من حولکم "

(۔ تم اس قدر کمزور تھے کہ۔ تم ہر وقت ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں ہر طرف سے تمہیں اچک نہ لیں)

" تخطف " تیز رفتاری سے کسی چیز کو چھیننا۔ واضح سی بات ہے کہ طاقتور طبقے، کمزور اور ناتواں انسانوں کو نوکر اور غلام بنا کر ان سے بیگار لیتے ہیں اور اپنے مقاصد کے لئے ان سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

حضرت زہراء (ع) کا یہ ارشاد اس آیہ شریفہ کی طرف اشارہ ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے کہ: " واذکروا اذ انتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون ان یتخطفکم الناس فآوٰکم وایّدکم بنصرہ ورزقکم من الطیبات لعلکم تشکرون [۱] " (اس وقت کو یاد کرو کہ جب تم تعداد میں کم اور زمین پر کمزور اور ناتواں تھے اور اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں تمہیں اچک نہ لیں، پس خدا نے تمہیں پناہ دی اور تمہاری مدد کی اور پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا شاید کہ تم خدا کا شکر کرو) یہاں پر آپؑ بھی اس آیہ شریفہ سے استفادہ کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ: " تخافون ان یتخطفکم الناس من حولکم " (یعنی تم اس قدر ناتواں اور بے یار و مددگار تھے اور اس ڈر اور خوف میں تمہاری زندگی گزرتی تھی کہ کہیں کوئی دوسرا قبیلہ تم پر حملہ نہ کردے اور۔ لمحوں کے اندر۔ تمہیں اپنا غلام نہ بنالے)۔

پیغمبر (ص) کے ذریعے انسانیت کی نجات،

" فانقذکم اللّٰہ تبارک وتعالیٰ بابی محمد [۲] "

(پھر خداوند تبارک وتعالیٰ نے میرے والد گرامی محمد (ص) کے ذریعے تمہیں نجات دی)

۱۔ سورۂ انفال / ۲۶۔

۲۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳ کے ذیل میں بھی یہی مضمون ذکر ہوا ہے "وکنتم علیٰ شفا حفرۃ من النار فانقذکم منہا"۔

تم علاوہ اس کے کہ اخروی زندگی اور مستقبل کے لحاظ سے جہنم کے دہانے پر کھڑے تھے دنیوی اعتبار سے بھی بہت کمزور اور ضعیف تھے لیکن خداوند متعال نے تمہیں میرے والد بزرگوار کے ذریعے نجات دی، شاید آپؑ یہ فرمانا چاہتی تھیں کہ تم تو کچھ بھی نہیں تھے لیکن خدا نے میرے والد گرامی اور میرے شوہر کے طفیل سے تمہیں نجات دی اور اب تم نمک حرامی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔

" بعد اللتیا والتی وبعد ان منی ببھم الرجال "

(۔ تمہیں یہ نجات۔ اس کے بعد ملی کہ جب پیغمبر خدا (ص) نے بہت ساری مشکلات اور ناگوار حوادث برداشت کیے اور۔ مشرکین۔ کے دلیر مگر ضدی لوگوں سے پنجہ آزمائی کی)

یعنی رسول خدا (ص) نے تمہیں ان سب معاشرتی بگاڑ اور تباہکاریوں سے نجات دی اور اس راہ میں ناگوار حوادث کا سامنا کیا اور وہ ساری زحمتیں اور رنج وغم برداشت کیے۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ ان کا مشرکین کے ایک ایسے ٹولے سے واسطہ پڑا کہ جن میں شجاعت ودلیری کے میدان میں کسی چیز کی کمی نہ تھی لیکن وہ استدلال اور منطق کی سوچ بوجھ نہیں رکھتے تھے۔

" اللتیا والتی " عربی کی ایک ضرب المثل ہے، اس کا لفظی معنی تو یہ ہے کہ: اللتیا یعنی چھوٹے قد والی عورت، التی کا معنی درمیانی یا بڑی قد والی عورت۔ اس ضرب المثل کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ:۔ جدُی نامی کا ایک شخص شادی شدہ نہ تھا، اس نے جب شادی کا ارادہ کیا تو ایک کوتاہ قد عورت سے شادی کی اور اس عورت نے اسے کافی ستایا، جدی نے تنگ آکر اسے طلاق دیدی، پھر اس نے ایک دراز قد عورت سے شادی کی یہ پہلی عورت سے بھی بدتر نکلی اور اس کی زندگی کو تاریک کر کے رکھ دیا اس شخص نے مجبور ہوکر اسے بھی طلاق دے دی، اس کے بعد اس شخص نے کچھ عرصہ اکیلے ہی زندگی گزاری اس دوران کسی نے اس سے پھر شادی کرنے کے بارے میں جب پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ: " بعد اللتیا والتی " یعنی اس چھوٹے قد اور لمبے قد والی عورتوں کے بعد اب میں شادی سے پشیمان ہوچکا ہوں، اس کے بعد سے یہ فقرہ عربی میں ایک اصطلاح اور ضرب المثل بن گیا اور گزرے ہوئے ناخوشگوار واقعات اور حوادث کے بارے میں اشارہ کرتے وقت یہ فقرہ بولا جاتا ہے۔

یہاں پر حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: " بعد اللتیا والتی " یعنی ان تمام سختیوں اور ناخوشگوار واقعات اور حادثات کو تحمل کرنے کے بعد، " وبعد ان مُنِیَ بِبُہَم الرجال " مُنی یعنی بمتلا ہوا، بُہم، بہتہ کی جمع اور دلیر مگر منطق واستدلال سے عاری انسانوں کو کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ: شاہی دور میں بھی شاہ ایران نے بعض اوقات اس قسم کے افراد کو بھرتی کرر کھا تھا تاکہ اس کے ذریعے وہ اپنی بعض خواہشات کی تکمیل کرسکے۔ رسول خدا (ص) کا بھی ایسے ہی افراد سے واسطہ پڑا تھا جو دلیر تو ضرور تھے مگر استدلال اور منطق کی زبان سے کوسوں دور تھے لیکن آپ (ص) نے کافی زحمتیں اٹھانے کے بعد ان کو راستے سے ہٹایا اور اسلام کی پیشرفت کے لئے راہ ہموار فرمائی۔

" وذؤبان العــرب "

(اور اس کے بعد کہ پیغمبر (ص) عرب کے درندوں سے الجھے)

پیغمبر اکرم (ص) کا واسطہ عرب کے ایسے درندہ خو اور نڈر انسانوں سے تھا کہ جو بھیڑیوں کی طرح چیرنے پھاڑنے میں مہارت رکھتے تھے بھیڑئے کا کام درندگی ہے کہ جو ایسے ہی بھیڑ بکریوں پر حملہ کردیتا ہے۔ انسان کی طرح تو نہیں ہے کہ ضرورت کے مطابق اس سے فائدہ اٹھائے۔ اس کے سامنے جو بھی آتا ہے اسے پھـاڑ دیتا تھا، یہ لوگ بھی بھیڑیے کی طرح درندہ صفت تھے اور منطق واستدلال سے کوسوں دور تھے ان کا کام صرف قتل اور غارتگری کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔

" ومردة اهــل الكتاب "

(۔ اس کے بعد۔ اہل کتاب کے سرکش عناصر سے آپ (ص) کا واسطہ پڑا)

۔ اس وقت۔ اہل کتاب بالعموم اور خاص کر عیسائی حضرات جنگ وجدال سے دور رہتے تھے لیکن رسول خدا (ص) کا واسطہ اہل کتاب کے چند ایسے سرکش عناصر سے پڑا جو اپنی تورات اور انجیل کے فرامین سے بھی سرکشی کرتے تھے جیسا کہ مدینے کے یہودی کہ جو پیغمبر (ص) کے خلاف بہت ساری جنگوں کا باعث بنے اور یہ لوگ کفار ومشرکین کے یار ومددگار اور ان کے ساتھ ہم پیمان ہوگئے تھے۔

اسلام کی ترویج میں حضرت علی(ع) کا کردار:

"کلما اوقدوا ناراً للحرب اطفاء ھا اللہ"

(جب بھی کفار، جنگ کی آتش افروزی کرتے تو خدا اس کو بجھا دیتا تھا)

پیغمبر اکرم (ص) ہرگز جنگ نہیں چاہتے تھے، کفار اور اسلام دشمنوں کے خلاف آپ (ص) کی اکثر جنگیں، دفاعی حیثیت رکھتی تھیں اور یہ جنگیں دشمنوں کی سازش کے توڑ میں لڑی گئیں. اس جملے سے یہ مفہوم بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جنگ کی آگ کو ہمیشہ اسلام دشمن طاقتیں بھڑکاتی تھیں لیکن خدا اسے مؤمن، جاں نثار اور صابر انسانوں کے ذریعے بجھا دیتا تھا اور ان کے شر سے مؤمنین کو محفوظ رکھتا تھا۔

"او نجم قرن الشیطان"

(یا جب بھی شیطان کے سینگ۔ تابعدار لوگ۔ نمودار ہوتے تھے)

"نجم" یعنی ظاہر ہوا، نمودار ہوا. جب شیطان کے سینگ ظاہر ہوتے تھے کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی اسلام کے دشمنوں کی طرف سے کوئی سازش تیار کی جاتی تھی، شیطان کے سینگ، اس کی طاقت اور نفوذ کے لئے کنایہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں. شیطان کی قوت اور نفوذ کے مظہر ایسے لوگ ہیں جو شیطان۔ کے جھوٹے وعدوں۔ کے فریفتہ ہو کر اس کی پیروی کرتے ہیں۔

"او فغرت فاغرۃ من المشرکین"

(یا مشرکین میں سے کوئی منہ کھولنے والا۔ درندہ صفت۔ منہ کھول لیتا تھا)

"فغر" یعنی منہ کھولا، یہاں پر مشرکین کو درندوں سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ حملے کے وقت درندے اپنا منہ کھولتے ہیں. یہاں پر اس فقرہ کا مقصد یہ ہے کہ مشرکین کے۔ درندہ صفت۔ گروہ، مسلمانوں کے خلاف جب بھی کوئی بلوہ کرنا چاہتے تھے اور مسلمانوں پر درندوں کی طرح حملہ آور ہوتے تھے تو:

"قذف اخاہ فی لھواتھا"

(پیغمبر اکرم (ص) اپنے بھائی۔ علی (ع)۔ کو ان کے حلقوم میں دھکیل دیتے تھے)

۔اس فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو پیش آنے والے خطرات میں علی (ع) ہی کود پڑتے تھے اور اسلام کو اس خطرے سے نجات دیتے تھے. جب عمرو بن عبدود ۔ میدان میں ۔ میں آتا ہے اور رجز خوانی کرتا ہے تو کوئی جرات نہیں کرتا کہ اس سے مقابلہ کرے. پہلا دوسرا اور بہت سارے لوگ جو بعد میں دعویدار بنے سب پیچھے ہٹ گئے ، ایسے مواقع میں پر پیغمبر (ص) حضرت علی (ع) ہی کو دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے کہتے تھے تاکہ علی (ع) آگے بڑھ کر مشرکین کا خاتمہ کردیں۔

حضرت زہراء (ع) یہاں یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ حضرت علی (ع) کی فداکاری، جاں نثاری اور کوششوں کا نتیجہ ہی تھا کہ اسلام کامیاب اور فتح مند ہوا. اسی لئے آپؑ فرماتی ہیں کہ اگر شیطان کا کوئی ٹولہ میدان میں آجاتا یا مشرکین، اژدھے کی مانند منہ کھولے مسلمانوں کی طرف بڑھتے یا کوئی اور سازش ہوتی تو " قذف اخاہ فی لہواتھا " ان کا مقابلہ کرنے کے لئے علی (ع) ہی کو پیغمبر (ص) آگے بڑھاتے تھے. ۔اگر علی (ع) نہ ہوتے تو۔ کون تھا جو ابوسفیان کا ناک دم کرتا؟ عمرو بن عبدود کی رجز خوانی کا جواب دیتا ؟ اور ہجرت کی رات دشمنوں کی سازش کو کون ناکام بناتا؟ ان تمام موارد میں صرف علی (ع) ہی تھے کہ جو رضا کارانہ طور پر خطروں کو مول لیتے ۔ اور جان کی بازی لگا کر اسلام کی پاسبانی کرتے تھے. سازشوں اور جنگوں کے ذریعے اسلام کی نابودی کے خواب دیکھنے والوں کو نابود کردیتے تھے۔

" لہوات " لہات کی جمع ہے جو حلقوم کے آخری حصے کو کہا جاتا ہے ۔ سازش اور جنگ بھی انسان کو لقمہ ترکی طرح نگل کر ہضم کردیتی ہے. اسی لئے اسلام کے خلاف ہونے والی سازشوں اور جنگوں کو لہوات سے تعبیر کیا گیا ہے اور امیر المؤمنین (ع) نے اس حلقوم کو اپنے ہاتھوں سے اس طرح بند کیا کہ وہ دم گھٹ کر مر گئے۔

مختلف جنگی محاذوں میں حضرت علی علیہ السلام کی دلیری اور شجاعت کے نمونے :

" فلا ینکفیء حتی یطاء صماخھا(۱) باخمصہ "

۱۔ بعض نسخوں میں " صماخھا " کے بجائے " جناحھا " ذکر ہوا ہے تو اس صورت میں جملے کا معنی یہ ہوگا کہ (جب تک ان کے پروں کو ==

(ان کے کانوں۔ سروں۔ کو رگڑے بغیر علی (ع) واپس نہیں پلٹتے تھے)

اس وقت میدان جنگ میں جب کوئی شخص اپنے مد مقابل کو پچھاڑ دیتا تھا تو فاتح اپنے پاؤں کو مغلوب کے سر پر رکھ دیتا تھا اور اسے روند دیتا تھا۔ پاؤں سے کانوں کو روندنا، کنایہ ہے اس بات کی طرف کہ جب تک میدان جنگ فتح نہ کرتے علی (ع) میدان جنگ سے واپس تشریف نہ لاتے تھے اور ایسا نہ تھا کہ آپ جنگ سے فرار کریں یا ذمہ داری کو ادھورا چھوڑ کر بھاگ نکلیں (۱)۔

"صماخ" یعنی کان کی نالی، "اخمص" ہتھیلی یا پاؤں کے نچلے حصے کو کہتے ہیں۔ اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ امیر المؤمنین (ع) اسلام دشمنوں کے سروں کو روند دیتے تھے۔

"ویخمد لهبها بسیفه"

(ان کے شعلوں کو اپنی تلوار سے بجھا دیتے تھے)

حضرت علی (ع) کی شجاعت اور استقامت کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک دشمن پر مکمل فتح نہ پاتے اور اسے شکست نہ دیتے شجاعت سے لڑتے رہتے تھے اور اس راہ میں آپ کے دل میں کسی قسم کا ضعف اور تردد نہیں پایا جاتا تھا اور نہ ہی اپنے کام کو ادھورا چھوڑ کر واپس آتے تھے۔

امیر المؤمنین علیه السلام کی چند خصوصیات:

(۱) "مكدوداً في ذات الله، مجتهداً في امر الله"

(اس حال میں کہ۔ حضرت علی (ع)۔ خدا کی راہ میں شدید ترین سختی برداشت کر رہے تھے اور خدا کے احکام پر سختی سے کاربند تھے)

"مکدود" لفظ "کد" کا اسم مفعول ہے اور اس سے مراد وہ شخص ہے جس پر شدید سختی اور دباؤ ہو۔

== اپنے پاؤں تلے نہ روندتے آپ واپس نہ آتے تھے) پر قدرت، طاقت اور شان و شوکت کے لئے کنایہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) تاریخ بتاتی ہے کہ آپ کو ہمیشہ آگے سے زخم لگے ہیں اور پشت سے زخم نہیں لگے کیونکہ آپ کرار غیر فرار تھے اور کبھی دشمن کو پیٹھ نہیں دکھاتے تھے۔

ذات اور امر خدا سے، احکام خداوندی اور ہر وہ چیز مراد ہے جس کا تعلق خدا سے ہو. ان دو جملوں کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علی (ع) خدا کے دین اور احکام نیز خدا سے نسبت رکھنے والی چیزوں کے بارے میں سخت کوش اور حساس تھے اس سلسلے میں کسی قسم کی سستی اور لا ابالی گری اور سودا بازی سے نہ صرف نفرت کرتے تھے بلکہ راہ خدا اور خدا کی خاطر آپ شدید ترین سختیوں کے دباؤ کا شکار تھے لیکن آپ شجاعت سے دین خدا کی حمایت اور نگہبانی فرماتے تھے (۱)۔

(۲) " قریبامن رسول اللّٰہ، سیداً فی اولیاء اللّٰہ "

(آپ (ع) رسول خدا (ص) کے مقرب اور خدا کے ولیوں کے سردار تھے)

ظاہری رشتہ داری اور روحانی و معنوی دونوں کے لحاظ سے آپ پیغمبر خدا (ص) کے مقرب اور نزدیک ترین فرد تھے. خدا کے برگزیدہ بندوں میں بھی آپ کا مقام واضح تھا اور آپ ان کے سید و سردار تھے. خلاصہ یہ ہے کہ آپ ہر لحاظ سے دوسروں سے برتر مقام رکھتے تھے۔

حقیقت میں حضرت فاطمہ (ع) اپنی ان باتوں کے ذریعے۔ اور وہ بھی ایسے مخصوص حالات میں۔ حاکمیت کے غصب کرنے پر اعتراض کرنا چاہتی تھیں جو کہ حضرت فاطمہ کی شجاعت اور شہامت پر ایک مستحکم دلیل ہے کہ آپ نے انتہائی بے باکی اور شجاعت نیز ٹھوس دلائل کے ذریعے حکمرانوں کے مقابلے میں ولایت و امامت حقہ کا دفاع فرمایا۔

(۳) " مشمّراً ناصحاً، مجداً کادحاً "

(۔ حضرت علی ۔ خدمت خلق کے لئے تیار اور لوگوں کے خیر خواہ تھے،

جدیت اور محنت کے ساتھ فعالیت میں مشغول تھے)

یعنی امیر المؤمنین (ع) اپنے ذاتی مفاد کی خاطر سوچنے کے بجائے معاشرے کے خیر خواہ، اور اس کے

۱۔ مکدود، مغلوب کو بھی کہا جاتا ہے. اس معنی کی رو سے آپ کی مراد یہ ہو سکتی ہے کہ خلافت کے مسئلے میں تم نے غلبہ پایا اور علی مغلوب ہو گئے لیکن اس کے باوجود بھی علی نے دین خدا کے باقی عقائد اور احکام کو تمہاری انحرافی طوفانی موجوں سے محفوظ رکھنا چاہا اور ان کٹھن مشکلات کے دباؤ کے باوجود تحفظ دین کے لئے جدوجہد کی.

کام آنے والے انسان تھے۔ آپؑ گفتار کے غازی نہیں بلکہ کردار کے غازی تھے اور ہمیشہ نیک اعمال کی بجا آوری میں مشغول رہتے تھے۔

(۴) "ولا تاخذہ لومۃ لائم"

(خدا کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے وہ متاثر نہیں ہوتے تھے)

یعنی لوگوں کی سرزنش اور پروپیگنڈہ کے خوف سے حق کے دفاع سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ تھے اور بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور حوادث سے متاثر ہونے کے بجائے صرف خدا کی خوشنودی کو اپنے مدنظر رکھتے تھے۔ ان کا مطمع نظر اور ہدف صرف خدا کی رضا و خوشنودی تھی اور بس۔

کل کے گوشہ نشین، آج کے مفاد پرست:

"وانتم فی رفاھیۃ من العیش"

(۔علی (ع) قربانی دے رہے تھے۔ اور آپ زندگی کی لذتوں اور عیش و عشرت میں مصروف تھے)

اس وقت جب امیر المؤمنین (ع) اسلام کی خاطر زحمتیں برداشت کر رہے تھے، دوست و دشمن اپنی زبانوں سے ان پر زخم لگاتے تھے ان کے دل پر چھریاں چل رہی تھیں اور اسلام کی راہ میں تکلیفیں اٹھا رہے تھے، لیکن اس کے باوجود کبھی بھی پیچھے ہٹنے کا نام تک نہ لیا اور پیغمبر (ص) کو تنہا اور اکیلا نہ چھوڑا۔ اسلام کی دعوت، حضرت علیؑ کی کوششوں کے نتیجے میں کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اس وقت تمہاری حالت یہ تھی کہ حوادث و مشکلات سے اپنے کو دور رکھتے تھے۔ سربکف مجاہدین کا۔ مذاق اڑاتے تھے اور اپنی خورد و نوش کی فکر میں سرگردان رہتے تھے۔ رحلت پیغمبر (ص) کے فوراً بعد۔ تم نے مفاد پرستانہ چال چلی اور علی (ع) کو خانہ نشین کر کے، خلیفہ معین کرنے میں مشغول ہو گئے!!

سوال:۔ پہلے آپؑ نے فرمایا کہ تم بدبخت، بے چارہ، کمزور اور دوسرے لوگوں کی تاخت و تاز کا مقام بنے ہوئے تھے اور یہاں پر آپؑ فرماتی ہیں کہ تم عیش و عشرت اور آرام و آسائش کی زندگی گزار رہے تھے تو ممکن کوئی رہے کہ کوئی سوال کرے کہ حضرتؑ کی ان دو باتوں میں تضاد ہے ان دونوں کو

کس طرح جمع کیا جاسکتا ہے؟

جواب:۔ یہاں کئی احتمال دیئے جاسکتے ہیں:

۱۔ مشرکین سب کے سب تو فقیر غریب اور مفلوک الحال نہیں تھے بلکہ ابو جہل، ابوسفیان اور بہت سارے دوسرے مشرکین اشرافیہ زندگی گزار رہے تھے البتہ ۔ عام ۔ لوگوں کی اکثریت معاشی بدحالی اور فقر وفاقہ کا شکار تھی۔

۲۔ شاید آپؑ کا مقصد یہ ہو کہ اگرچہ تم ایک ننگین اور ذلت آور زندگی گزار رہے تھے لیکن اسی وقت تم عیاشی اور رفاہ کے بھی دلدادہ تھے اور اسلام کی فتح و کامیابی کی خاطر راحت سکون چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔

۳۔ زمانہ جاہلیت میں تم فقیر و غریب تھے اور ذلت آمیز زندگی گزار رہے تھے جب اسلام آیا اور تمہیں اس پست اور ننگین زندگی سے نجات دی تو اب تم اسلام کے محافظ بننے اور سختیوں اور مشکلات کے وقت اسلام اور پیغمبر اسلام (ص) کا دفاع کرنے کے بجائے اپنے ذاتی مفادات کی فکر میں ہو اور۔ مسلمانوں کے ارد گرد۔ گزرنے والے واقعات اور حادثات کے بارے میں بے توجہی اور بے پروائی کی پالیسی پر عمل پیرا ہو۔

۔ خلاصہ یہ کہ آپ لوگ مسلمان ہونے سے قبل پست، بے چارے اور کمزور تھے. مسلمان ہونے کے بعد تمہاری زندگی کا گراف بہتر ہوا ہے لیکن تم نے اسلام کی خدمت اور اس راہ میں جان نثاری پر عیش و عشرت کو ترجیح دی ہے اور اس کے دلدادہ ہوگئے ہو۔

اس تیسرے احتمال کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت فاطمہؑ نے مسلمانوں کو زمانہ جاہلیت کی ننگین اور ذلت آمیز زندگی کی یاد دہانی کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ: " فانقذکم اللّٰہ تبارک وتعالیٰ بابی محمد " یعنی اس ذلیل و رسوا زندگی سے خدا نے تمہیں میرے والد گرامی حضرت محمد (ص) کے ذریعے نجات بخشی. اس کے بعد آپؑ فرماتی ہیں کہ: " وانتم فی رفاهیة من العیش " یعنی تم زندگی کی لذتوں اور آرام و آسائش میں ڈوبے ہوئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ تم اسلام کی خاطر کسی قسم کی

قربانی دینے اور رنج و مشقت تحمل کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس طرح آپؑ یہ ارشاد فرماتی ہیں کہ طاقتور ہونے سے قبل تم بد بختی اور بے چارگی کے عالم میں پڑے ہوئے تھے لیکن جب تمہیں طاقت اور قوت عطا ہوئی تو اسلام اور اس کے مقاصد کی خاطر قربانی دینے کے بجائے آرام و سکون اور تعیش کو تم نے اپنا کعبہ مقصود بنالیا ہے۔

مفاد پرستوں کی خصوصیات:

(۱) " وادعون، فاکھون، آمنون "

(۔جنگ و جہاد کی سختیوں سے خود کو دور رکھ کر تم۔

خاموش، مطمئن اور خوشحال و عیاش۔ ہونے کے علاوہ۔ سکون اور امن کی زندگی گزار رہے تھے)

ایک مؤمن اور فرض شناس انسان، اپنے ارد گرد رونما ہونے والے واقعات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا، بلکہ اس پر لازم ہے کہ ان امور کے بارے میں اپنی ذمہ دارای کا احساس کرے اور اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھے اگر وہ کوئی مثبت کردار ادا نہیں کرسکتا تو کم از کم ان امور کے بارے میں بے توجہی سے کام نہ لے، جہاں تک اس کے لئے ممکن ہو فعال رہے اور مسلمانوں کے رنج و غم میں خود کو شریک سمجھے۔ ایسا ہر گز نہ ہو کہ ہم دوسرے مسلمانوں کے دکھ، درد سے لاتعلق رہیں اور اپنی اور اپنے بچوں کے پیٹ بھرنے کی فکر میں شب و روز گزار دیں اور۔ فارسی کی۔ اس ضرب المثل کا مصداق نہ بنیں کہ: "سری کہ درد نمی کند چرا دستمال ببندیم" (یعنی جس سر میں درد نہ ہو اس پر رومال کیوں باندھیں)! انسان کی انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے جیسے انسانوں پر ہونے والے ظلم و ستم کے مقابلے میں خاموش نہ رہے اور شاعر۔ سعدی۔ کے بقول کہ:

بنی آدم اعضای یکدیگرند   کہ در آفرینش ز یک گوہرند

(بنی آدم ایک دوسرے کے اعضاء و جوارح ہیں، کیونکہ سب کی خلقت ایک ہی گوہر سے ہوئی ہے)

چو عضوی بدرد آورد روزگار   دیگر عضوہا را نماند قرار

(اگر حوادث زمانہ کسی عضو کو درد میں مبتلا کردیں، تو دوسرے اعضاء تڑپ اٹھتے ہیں) ۔

اس انسانی رابطے سے بالاتر، ہم سب مسلمان ہیں اور قرآن و اہل بیت اطہار علیہم السلام کے پیروکار ۔ لہذا ہماری ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے ۔ کیونکہ روایات میں آیا ہے کہ: " کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ " یعنی ۔ جس طرح چرواہا اپنے ریوڑ کا ذمہ دار ہے ۔ اسی طرح تم بھی ایک دوسرے کے ذمہ دار ہو ۔

حضرت زہراء (ع) ان لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ: " جب علی (ع) راہ خدا و اسلام میں فداکاری کررہے تھے اور قربانیاں دے رہے تھے اور اپنی ہستی کو اخلاص کے ساتھ اسلام پر قربان کررہے تھے تو اس وقت تم اپنے سکون اور آسائش کی فکر میں سرگردان تھے، حق کی حمایت کے بجائے خاموش تماشائی بنے بیٹھے تھے ۔ راہ خدا میں ۔ زحمتیں برداشت کرنے کے بجائے امن وامان کے ساتھ عیاشی میں مشغول تھے لیکن جب ۔ علی (ع) کی کوششوں، قربانیوں اور آپ کی جاں نثاری کے نتیجہ میں اقتدار اور حکومت کا ۔ دسترخوان بچھ چکا تو تم آگے بڑھے اور علی (ع) کو خانہ نشینی پر مجبور کردیا! ۔

(۲) " تتربصون بنا الدوائر "

(تم اس انتظار میں تھے کہ ہمیں ۔ اہل بیت پیغمبر (ص) کو ۔ مصیبتیں اور آفتیں گھیر لیں)

تم میں سے بعض جو بظاہر مسلمان ہوئے تھے اور منافقانہ کردار ادا کررہے تھے اور جو دور سے (مختلف) حادثات کا تماشا دیکھ رہے تھے اس بات کے منتظر تھے کہ ان جنگوں اور مقابلوں میں ہم مصیبتوں اور آفتوں کا شکار ہوجائیں ۔ اور مثال کے طور پر، جنگ میں علی (ع) شکست کھائیں ۔

" دوائر " دائرہ کی جمع ہے. مصیبت اور سختی کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے. مفاد پرست عناصر، ہمیشہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ مؤمن اور فداکار افراد کو شکست ہو کیونکہ یہ لوگ حق کی فتح سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں ۔

(۳) " وتتوکفون الاخبار "

(اور تم ۔ دور سے جنگ و جہاد کی ۔ خبریں سننے کے منتظر رہتے تھے)

توکف یعنی توقع اور انتظار۔ جب کوئی انسان جنگ اور جہاد میں سرگرم عمل ہو تو عافیت طلب اور بے درد لوگ صرف خبر سننے کے منتظر رہتے ہیں۔ حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: تم میں سے بعض جو۔ اسلام سے کوئی۔ دلچسپی نہیں رکھتے تھے میدان جنگ سے باہر صرف اس انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ۔ جنگ کے متعلق۔ خبریں سنیں۔ یہ لوگ جنگ کے میدان میں قدم رکھنے سے اجتناب کرتے تھے۔

(۴) " وتنکصون عند النزال "

(اور بحرانی حالات میں تم پیچھے ہٹ جاتے تھے)

" نزال اس زمانے میں جب ایک دوسرے سے روبرو لڑائی کے لئے تیزی سے گھوڑے سے اترتے تھے تو اس حالت کو نزال کہا جاتا ہے البتہ اصطلاحا بحرانی حالات کو نزال کہا جاتا ہے۔ " تنکصون " کے معنی ہیں رک جانا اور عقب نشینی کرنا۔ آپ' یہ فرماتی ہیں کہ: جب جنگ اپنے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوجاتی تھی تو تم معرکہ کارزار میں داخل ہونے کے بجائے رک جاتے تھے اور پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ عافیت طلب افراد ہمیشہ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ عام حالات میں بڑا با ہو اور شور وغل مچاتے ہیں لیکن بحرانی اور حساس لمحات میں یا تو خاموش رہتے ہیں یا میدان سے بھاگ نکلتے ہیں یا پھر کبھی کبھار دشمن کے ساتھ مل کر اس کے مددگار بن جاتے ہیں۔

(۵) " وتفـرّون من القتال "

(اور تم میدان جنگ سے فرار کرتے تھے)

خلاصہ یہ کہ: پہلے تم اسلام اور اس کی ترویج کے بارے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے لیکن آج جب حالات پر تمہارا کنٹرول ہے، پیغمبر (ص) کے حکم کو ٹھکرا کر اپنے لئے خلیفہ بنا رہے ہو اور علی (ع) کو۔ اپنے خدا داد منصب۔ سے علیحدہ کر رہے ہو۔ ایسے افراد کو اصطلاح میں "Opportunist" یعنی مفاد پرست کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسے افراد جو اپنے اہداف کی تکمیل کے لئے مناسب موقع اور فرصت کی تلاش میں رہتے ہیں اور ہوا کے رخ کو دیکھ کر چلتے ہیں اور اس گروہ کی حمایت کرتے ہیں جو کامیابی حاصل کرلے۔ ایسے افراد بحرانی اور حساس حالات میں اسلام اور حق۔ بلکہ اپنی قوم وملت۔ کا دفاع کرنے سے

گریز کرتے ہیں۔

رحلت پیغمبر (ص) اور اس کے اثرات:

" فلما اختار اللّٰہ لنبیه دار انبیائه وماوی اصفیائه "

(پس جب وہ وقت آیا کہ خداوند عالم نے اپنے حبیب کے لئے اپنے نبیوں اور برگزیدہ بندوں کی منزل اور آرامگاہ کا انتخاب فرمایا۔ یعنی آپ (ص) اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔)

(۱)" ظهر فیکم حسکة النفاق "

(تو تمہارے درمیان منافقت کے کانٹے نمودار ہوگئے)

یعنی پیغمبر خدا (ص) کی رحلت کے بعد باہم متحد ہونے اور ان کی وصیتوں پر عمل کرنے کے بجائے تم منافقت اور دورنگی کا شکار ہوگئے۔

" حسکہ " یعنی کانٹے اور تیغ۔ یہاں پر آپؑ کی کلام میں یہ لفظ استعارہ (۱) کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حق وحقیقت کے متوالوں کے جسموں میں تیغ چبھتی ہے اسی طرح تمہارے اندر منافقت کا کانٹا ظاہر ہوا ہے۔

(۲)" وسمل جلباب الدین "

(تمہارے دین اور تمہاری معنویت کا لباس پرانا اور بوسیدہ ہوچکا ہے)

" سمل " پرانا اور بوسیدہ کپڑا یا لباس۔ " جلباب " عبا یا بڑی چادر اور رداء کی طرح ہے کہ جو انسان کو ڈھانپ سکے یعنی لباس۔ یہاں " جلباب الدین " یعنی دین کا لباس۔ یہ فرما کر آپؑ نے دین کو لباس اس لئے قرار دیا ہے کہ جس طرح لباس انسان کے جسم کو مکمل ڈھانپ لیتا ہے اسی طرح دین بھی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔

حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: پیغمبر اکرم (ص) کی وفات سے قبل معاشرے پر دین کی مکمل

۱۔ استعارہ ایک قسم کی مجاز گوئی ہے مثال کے طور پر شجاعت کی صفت کے پیش نظر کسی دلیر اور نڈر شخص کو شیر کہا جائے۔

حکمرانی تھی اور معاشرے کے تمام امور اور روابط وضوابط دینی اصولوں کی بنیاد پر طے ہوتے تھے، لیکن پیغمبر خدا (ص) کے انتقال کے فوراً بعد۔ تم نے دین کی حاکمیت کے بجائے جاہلی رسومات کو ترجیح دی ہے اور ان کو معاشرے میں رائج کیا ہے اس طرح۔ دین ایک پرانا بوسیدہ لباس بن کر اپنی حیثیت کھو بیٹھا ہے۔

(۳) " ونطق کاظم الغاوین "

(اور وہ گمراہ مگر خاموش لوگ۔ جو کل تک اسلام کی تقدیر سے لاتعلق رہتے تھے اچانک۔ بول اٹھے ہیں)

پیغمبر اسلام (ص) کی رحلت کے بعد ایسے گمراہ عناصر نے فرصت سے استفادہ کیا اور آگے بڑھے سیاست وقت نے ان کو صاحب سخن بنادیا جو کل تک خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے اور فرصت کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے اب یہی لوگ ملت کی قسمت کے مالک بن گئے ہے! جب ابوسفیان کہ جس کی اسلام کے ساتھ دشمنی آشکار تھی، مسلمانوں کی تقدیر کا مالک بن جاتا ہے تو دوسروں کا کیا حال ہوگا؟! حالانکہ ان کے مقابلے میں علی (ع)، سلمان اور ابوذر جیسے افراد جنہوں نے اسلام کی خاطر سب سے زیادہ تکالیف اٹھائی تھیں، معاشرے سے الگ کرکے خانہ نشین ہونے پر مجبور کردیئے جاتے ہیں!! (۱)۔

(۴) " ونبغ خامل الاقلّین "

(پست اور گمنام لوگ۔ بلوں سے نکل آئے۔ اور میدان میں آگئے)

ہر تحریک اور انقلاب کے دوران پست اور بزدل افراد خود کو کسی گوشہ میں چھپا لیتے ہیں اور فرصت کے منتظر رہتے ہیں، حق وعدالت کے خلاف ہمیشہ سے یہی لوگ زیادہ سے زیادہ وار کرتے آئے ہیں۔

۱۔ بات یہاں تک جا پہنچی کہ علیؑ جیسی ملکوتی شخصیت کی اس قدر کردار کشی کی جاتی ہے کہ جب شام میں یہ خبر پہنچی کہ آپؑ مسجد میں شہادت پاگئے تو لوگ تعجب سے پوچھتے ہیں کہ کیا علیؑ بھی نماز پڑھتے تھے؟! ابوذر جیسی شخصیت کو اسلامی ریاست کے خلاف آشوب برپا کرنے کی تہمت میں ربذہ میں شہر بدر کیا جاتا ہے اور وہ وہیں پر اپنے خالق حقیقی سے جاملتے ہیں! حضرت علیؑ کے گھر پر کہ جو نزول وحی کا مرکز تھا حملہ کردیا جاتا ہے! پیغمبرؐ کی اکلوتی بیٹی کی اہانت اور انہیں اذیت دی جاتی ہے البتہ تعجب اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اسلام اور خلافت رسولؐ کے نام پر یہ ساری شرمناک کاروائیاں انجام پا رہی تھیں!!

حضرت زہراء (ع) یہاں پر ایک چھوٹے سے جملے میں، اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ فرماتی ہیں کہ رسول خدا (ص) کی وفات کے بعد انہی لوگوں نے فرصت کو غنیمت جانا اور میدان میں آگئے۔

(۵) " وھدر فنیق المبطلین "

(باطل گروہ۔ کفار و مشرکین۔ کے بہادر اور دلیر افراد بھی گرجنے لگے)

"فنیق" بہادر اور شجاع لوگ، "ھدر" گرجتے ہوئے بات کرنا۔ آپؑ کا مقصد یہ ہے کہ پیغمبر اکرم (ص) کی زندگی میں باطل اور اہل باطل دب چکے تھے اور ان کے بہادر اور دلیر افراد کو بھی اسلامی معاشرے کے بارے میں لب کشائی کی جرات تک نہ تھی لیکن۔ آپ (ص) کی رحلت کے بعد۔ اب وہ جسارت پر اتر آئے ہیں اور وہ اہل حق کے خلاف گستاخ ہوگئے ہیں۔

" فخطر فی عرصاتکم "

(پس۔ اب یہ لوگ۔ تمہارے درمیان اپنی دموں کو ہلا رہے ہیں۔ یعنی مقام و منصب کے مالک بن گئے ہیں۔)

ابوسفیان وغیرہ اور خلیفہ اول و دوم کے کارندے جنہیں مسلمان ذرا بھر بھی اہمیت نہیں دیتے تھے اب آکر تمہارے درمیان مقام و منصب کے مالک بن چکے ہیں اور تمہاری زندگی کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں۔

" واطلع الشیطان راسه من مغرزہ "

(اور شیطان نے اپنی پناہ گاہ سے سر اٹھایا)

"مغرز" پناہگاہ اور چھپنے کی جگہ کو کہا جاتا ہے، یہاں شیطان کو اس جنگی خاردار جانور سے تشبیہہ دی گئی ہے جو خطرے کے وقت کچھوے کی طرح اپنے خول میں چھپ جاتا ہے اور خطرہ ٹل جانے کے بعد اس سے سر باہر نکال لیتا ہے۔

شیطان بھی پیغمبر اسلام (ص) کی زندگی میں اپنے خول میں پنہاں رہتا تھا اور ظاہر ہونے کی جرات نہیں کرتا تھا، لیکن ابھی وہ اپنی پناہگاہ سے نکل کر تمہیں۔ حق کی مخالفت پر۔ اکسا رہا ہے۔

" ھاتفاً بکم "

(۔شیطان اپنی پناہگاہ سے نکل کر۔ تمہیں دعوت دے رہا ہے)

ابھی شیطان نے حالات کو جب اپنے لئے مناسب سمجھا ہے تو اپنی پناہگاہ سے نکل آیا ہے اور تمہیں دعوت دے رہا ہے کہ آؤ تاکہ خلیفہ بنائیں (۱)۔ یہاں پر حضرت زہراء (ع) نے سقیفہ والوں کی جلد بازی میں ہونے والی کاروائی کو شیطانی عمل قرار دیا ہے۔

گھات میں بیٹھے ہوئے شیطان صفت لوگ۔

" فالفاکم لدعـوته مستجیبین "

(پس شیطان نے تمہیں اپنی دعوت پر لبیک کہنے والوں میں سے پایا)

شیطان نے دیکھا کہ تم اس سے ہم آہنگ ہو اور اس نے اسلام کو امامت سے الگ کر کے انحراف سے دوچار کرنے کے اپنے شیطانی منصوبے پر عمل کرنے کے لئے تمہیں آمادہ پایا۔ اور تم نے اس کی سازش کو عملی جامہ پہنایا۔ اس طرح حقیقت میں سقیفہ میں جو کچھ ہوا وہ شیطان کی دعوت اور اس کے منصوبے پر عمل درآمد کے سلسلے میں ایک مثبت جواب تھا۔

" وللعـزة۔ للغرة۔ فیه ملاحظین "

(اور تم حصول عزت۔ یا دھوکہ کھانے۔ کی خاطر، شیطان کی طرف دیکھ رہے تھے)

یہ عبارت دو طرح سے نقل ہوئی ہے: ایک "للغرة" اور دوسری "للعزة" اب اگر پہلی عبارت صحیح ہو تو معنی یہ ہو گا کہ تمہیں شیطان نے دھوکہ دیا ہے اور آپ اس پر امیدیں لگائے بیٹھے تھے اور آپ نے اسے مثبت جواب دیا ہے، لیکن اگر دوسری عبارت یعنی "للعزة" درست ہو تو معنی یہ ہو گا کہ تم معاشرے میں عزت واحترام کے خواہاں تھے مثلاً۔ کوئی خلیفہ کوئی وزیر۔ کوئی والی وگورنر بننا چاہتے تھے تاکہ اس طرح عزت وشوکت حاصل کریں، تم شیطان کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے حلقہ بگوش ہو گئے ۔اور تم نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے۔

۱۔ روایت میں بھی ہے کہ جس نے سب سے پہلے ابوبکر کی بیعت کی وہ شیطان تھا کہ جو ایک بوڑھے شخص کی شکل میں آیا تھا...

بے وقوف تابعدار:

"ثم استنهضکم، فوجدکم خفافاً"

(پھر شیطان نے تم سے چاہا کہ قیام کریں پس اس نے دیکھا کہ تم گھٹیا انسان ہو)

معمولاً ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ دوسروں کو اپنا مرید اور بے چون وچرا فرمانبردار بنانا چاہتے ہیں تو پہلے ان کو کھوکھلا کر دیتے ہیں، ان کی شخصیت اور تشخص کو چھین لیتے ہیں ان لوگوں کو غور وفکر اور تعقل وتفکر کی قدرت سے محروم کر دیتے ہیں پھر ان کو اپنا مرید اور بے چون وچرا تابعدار اور پیرو کار بنا لیتے ہیں۔ لہذا حضرت فاطمہ زہراءؑ بھی فرماتی ہیں کہ شیطان نے تم سے یہ چاہا کہ تم اٹھو اور اس کی اطاعت کرو تو اس نے یہ دیکھا کہ تم میں کوئی استقلال نہیں، خودی اور انسانی شخصیت سے عاری، چند گھٹیا آدمی ہیں اور ہر بلانے والے کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔ قرآن میں بھی فرعون کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ: "فاستخف قومه فاطاعوه"[1] (فرعون نے اپنی قوم کو گھٹیا اور کھوکھلا بنایا جس کے نتیجے میں انہوں نے فرعون کی اطاعت کی) جب تک انسان سے اس کی خودی سلب کر کے اس گھٹیا نہ بنایا جائے اس وقت تک شیاطین انس وجن ان پر تسلط نہیں جما سکتے اور ان کی اندھی تقلید نہیں ہو سکتی۔

"واحمشکم فالفاکم غضاباً"

(اور شیطان نے جب تمہیں ورغلایا۔ غضبناک کیا۔ تو تمہیں غضب ناک پایا)

"احمشکم" تمہیں غضبناک کیا، تمہارے غصے کو بھڑکایا، "حمش" اس حرکت یا بات کو کہا جاتا ہے جو کسی کو غضبناک یا تند مزاج بنا دے، جیسا کہ جنگوں میں پڑھی جانے والی بعض رجز خوانیاں جو لوگوں کو اس قدر غضبناک کر دیتی تھیں کہ وہ آپے سے باہر ہو کر دشمن پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ "فالفاکم غضاباً" شیطان نے دیکھا کہ تم اس کی پسند کے تند مزاج غضبناک اور عداوت رکھنے والے لوگ ہو اور علی(ع) کے بارے میں دلوں میں عداوت، دشمنی اور حسد رکھتے ہو اور اس وقت انتقام لینے کے در پے اور تیار ہو۔

۱۔ سورۂ زخرف / ۵۴۔

" فوسمتم غیر ابلکم "

(اس طرح تم دوسروں کے اونٹوں پر علامت لگانے میں مشغول ہوگئے)

پرانے زمانوں میں لوگ اس لئے کہ ان کے اپنے اونٹ پہچانے جاسکیں ان پر داغ کے ذریعے مخصوص علامتیں لگاتے تھے۔

حضرت زہراء (ع) ان سے فرماتی ہیں کہ اب جب کہ تمہارے ہاتھوں میں اقتدار آیا ہے تو تم نے دوسروں کے اونٹوں پر بھی علامتیں لگانا شروع کردی ہیں اور ان کو اپنا اونٹ بناکر ان میں تصرف کرنے لگے گئے ہو (۱) آپ کی یہ بات کنایہ ہے اس بات سے کہ تم اپنی حد سے تجاوز کرکے دوسروں کے حریم میں داخل ہوگئے ہو۔

" وودتم غیر مشربکم "

(دوسروں کے پانی پینے کے مقام میں داخل ہوگئے ہو)

گزشتہ زمانوں میں جب شہروں میں پینے کے صاف پانی کے لئے پائپ لائن وغیرہ کا بندوبست نہیں ہوتا تھا تو لوگ پانی کے حصول کے لئے چشموں اور ندیوں سے استفادہ کرتے تھے اور ہر قوم یا گروہ کے لئے پانی لینے کی جگہ مخصوص تھی اور انہیں اسی مخصوص جگہ سے پانی لینا پڑتا تھا، لیکن طاقتور اور ڈکٹیٹر قسم کے افراد دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرتے تھے اور دوسروں کے چشموں پر بھی ناجائز قبضہ جماتے تھے۔

یہاں حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ: تم لوگ دوسروں کے چشموں میں داخل ہوگئے ہو۔ یہ کنایہ ہے اس واقعیت کی طرف کہ: تم نے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے اور امامت وولایت کو اپنے تجاوز کا ہدف بنایا ہے، کیونکہ امامت اور پیغمبر (ص) کی جانشینی ایک ایسی ذمہ داری ہے کہ جو خدا کی طرف سے سونپی جاتی ہے اور پیغمبر (ص) کے توسط سے خود خداوند عالم، امام اور پیغمبر (ص) کے جانشین

۱۔ جزیرۃ العرب میں اس وقت اونٹ ہی عظیم قومی سرمایہ تھا لہذا ان کی ثقافت میں ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے اونٹ اور اس قومی سرمایہ کے بارے میں لوگوں کے مختلف رویوں کو، کنایوں اور مثالوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

کو معین فرماتا ہے، جس طرح پیغمبر (ص) کو خدا معین فرماتا ہے اور لوگوں پر اس کی اطاعت واجب ہے بالکل اسی طرح پیغمبر (ص) کے جانشین کو بھی خدا معین کرتا ہے اور لوگوں کو اس کی بھی اطاعت اور پیروی کرنی چاہیئے، لیکن تم حد سے بڑھ گئے ہو اور خدا کے حکم کو پامال کرتے ہوئے تم نے اپنی طرف سے فیصلہ کر کے پیغمبر (ص) کے لئے خود ساختہ جانشین مقرر کر دیا ہے۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

چھٹا درس:

- گزشتہ درس کا خلاصہ
- سقیفہ کی واقعی صورت حال
- سقیفہ کے دوران حقائق کی تبدیلی
- عوام، سیاسی کھلونے
- قرآن میں رہبر کے شرائط
- قرآن کی چند خصوصیات
- قرآن، راہنمائے فکر و عمل

ثُمَّ اسْتَنْهَضَكُمْ فَوَجَدَكُمْ خفافاً، وَ أَحْمَشَكُمْ فَأَلْفاكُمْ غضاباً؛ فَوَسمْتُمْ غَيْرَ إِبلكم، وَ وَرِدْتُمْ غَيْرَ مشربكم [شِربكُم].

هٰذا وَ العَهْدُ قَرِيبٌ، و الكلْمُ رَحيبٌ، وَ الْجرْحُ لَما يَنْدَمل، و الرَّسُولُ لما يُقْبَر، ابتداراً، زَعَمْتُمْ خَوْفَ الفِتْنَةِ، أَلاٰ فِي الْفِتْنَةِ سقطوا وَ إِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحيطَةٌ بِالْكافِرِينَ، فَهَيْهاتَ مِنْكُمْ، وَ كَيْفَ بِكُمْ، وَ أَنّى تُؤْفَكُونَ! وَ كِتاب اللهِ بَيْنَ أَظْهرِكُمْ، أُمورُهُ ظاهِرَةٌ وَ أَحْكامُهُ زاهِرَةٌ وَ أَعْلامُهُ باهِرَة، وَ زَواجِرُهُ لائِحَةٌ، وَ أَوامِرُهُ واضِحَةٌ؛ وَ قَدْ خَلَّفْتُمُوهُ وَراء ظُهورِكُمْ، أَرغْبَة عنه تدبرون [تريدون]؟ أَمْ بِغَيْرِهِ تَحْكُمُونَ؟ بِئْسَ لِلظّالِمينَ بَدَلاً، وَ مَنْ يَبْتَغِ [يَتَّبِعْ] غَيْرَ الإِسْلامِ ديناً فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الآخِرَةِ مِنَ الخاسِرينَ].

❁ ❁ ❁

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

وبہ نستعین

گزشتہ درس کا خلاصہ:

گزشتہ درس میں ہم نے یہ بتایا کہ حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام نے مہاجرین وانصار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

پیغمبر(ص) کی رحلت کے بعد تمہارے درمیان منافقت کے کانٹے نمودار ہوئے، دین اور معنویت کا خاتمہ ہوگیا، مشرکین اور دوسرے افراد جو آج تک گوشہ و کنار میں چھپے ہوئے تھے نمایاں ہوکر صاحب سخن بن گئے، شیطان نے اپنے خول سے سر نکال کر تم میں تحرک پیدا کیا اور اپنی طرف بلایا پس اس نے تم کو گھٹیا اور بے ارادہ پایا۔ اس طرح شیطان نے سمجھ لیا کہ اگر تمہیں ورغلایا جائے تو تم بہت جلد متاثر ہوجاؤ گے۔ مختلف قسم کے پروپیگنڈوں سے جو افراد متاثر ہوتے ہیں وہ عموماً کوئی مستحکم نظریہ نہیں رکھتے یہ ضعیف الارادہ اور کھوکھلے انسان، جو بات بھی سنتے ہیں بہت جلد متاثر ہوجاتے ہیں۔

گزشتہ درس میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ جو لوگ کسی معاشرے سے غلط استفادہ کرنا چاہتے ہیں وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس قوم کو اپنے نظریات اور آزاد خیالی سے محروم کردیں تاکہ یہ قوم، کمزور اور جذباتی بن جائے اور ہوا کے ہر جھونکے سے بے اختیار متاثر ہوجائے۔

فرعون کے بارے میں قرآن فرماتا ہے کہ: اس نے اپنی قوم کو ہلکا اور گھٹیا پایا کہ جس کے نتیجے میں

انھوں نے اس کی اطاعت کی(۱)۔

عموماً ایسا ہوتا کہ جب کوئی فاسد گروہ کسی فرد کو اپنا ممبر بنانا چاہے تو پہلے قدم کے طور پر اس فرد سے اس کی خودی چھین لیتا ہے. مجھے یاد ہے کہ شاہی دور میں، زندان میں ایک شخص تھا، جو عقیدہ بدل کر کمیونسٹ بن چکا تھا، میں نے اس سے کہا کہ: تجھے کیا ہوا کہ اچانک اپنے دینی اعتقادات کو چھوڑ کر کمیونسٹ بن گئے ہو؟ اس نے جواب میں کہا کہ: ہماری پارٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنا عقیدہ بدل دیں! چونکہ ہم پارٹی کے ممبر ہیں اور پارٹی کے فیصلے ہمارے لئے حجت ہیں!! یہ وہی بات ہے جسے حضرت زہراء(ع) نے لوگوں سے فرمایا کہ: شیطان نے تمہیں بلایا اور چونکہ تم سست عناصر اور بے ارادہ قسم کے لوگ تھے، شیطان کے استقبال کے لئے آگے بڑھ گئے حالانکہ انسان کو فکری اور عقلی طور پر مستقل مزاج ہونا چاہئے اور مختلف قسم کے پروپیگنڈوں اور ہتھکنڈوں سے متاثر نہیں ہونا چاہئے یہاں پہنچ کر آپ فرماتی ہیں کہ:

"ثم استنھضکم فوجدکم خفافا"

(پھر شیطان نے تم سے چاہا کہ۔ اس کے پیچھے۔ چل پڑیں تو اس نے تمہیں گھٹیا پایا)

شیطان نے تم میں سنجیدگی نہیں دیکھی اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے دیکھا کہ تم میں اپنا کوئی فکری اور عقلی استقلال نہیں ہے اور جس طرف وہ ہانکے تم اسی طرف چل پڑتے ہو۔

"واحمشکم فالفاکم غضاباً"

(شیطان نے تمہیں ورغلایا اور غصہ دلایا تو تمہیں غضبناک پایا)

یعنی شیطان نے اس طریقے سے تمہارے جذبات کو بھڑکایا کہ تم غصے سے آگ بگولہ ہوگئے. اگر کوئی شخص دوسروں سے غلط استفادہ کرنا چاہے تو وہ ان کے سامنے کچھ ایسی باتیں اور قصیدہ خوانی کرتا ہے کہ ان کے جذبات سے کھیل کر بعض اور افراد کو ان کا جانی دشمن بنا دیتا ہے، اس کام کو اصطلاح میں احمش کہا جاتا ہے۔

۱۔ "فاستخف قومہ فاطاعوہ" سورۂ زخرف/ ۵۴.

" فالفاکم غضاباً "اس وقت شیطان نے دیکھا کہ تم غضبناک اور کینہ توز آدمی ہو اور شیطان کی مرضی کی مطابق تم غضبناک ہوتے ہو۔ اپنے غصہ اور کینہ توزی کو کفار ومنافقین کے خلاف استعمال کرنے کے بجائے پیغمبر(ص) کے اہل بیتؑ کو اپنے غیظ وغضب کا نشانہ بناتے ہو۔

" فوسمتم غیر ابلکم "

(پھر۔ کیا تھا کہ۔ تم نے دوسروں کے اونٹوں پر۔ اپنی ملکیت کی علامت۔ لگائی)

یعنی تم حد سے گزر گئے اور دوسروں کے اونٹوں پر علامت لگا ڈالی! اس دور میں رسم یہ تھی کہ ہر شخص اپنے مویشیوں کو چراگاہوں اور صحراؤں میں چرنے کے لئے چھوڑ دیتا تھا اور اپنے مویشیوں کی پہچان کے لئے ہر کوئی اپنے حیوانات پر مخصوص علامت لگا دیتا تھا، کوئی کان کاٹ دیتا تھا تو کوئی حیوان کے بدن کی کسی خاص جگہ پر گرم لوہے سے علامت لگا دیتا تھا اس عمل کو وسم کہتے تھے۔

یہاں حضرت زہراء(ع) کا یہ فرمانا کہ: تم نے دوسروں کے اونٹوں پر علامت لگا دی ہے، اور اس طرح دست درازی کر کے دوسروں کے مال مویشیوں کو اپنی ملکیت میں شامل کرلیا ہے کا مطلب، یہ ہے کہ خلافت پر تمہارا کوئی حق نہ تھا اور تم نے۔ اپنی اس بغاوت کے ذریعے۔ امامت وخلافت کی شرعی حدود پر تجاوز کیا ہے اور اپنی حد سے گزر گئے ہو۔

" ووردتم غیر مشربکم۔ شربکم۔"

(اور تم نے دوسروں کے گھاٹ اور چشمے پر ناجائز قبضہ جمایا ہوا ہے)

یہاں نسخوں میں لفظی اختلاف ہے بعض میں "مشربکم" ہے جبکہ بعض نسخوں میں "شربکم" ذکر ہوا ہے۔ بہر صورت دونوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی گھاٹ، پانی پینے کی جگہ۔

گزشتہ زمانوں میں۔ خصوصا ایسے علاقوں میں جہاں پانی کم اور استفادہ کرنے والے زیادہ ہوتے تھے۔ رواج یہ تھا کہ ہر قوم یا محلہ کے لئے چشمے یا ندی وغیرہ سے پانی لینے کی جگہ متعین ہوتی تھی اور ہر کوئی اپنے مخصوص گھاٹ سے ہی پانی لیتا تھا۔ پانی لینے کی ان جگہوں کو "منہل، مشرب یا شرب" کے نام سے یاد کرتے تھے اور اس طرح ہر قبیلہ اور محلہ کے لوگوں کے پانی لینے کی جگہ معین اور مشخص ہوتی تھی،

بہر صورت یہ تقسیم بندی اس وجہ سے تھی کہ وہاں ازدحام نہ ہو۔ اور باہمی نزاع کا سبب نہ بنے۔ البتہ طاقتور افراد یا قبیلے کبھی اپنے زور اور طاقت کے بل بوتے پر دوسروں کے گھاٹ پر قبضہ جمالیتے تھے۔

یہاں حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: تم دوسروں کے گھاٹ میں داخل ہوگئے۔ آپ کا مقصد یہ ہے کہ تم نے اپنی حد سے تجاوز کیا ہے اور تم ظلم اور ستمگری سے دوسروں کے حریم کو نشانہ بناتے ہو۔

سقیفہ کی واقعی صورت حال:

" ھذا، والعھد قریب "

(تم ان ساری کارستانیوں کے مرتکب ہوئے ہو حالانکہ عہد رسول تم سے بہت ہی قریب ہے)

حضرت زہراء سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ: تم نے اپنی ستمگری کا آغاز ایسی حالت میں کیا کہ جب پیغمبر اکرم (ص) کی رحلت کو کچھ عرصہ ہی گزرا ہے اور چند روز قبل تم آنحضرت (ص) کے منبر تلے بیٹھتے تھے اور آنحضرت (ص) تمہیں اپنی عترت (حضرت امیر المؤمنین، حضرت زہراء علیہما السلام) کے بارے میں نصیحت اور سفارش کرتے تھے اور تمہیں حق وعدالت کی رعایت کی تلقین فرماتے تھے، چند دن ہی گزرے ہیں کہ غدیر خم میں پیغمبر خدا (ص) نے دو ٹوک الفاظ میں علی (ع) کو اپنا جانشین بنایا اور تم سب نے اس کی بیعت کی ہے اور اسے مبارک بادی ہے۔ اب تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم نے اتنی جلدی ہر چیز کو بھلا دیا ہے! اور رسول خدا (ص) کی نصیحتوں کو پامال کر رہے ہو؟!!۔

" والعھد قریب " عہد رسول خدا (ص) سے تم بہت ہی نزدیک ہو (۱)۔ " عَھِد، عَھد " کا مصدر ہے۔ اور عَھد ملاقات کرنے نیز پہچاننے کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں عموماً ایسی ملاقات کو کہا جاتا ہے جو شناخت اور معرفت کے ساتھ ہو۔

۱۔ اس جملے سے شاید یہ مراد ہو کہ غدیر خم میں آپ کی حضرت علیؑ کے ساتھ بیعت اور عہد کا زمانہ نزدیک ہے اور اس پیمان اور بیعت کو ابھی تین ماہ بھی مکمل نہیں ہوئے کہ جس کو آپ نے توڑ مروڑ دیا ہے!

" والكلم رحيب "

(حالانکہ پیغمبر (ص) کی رحلت کا زخم بہت گہرا۔ اور ہرا۔ ہے)

" کلم " یعنی زخم اور چوٹ۔ " رحیب، رحب " سے مشتق اور وسیع، کشادہ اور گہرے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

رحمۃ للعالمین (ص) کی وفات نے اہل بیتؑ اور آپ (ص) کے مخلص اصحاب کے دلوں پر گہرا زخم لگایا ہے۔ حضرت زہراء (ع) بھی اس عبارت میں یہی فرماتی ہیں کہ: رسول خدا (ص) کی رحلت کے سبب سے ہمارے دلوں پر جو چوٹ آئی ہے وہ بہت گہری، وسیع۔ اور قوت برداشت سے باہر تھی۔ لیکن تم نے اس زخم پر مرہم رکھنے کی بجائے ہمارے اوپر مظالم کے پہاڑ ڈھائے۔

" والجرح لما يندمل "

(۔ ہمارے دل کے۔ زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے)

ان باتوں سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ رحلت رسول خدا (ص) کے فوراً چند دن بعد ہی فدک غصب ہوا تھا اور آپؑ نے مسجد میں خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ بعض تاریخی کتابوں میں ذکر ہوا ہے کہ رحمت للعالمین (ص) کی وفات کے دسویں دن آپؑ نے مسجد میں لوگوں سے خطاب فرمایا۔ بہر صورت، اہل بیتؑ، پیغمبر (ص) کے غم میں سوگوار تھے۔ کہ انہی دنوں میں اہل بیتؑ پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

" والرسول لما يقبر "

(اور پیغمبر (ص) ابھی دفن بھی نہیں ہوئے تھے)

یہاں حضرت زہراء (ع) سقیفہ کی کاردائی کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ابھی رسول خدا (ص) دفن بھی ہونے نہ پائے تھے اور حضرت علی (ع) ان کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے کہ یہ لوگ سقیفہ میں جمع ہو گئے اور اسلام اور مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے لگ گئے!۔

سقیفہ کے دوران حقائق کی تبدیلی:

"ابتــداراً"

(انتہائی جلد بازی میں۔ تم نے یہ قدم اٹھایا۔)

"ابتداراً" ممکن ہے مفعول مطلق ہو[1] اور اس کا فعل محذوف ہو اس طرح اصل میں "ابتدر تم ابتداراً" یعنی تم نے حد سے زیادہ جلد بازی سے کام لیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ مفعول لہ[2] ہو اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ چونکہ تم جلدی میں تھے اور آپ کا مقصد یہ ہے کہ۔ تم خلافت کو غصب کرنا چاہتے تھے بغاوت کے لئے مناسبت ترین وقت وہی تھا کہ جب علی (ع) دنیا ومافیہا سے بے نیاز ہو کر پیغمبر خدا (ص) کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے۔ لہذا تم سقیفہ میں جمع ہو گئے اور یہ سوچنے لگے چونکہ پیغمبر خدا (ص) کے بعد اسلامی معاشرے کا کوئی سربراہ نہیں ہے اور اسلام خطرات سے دوچار ہے لہذا اسلام کو خطرات سے بچانے کے لئے خلیفہ مقرر کر دیا ہے۔ چونکہ اس منصوبے پر عملدر آمد کے لئے وقت کم تھا اور تم جلدی میں تھے، پیغمبر (ص) کو بے کفن چھوڑ دیا اور بغاوت کر کے کرسی اقتدار پر قبضہ جمالیا، اقبال نے خوب کہا ہے: "چون صحابہ حب دنیا داشتند مصطفیٰ را بے کفن بگذاشتند"۔

"زعمتم خوف الفتنة"

(تم نے گمان کیا کہ۔ اگر ہم خلافت غصب نہ کریں تو۔ فتنے سر اٹھائیں گے!)

"زعمتم" تم نے گمان کیا، یہ کلمہ عموماً اس وقت استعمال کیا جاتا ہے کہ جب کسی غلطی کی توجیہ میں کوئی نامعقول عذر پیش کیا جائے۔ اس عبارت کا مقصد یہ ہے کہ تم نے جلدی بازی سے کام لیا اور یہ بہانہ پیش کیا کہ ہمیں ڈر تھا کہ کہیں فتنے سر نہ اٹھائیں، مثال کے طور پر سوچا کہ کہیں یہ تازہ مسلمان مرتد نہ ہو جائیں۔ اسی بہانے کی آڑ میں آکر۔ فوراً ایک شخص کو پیغمبر (ص) کا جانشین بنایا گیا!۔

واقعیت یہ تھی کہ سقیفہ والوں کا بنیادی ہدف، خلافت کو غصب کرنا تھا۔ جو کر لیا۔ لیکن در پردہ

۱۔ مفعول مطلق: فعل کا مصدر ہوتا ہے جو اس فعل کی تاکید کے لئے لایا جاتا ہے۔

۲۔ مفعول لہ: کسی کام کی علت اور مقصد کو بیان کرتا ہے۔

حقائق سے بے خبر لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے "خوف فتنہ" کے بہانے کا سہارا لیا تاکہ ایک طرف سے تو کوئی عوامی رد عمل سامنے نہ آئے اور دوسری طرف سے اپنے اس اقدام کو جائز اور حق بجانب قرار دیں، لیکن حضرت زہراء(ع) نے در پردہ علل واسباب سے پردہ اٹھایا اور ان کے اہداف ومقاصد کی طرف لوگوں کو متوجہ فرمایا۔

"الا فی الفتنة سقطوا"

(آگاہ رہو! یہ لوگ فتنے کی گہرائیوں میں گر گئے ہیں)

تم جو چاہتے تھے کہ فتنے سے محفوظ رہیں لیکن یہ جان لو کہ تمہارا یہ اقدام اس بات کا سبب بن گیا ہے کہ تم سب فتنے میں گر پڑو۔ اس سے بڑھ کر اور کیا فتنہ ہوسکتا ہے کہ علی(ع) کو گوشہ نشینی اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ مفاد پرست اقتدار سنبھال لیں اور اسلام کو اپنی اصلی راہ سے منحرف کردیں۔ اس کے علاوہ تم نے پیغمبر اکرم(ص) کی واضح نص شرعی کی بھی مخالفت کی کیونکہ خدا اور پیغمبر خدا(ص) کے حکم سے علی(ع) کی خلافت کا اعلان ہوا تھا۔ اور تمام مسلمانوں نے علی(ع) کی بیعت کی تھی، بنابریں پیغمبر اسلام(ص) کے بعد جانشینی کا مسئلہ پہلے سے حل ہوچکا تھا اور کوئی مشکل نہیں تھی، لیکن تم نے اپنے اس اقدام کے ذریعے۔ اسلامی معاشرے میں۔ تفرقہ اور فتنہ کے بیج بوئے۔

"وان جهنم لمحیطة بالکافرین(۱)"

(اور بتحقیق جہنم کفار کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے)

یہاں آپؑ نے قرآن کی اس آیت کو ان پر تطبیق کیا ہے اور در حقیقت ان کو کافر قرار دیا ہے، البتہ آپؑ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ اصطلاحی کافر ہیں (یعنی وہ خدا و رسول خدا(ص) اور قیامت کے بھی منکر ہوں، ایسا نہیں تھا) بلکہ جہاں ایمان کے کچھ مراتب ہیں وہاں کفر کے بھی کچھ مرتبے ہیں اور بعض روایات میں آیا ہے کہ گناہ کی حالت میں انسان سے اس کا ایمان جدا ہوجاتا ہے اور غصب خلافت چونکہ گناہان کبیرہ میں سے شمار ہوتا ہے لہذا حضرت زہراء(ع) نے کفار سے مربوط اس آیت کو، سقیفہ

۱۔ آپؑ نے سورہ توبہ کی آیت ۴۹ کو بعینہ نقل کیا ہے۔

والوں پر تطبیق فرمایا ہے۔

عـوام، سیاسی کھلونے:

" فهیهـات منكم "

(تم سے۔ یہ حرکتیں۔ بہت بعید تھیں!)

تم مہاجر وانصار سے یہ بعید تھا کہ ایسی حرکتوں کے مرتکب ہو جاؤ اور اپنے پیغمبر (ص) کے خاندان کو تنہا چھوڑ دو اور یہ بھی بعید تھا کہ ایک شیطان صفت گروہ کے فریب میں آکر ان کی سیاست اور پروگراموں کے سامنے کھلونا بن جاؤ۔

" وكيـف بـكم؟ "

(اور تمہیں ہوا کیـا ہے؟)

یعنی تم اسلام میں سبقت رکھتے ہو اور کسی حد تک ان امور سے آگاہی بھی رکھتے ہو، پھر۔ ان سب چیزوں کے باوجود۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟۔

" وانـیٰ تؤفـكون؟ "

(اور کہاں بھٹک رہے ہو؟)

امامت جیسے اہم مسئلے میں انحراف اور کجی نے حضرت زہراء (ع) کو مضطرب اور پریشان کر دیا ہے کیونکہ آپ دیکھ رہی تھیں کہ سادہ لوح عوام، چند معلوم الحال افراد کی شیطانی سیاست کے ہاتھوں کھلونا بن چکے ہیں اسی لئے آپ ان سے پوچھتی ہیں کہ: کیا تم جانتے ہو کہ آخر کیا کر رہے ہو؟ اور تمہیں۔ راہ راست سے منحرف کر کے۔ کہاں لے گئے ہیں؟۔

قـرآن میں رھبـر کے شرائط:

" وكتاب اللّٰـه بین اظهر كم "

(درحالیکہ خدا کی کتاب۔ قرآن۔ تمہارے درمیان موجود تھی)

۔" بین اظہرکم " کا لفظی ترجمہ " تمہارے کاندھوں کے درمیان ہے "۔ یہ ایک اصطلاح ہے اور اس وقت بولی جاتی ہے کہ جب کسی حساس مقام پر کسی اہم شخصیت کا دفاع کرنا مقصود ہو. فرض کریں کہ کسی جگہ پر کوئی شخصیت موجود ہے اور لوگ اس کی شخصیت کو دشمن کے مقابلے میں محفوظ رکھنا چاہیں تو اس محترم شخص کو اپنے گھیرے میں لے لیا کرتے ہیں اور اکثر لوگ اس کی طرف پشت کرکے دشمن کے روبرو کھڑے ہوجاتے ہیں اور ہر طرف سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے تاکہ دشمن اس پر حملہ نہ کرسکے۔

یہاں پر حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: خدا کی کتاب، قرآن تمہارے۔ کاندھوں کے۔ درمیان موجود تھی اور تم دشمنوں کے مقابلے میں قرآن اور احکام قرآن کی پاسبانی کرتے تھے اس طرح تم قرآن کو اپنے درمیان رکھ کر دشمن کی طرف متوجہ تھے اب اسی قرآن میں امامت اور مسلمانوں کی سربراہی کے شرائط مذکور ہیں، ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ: " افمن یهدی الی الحق احق ان یتبع امن لایهدی الا ان یهدی(۱) " (کیا جو لوگوں کو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے وہ لائق اتباع اور پیروی کا حقدار ہے یا وہ شخص جو جب تک کوئی اس کو ہدایت نہ کرے ہدایت نہیں پاتا؟)۔ یعنی ایک شخص ہدایت یافتہ ہے لوگوں کی عملاً ہدایت کررہا ہے دوسرا شخص محتاج ہدایت ہے اب ان دو میں سے کون امامت ورہبری کا حقدار ہے؟۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ: " ولاتطیعوا امر المسرفین(۲) " (اسراف اور فضول خرچی کرنے والوں کی پیروی نہ کرو) یہ آیتیں بتاتی ہیں کہ جو شخص فضول خرچ ہو۔ یا خود ہدایت کا محتاج ہو۔... مسلمانوں کا حاکم اور رہبر نہیں بن سکتا بلکہ خلیفہ اور مسلمانوں کے رہبر کے لئے ضروری ہے کہ وہ عادل اور ہدایت یافتہ ... ہو؛ اسی طرح قرآن مجید میں اسلامی معاشرے کے رہبر اور سربراہ کے لئے دوسری شرائط بھی ذکر ہوتی ہیں(۳)۔

۱۔ سورۂ یونس / ۳۵. ۲۔ سورۂ شعراء / ۱۵۱.

۳۔ تاریخ اور اہل سنت کے بہت سارے علماء کی گواہی کے مطابق، حضرت علیؑ علمی مقام کے اعتبار سے تمام لوگوں سے زیادہ اعلم ==

قرآن کی چند خصوصیات،

(۱) "امورہ ظاہرۃ واحکامہ زاہرۃ"

(قرآن کے علوم و معارف آشکار اور اس کے احکام درخشاں ہیں)

یہ جملہ اس بات پر دلالت رکھتا ہے کہ قرآن کی آیات سے جو معانی ہماری سمجھ میں آتے ہیں وہ ہمارے لئے حجت ہیں اور ہماری زندگی پر قرآن کی حکمرانی ہونی چاہئے۔ یہ کسی بھی صورت میں صحیح نہیں کہ ہم قرآن کو صرف تبرک کے لئے چومیں اور طاقچہ پر احترام سے رکھ دیں تاکہ صرف فاتحہ خوانی کے لئے اس سے استفادہ کریں، بلکہ ضروری ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں قرآن کی طرف رجوع کریں اور قرآن کے احکامات اور فرامین پر عمل کریں، البتہ قرآنی آیات کی توضیح اور تفسیر کے لئے معصومینؑ کی روایات کی طرف رجوع کرنا بھی ضروری ہے۔

(۲) "واعلامہ باہرۃ"

(قرآن کی نشانیاں، بلند اور غالب ہیں)

جیسا کہ آج کل سڑکوں کے پیچ و خم اور نشیب و فراز سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے سڑکوں پر مخصوص علامتیں نصب کی جاتی ہیں بالکل اسی طرح گزشتہ زمانوں میں بھی صحراؤں اور راستوں میں مسافروں کی راہنمائی کے لئے علامت کے طور پر بڑی بڑی چیزیں نصب کردی جاتی تھیں اور یہ علامتیں عموماً اونچی اور بلند ہوا کرتی تھیں تاکہ مسافر دور سے ان علامتوں کو دیکھ سکے، اصطلاح میں ان علامتوں کو علَم کہا جاتا تھا اور بلند علامتوں اور نشانیوں کو "علم باہر" یعنی بلند اور غالب علامت کہا جاتا ہے۔ "باہر" بَھَرَ" سے مشتق ہے اور "بَھَرَ" کے معنی بلند، اونچا اور غالب کے ہیں۔

یہاں پر حضرت۔ فاطمہ (ع)۔ قرآن کی تعلیمات کو ان علامتوں سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتی ہیں

== اور فقیہ تر تھے اور بہت سارے مسائل کے بارے میں خلیفہ ثانی آپؑ سے سوال کرتا تھا۔ یہ مشہور ہے کہ جب عمر کسی حکم کو نہیں جانتا تھا تو حضرت علیؑ سے پوچھتا اور آپؑ، خلیفہ کی راہنمائی فرماتے تھے ایسے ہی موقعوں پر حکم خدا سے آگاہ ہونے کے بعد خلیفہ نے ستر سے زیادہ مقامات پر کہا کہ: "لولا علی لہلک عمر" اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔

کہ قرآن کی نشانیاں اور علامتیں دوسرے ادیان ومذاہب کی تعلیمات پر غالب اور ارفع واعلیٰ ہیں۔ قرآن میں بھی آیا ہے کہ: " ان ھـذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم(۱) " (بیشک یہ قرآن انسان کو بہت محکم اور قوی قوانین ومعارف کی جانب ہدایت کرتا ہے)

(۳) " وزواجـرہ لائحـة واوامرہ واضحـة "

(قرآن کے امرونہی واضح اور آشکار ہیں)

"زواجر" سے مراد قرآن کے نواہی ہیں۔ "زجر" کے معنی ہیں منع کرنا اور روکنا۔ پس نہی کا معنی طلب ترک نہیں جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں بلکہ نہی کا مدلول زجر اور روکنا ہی ہے جیسا کہ مرحوم آیت اللہ العظمیٰ 'بروجردی' فرماتے تھے کہ: امر کسی کام کے کرنے پر وادار کرنے اور نہی اس سے روکنے کے معنی میں ہے۔

مندرجہ بالا فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے اوامر اور نواہی واضح اور آشکار ہیں اور جو بھی قرآن کی زبان سے آشنائی رکھتا ہو بخوبی ان اوامر ونواہی کو درک کر سکتا ہے۔

قـرآن، راھنمائے فکر و عـمـل:

" قد خلفتموہ وراء ظھورکـم "

(قرآن کو۔ ہدایت کا روشن منیارہ ہونے کے باوجود۔ تم نے پس پشت ڈال دیا)

جب امامت ورہبری جیسے مہم اور حساس مسئلے میں تم نے قرآن کو قابل اعتناء نہیں سمجھا اور رہبری اور قیادت کے لئے قرآن کے معین کردہ شرائط کو ٹھکرا دیا تو حقیقت میں تم نے قرآن سے روگردانی اختیار کی ہے اور قرآن کو متروک قرار دیا ہے اگرچہ تم فروع دین، نماز، روزہ، اور حج کے مسائل میں قرآن پر عمل کرتے ہو لیکن امامت جیسے اہم مسئلے میں تم نے قرآن کے ساتھ بے اعتنائی برتی۔ اور یہ قرآن سے مکمل روگردانی کے مترادف ہے۔

۱۔ سورۂ اسراء (بنی اسرائیل) / ۹۔

" ارغبة عنه تدبرون- تریدون- ام بغیرہ تحکمون "

(کیا تم قرآن سے نفرت کے ساتھ منہ پھیر لیتے ہو یا کسی دوسری چیز کو حکم اور قضاوت کا معیار قرار دیتے ہو)

اس عبارت کے نقل میں نسخوں میں اختلاف ہے بعض نسخوں میں " تدبرون " اور بعض میں "تریدون " ذکر ہوا ہے. اگر واقع میں " تریدون " صحیح ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ: کیا تم نے یہ ارادہ کیا ہے کہ قرآن سے منہ پھیر لیں ؟ لیکن اگر " تدبرون " درست ہو اور شاید بہتر بھی یہی ہے تو جملے کا معنی یہ ہو گا کہ: کیا تم۔ نفرت کے ساتھ۔ قرآن سے منہ موڑنا چاہتے ہو اور اسے پس پشت ڈالنا چاہتے ہو؟ یعنی کیا تم نام نہاد اسلامی حکومت کے نام پر قرآنی حقائق کو پامال کرنے کے خواہاں ہو؟. " ام بغیرہ تحکمون " یا تم قرآن کے علاوہ کسی دوسرے ملاک اور معیار کے مطابق حکم کرنا چاہتے ہو؟

" وبئس للظالمین بدلاً (۱) "

(ظالموں کے لئے کس قدر بری ہے وہ چیز کہ جس کو قرآن اور حق کے بدلے میں انہوں نے اختیار کیا ہے)

حضرت زہراء(ع) اس قرآنی آیت سے استفادہ کرتے ہوئے ظلم کے انجام کی طرف اشارہ کرتی ہیں. آپ سقیفہ کی کاروائی، اس کے نتائج اور قرآن سے روگردانی کو ظلم کے روشن ترین مصداق جانتی ہیں اور اس کے عاملین کو ظالم.

" ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ (۲) "

(جو اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کو اختیار کرے تو اس سے وہ دین قبول نہیں کیا جائے گا)

بعض نسخوں میں " ومن یتبع غیر الاسلام " ذکر ہوا ہے لیکن " ومن یبتغ غیر الاسلام " صحیح نظر آتا ہے کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان کلمات کو قرآن سے اقتباس فرمایا ہے اور وہاں پر " ومن یبتغ " مذکور ہے۔

۱۔ یہ عبارت سورۂ کہف کی آیت / ۵۰ سے ماخوذ ہے.

۲۔ سورۂ آل عمران / ۸۵

"وهو فی الاخرة من الخاسرین(۱)"

(اور وہ آخرت میں گھاٹے میں ہوں گے)

یہاں حضرت زہراء(ع) یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ: تم نے جو قرآن سے منہ پھیر لیا ہے اور اس کے اوامر ونواہی پر عمل نہیں کرتے ہو در حقیقت اسلام سے خارج ہوچکے ہو، کیونکہ اسلام کی بنیاد تو قرآنی دستورات اور فرامین پر رکھی گئی ہے، اگر اسلام سے قرآن کو حذف کیا جائے تو پھر اسلام نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی، تم جو قرآنی تعلیمات کو چھوڑ چکے ہو اور اس پر عمل نہیں کرتے ہو تو تمہارا یہ عمل بالکل اس طرح ہے کہ تم نے اسلام کو خیرباد کہہ کر کسی دوسرے دین کو قبول کیا ہو۔

یہاں تک آپؑ نے اصل مسئلہ کو بیان فرما دیا ہے کہ: پیغمبر(ص) دفن بھی نہ ہوئے تھے کہ تم نے اپنا من پسند خلیفہ بنایا اور پیغمبر(ص) کے برحق جانشین کو خانہ نشیں ہونے پر مجبور کردیا اور قرآن کے واضح احکامات نیز پیغمبر اکرم(ص) کی تعلیمات کو پامال کردیا ہے۔ اس کے بعد آپؑ فرماتی ہیں کہ اگر تم خلافت کی راہ کو منحرف کرنے میں کامیاب ہوگئے ہو تو پھر آپ کو اپنی خلیفہ گری کے پیچھے جانا چاہیئے تھا اور کم از کم پیغمبر(ص) کی عزت کو تو ظلم وستم کا نشانہ نہ بناتے، لیکن تم۔ بہت بے شرم نکلے کہ غصب خلافت پر اکتفاء نہ کیا بلکہ۔ فدک کو بھی غصب کرکے پیغمبر خدا(ص) کے اہل بیت علیہم السلام سے بھی گستاخی کی۔

انشاء اللہ آنے والے درس میں خطبے کے باقی ماندہ حصے پر گفتگو ہوگی۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۔ سورۂ آل عمران / ۸۵۔
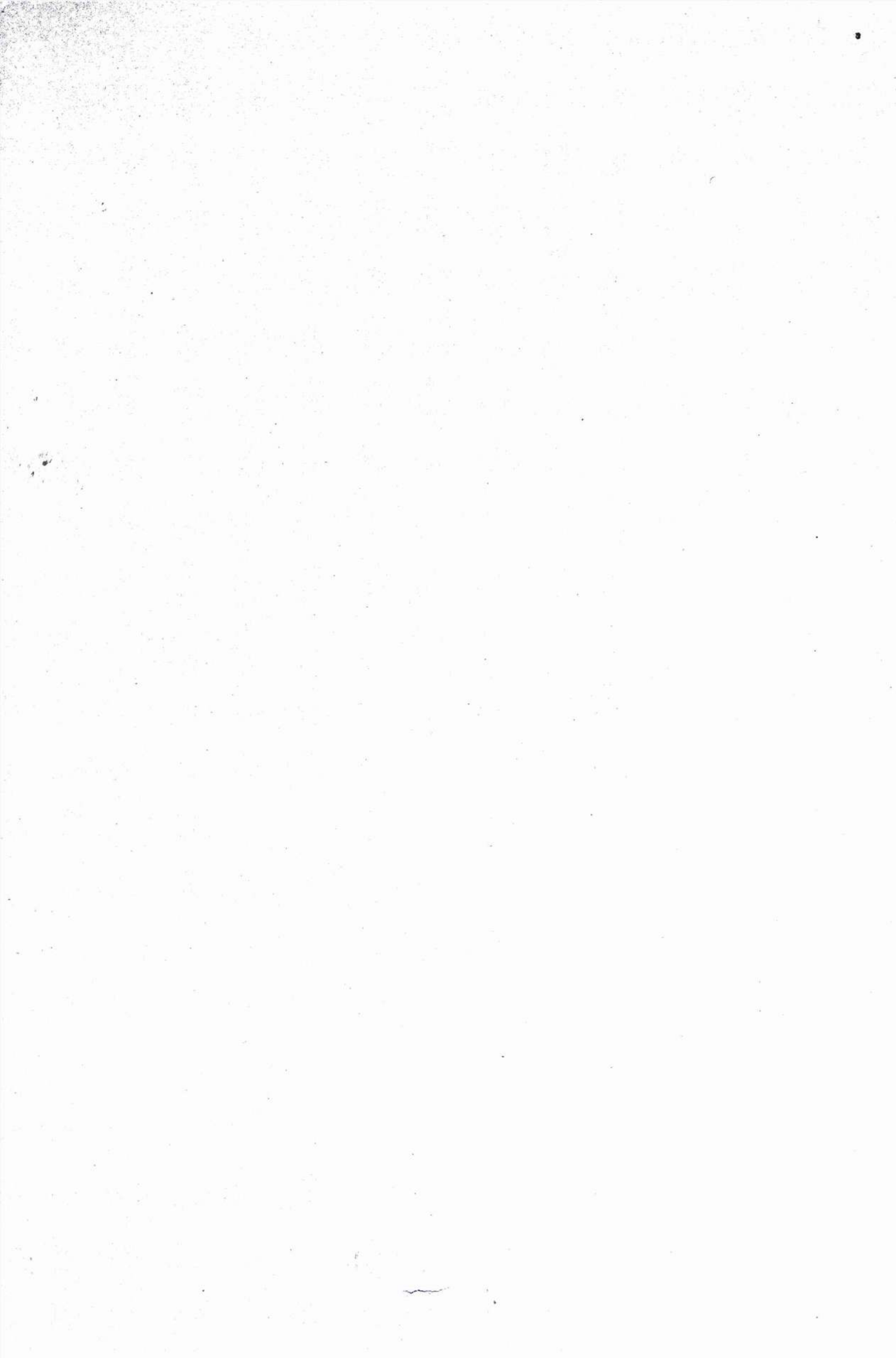
ساتواں درس:

- خلیفه تراشی اور اقدار کی تبدیلی
- مکر وفریب کے ذریعے اقتدار پر قبضه
- دوستی کے انداز میں دشمنی
- سختیوں پر صبر
- فدک، میراث پیغمبر (ص)
- آیات ارث اور انبیاء (ع)
- آیات ارث کے سمجھنے میں غلط فہمی کی وجوهات
- ارث کے مسئلے پر اتنی تاکید کیوں؟
- ارث سے آپ (ع) کی مراد کیا هے؟
- حضرت زهراء (سلام اللّٰه علیها) کی ابوبکر کو وارننگ

ثُمَّ لَمْ تَلْبَثُوا إِلاَّ رَيْثَ أَنْ تسكنَ نفرتها وَ يسلسَ قيادها، ثُمَّ أَخَذْتُمْ تورون وَقْدَتها وَ تهيجونَ جمرتها وَ تَسْتَجيبونَ لِهتافِ الشَّيْطانِ الغوى، وَ إِطْفاء أَنْوار الدّين الْجَلى وَ إِهْماد سُنَنِ النَّبِيِّ الصَّفى، تَشْرَبُونَ حسْواً فِى ارْتِغاء، وَ تَمْشُونَ لِأَهْلِهِ وَ وُلْدِهِ فى الخمرة و الضراء، وَ نَصْبِرُ مِنْكُمْ عَلىٰ مِثْلِ حزّ المدى وَ وخز السّنان فى الحشا؛ وَ أَنْتُم الآن تزعمون: أَنْ لا إِرْثَ لَنا، أَفَحُكْم الجاهِلِيَّةِ تَبْغُون وَ مَنْ أَحْسَنُ مِنَ الله حُكماً لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ؟! أَفَلاَ تعلَمون؟

بَلى قَدْ تَجلّى لَكُمْ كَالشَّمْسِ الضّاحِيَةِ: أَنِّي إِبْنَتُه.

أَيُّهاالمُسْلِمُونَ!أَأُغْلب عَلىٰ إِرْثيه؟ يَا ابْنَ أَبى قُحافَةَ! أَفى كِتابِ اللهِ أَنْ تَرِثَ أَباکَ وَ لاأَرِثَ أَبى؟!! لَقَدْ جِئْتَ شَيْئاً فرياً [عَلَى اللهِ و رسوله]! أَفَعَلى عمدٍ تَرَكْتُمْ كتابَ اللهِ وَ نبذ تُمُوهُ وَراءَ ظُهُورِكُمْ؟ إِذْ يَقُول: ﴿وَ وَرِثَ سُلَيْمانُ داوودَ[1]﴾، وَ قالَ فيما اقْتَصَّ مِن خَبَرِ يَحْيَى بن زكريّا عليه السلام إِذ قالَ: ﴿فَهَبْ لي مِنْ لَدُنْکَ وَلِيّاً يَرِثُنى وَ يَرِثُ مِنْ آلِ يعقوب[2]﴾

وَ قال: ﴿وَ أُولُوا الأَرْحامِ بَعْضُهُمْ أَوْلىٰ بِبَعْضٍ فى كتابِ الله[3]﴾

وَ قال: ﴿يُوصِيكُمُ اللهُ في أَوْلادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الأُنْثَيَيْنِ[4]﴾

وَ قال: ﴿إِنْ تَرَکَ خَيْراً الْوَصِيَّةُ لِلْوالِدَيْنِ وَ الأَقْرَبينَ بِالمَعْرُوفِ حَقّاً عَلَى المُتَّقِينَ[5]﴾؛ وَ زَعَمْتم أَنْ لاحظوة لى وَ لا إِرْثَ مِنْ أَبى وَ لا رَحِمَ بَيْنَنا، أَفَخَصَّكم الله بِآيَةٍ أَخْرَجَ أَبى [محمّداً صلى الله عليه وآله] مِنْها؟! أم هَلْ تَقُولون: إِنَّ أَهْلَ المِلَّتين لايتوارثان؟! أَوَلَسْتُ أَنَا وَأَبى مِنْ أَهْلِ مِلَّةٍ واحِدَة؟! أَمْ أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِخُصوصِ الْقُرآنِ وَ عُمومِهِ مِنْ أَبى وَ ابْنِ عَمّى؟!

فَدُونَكها مخطومةً مرحولةً، تلْقاکَ يَوْمَ حَشْرِکَ، فَنِعْمَ الحَكَمُ اللهُ، وَ الزَّعيمُ [الغريم] مُحَمَّدٌ صلى الله عليه وآله، وَالْمَوْعِدالقِيامَةُ؛ وَعِنْدَ السّاعَةِ يخسر المبطلون، وَلا يَنْفَعُكُمْ إِذ تندمون؛ وَ لِكُلِّ نَبَإٍ مُسْتَقَرٌّ وَ سَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ يَأْتيهِ عَذابٌ يُخْزيه وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذابٌ مقيمٌ.

***

---

۱. نمل: ۱۶.

۲. مریم: ۵ و ۶.

۳. انفال: ۷۵.

۴. نساء: ۱۱.

۵. بقره: ۱۸۰.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبہ نستعین

خلیفہ تراشی اور اقدار کی تبدیلی،

لوگوں کی قرآن سے بے رخی اور قرآن میں امامت اور رہبر کے لئے معین شدہ شرائط کو نظرانداز کرنے کی طرف اشارہ فرمانے کے بعد اب یہاں، پہلے سے تعیین شدہ اہداف کی تکمیل کے لئے جلد بازی میں خلیفہ گردوں نے جو خلیفہ تراشی کی ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپؑ فرماتی ہیں کہ:

"ثم لم تلبثوا الا ریث ان تسکن نفرتھا"

(۔ رحلت پیغمبر (ص) اور قرآن سے منہ پھیرنے کے بعد۔ پھر تم نے صبر نہیں کیا
مگر اتنی دیر تک کہ خلافت کا سرکش اونٹ ساکت ہوجائے)

"ریث " مقدار، لحہ، لحظہ، "نفور " چوپائے کا دور ہونا، اور یہ حیوان کی سرکشی اور اس کا اپنے اوپر سوار نہ ہونے دینے کے لئے کنایہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جب لوگ اونٹ پر سوار ہونا چاہتے ہیں تو اونٹ چند لمحوں کے لئے سرکش بن جاتا ہے اور دور ہوجاتا ہے، اس وقت چند لمحوں کے لئے اونٹ کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ اس کی سرکشی ختم ہوجائے پھر جاکر سوار ہوجاتے ہیں۔

حضرت زہراء(ع) بھی یہاں فتنۂ خلافت کو اونٹ سے تشبیہہ دیتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ۔ پیغمبر (ص) کی رحلت کے بعد تم نے فوراً قرآن سے منہ پھیرلیا اور۔ خلیفہ تراشوں نے اتنا ہی صبر کیا کہ جس قدر کسی

اونٹ پر سوار ہونے کے لئے چند لمحوں کے لئے صبر کیا کرتے ہیں۔ وہ بھی اس لئے تھا کہ جلدی اور عجلت میں خلافت کے بت تراشے جائیں۔ اور پیغمبر (ص) کی عترت ؑ اور مہاجر و انصار کی بہت ساری شخصیات کو اطلاع دیئے بغیر سقیفہ تشکیل دے کر خلیفہ مقرر کردیا ہے۔

"ویسلس قیادھا"

(۔ تم نے صبر نہیں کیا مگر اس حد تک۔ کہ شتر خلافت کی لگام آسانی سے تمہارے ہاتھ آجائے)

"سلس" کسی چیز کی روانی اور اس کے آرام ہونے کو کہتے ہیں جبکہ "قیاد" لگام اور باگ ڈور کو کہا جاتا ہے۔ یہاں پر بھی آپ ؑ نے فتنہ خلافت کو اونٹ سے تشبیہ دی ہے۔ اور فرماتی ہیں کہ پیغمبر (ص) کے بعد تم ایک لمحہ ضائع کئے بغیر سرگرم عمل ہوگئے اور خلافت کی باگ ڈور کو سنبھال لیا اور اپنے اس عجلت زدہ کام میں نہ قرآن کا پاس رکھا اور نہ پیغمبر (ص) کے احکامات کا۔

"ثم اخذتم تورون وقدتھا"

(۔ خلافت پر قبضہ کرنے کے بعد۔ تم نے۔ فتنہ۔ کے شعلوں کو بھڑکانا شروع کردیا)

"وقدۃ، وقود کا ہم معنی ہے یعنی ایندھن۔ یہاں بنت الرسول (ع) نے سقیفہ کے واقعے اور غصب خلافت کو اس آگ سے تشبیہ دیا ہے جس کو پہلے انگارے سے جلایا جائے پھر آہستہ آہستہ اسے مزید ایندھن فراہم کرکے بھڑکایا جائے۔ یعنی تم نے خلافت کی آگ کو سقیفہ میں جلایا اور اسی پر اکتفاء نہ کیا بلکہ اپنی سرکشی، ظلم اور ستمگری نیز جنایتوں کے ذریعے اس آگے کے شعلوں کو مزید بھڑکایا۔

"وتہیّجون جمرتھا"

(اور تم ظلم کی اس آگ کے انگارے کو بھڑکانے اور پھیلانے میں مشغول ہو)

جب کوئلے کا ٹکڑا جل کر سرخ ہوتا ہے تو اسے "جمرۃ" کہا جاتا ہے اس کی جمع "جمر" ہے۔ "تھییج جمرۃ" آگ کے انگاروں کو ہوا دے کر اسے پھیلانے کو کہتے ہیں تاکہ دوسرے کوئلے بھی آگ پکڑلیں۔

اس عبارت میں آپ ؑ فرماتی ہیں کہ: جب تم غصب خلافت کے ذریعے اقتدار پر قابض ہوگئے تو اپنی حکومت اور ریاست تک محدود نہ رہے بلکہ ظلم و ستم کی آگ کو مزید پھیلا دیا ہے اور اہل بیت ؑ سے

ان کا حق اور فدک غصب کر لیا ہے اور ان کو اپنے حملے کا نشانہ بنا کر آتش ظلم میں جھونک دیا ہے۔

"وتستجیبون لہتاف الشیطان الغوی"

(اور تم گمراہ و مردود شیطان کی آواز پر لبیک کہتے ہو)

یعنی جب شیطان تمہیں اپنی طرف بلاتا ہے تو تم فوراً لبیک کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہو اور اس کے پیچھے چل پڑتے ہو۔

حضرت زہراء (ع) سقیفہ میں رونما ہونے والے حادثے کو، شیطان کی دعوت کا عملی جواب جانتی ہیں کیونکہ اسلام میں امامت وخلافت یعنی امت کی رہبری کے مسئلے میں انحراف اور کجی، سقیفہ کی سازش کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔

"واطفاء انوار الدین الجلی"

(اور تم نے صاف وشفاف دین مقدس اسلام کی روشن قندیلوں کو خاموش کرنے کی کوششیں کیں)

یعنی تم نے امامت ورہبری کے راستے میں انحراف کی بنیاد رکھی اور تم اس انحراف کے واسطے عملی طور پر یہ چاہتے تھے کہ خداوند کے نور۔ امامت۔ کو بجھا دیں۔

"واهماد سنن النبی الصفیّ"

(اور تم نے خدا کے برگزیدہ پیغمبر۔ محمد مصطفی (ص)۔ کے آثار اور سنت کو مٹانا شروع کر دیا ہے)

"اهماد" یعنی بجھانا، مٹانا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم مسند خلافت پر آ بیٹھے تو در حقیقت اسی دن سے تم نے، اسلام کے اعلیٰ اقدار اور رسول خدا (ص) کے آثار کو مٹانا شروع کر دیا ہے تاکہ اسلام کے روشن نور کی روشنی میں کہیں تمہارے مکروہ چہرے پہچانے نہ جائیں اور۔ تمہارے جرائم کی۔ حقیقت حال سے لوگ بے خبر ہی رہیں۔

مکر وفریب کے ذریعے اقتدار پر قبضہ:

"تشربون حسوا فی ارتغاء"

(۔ خلافت کے مفادات سے ۔ تم بڑے آرام سے اور آہستہ آہستہ لطف اٹھا رہے ہو)

" ارتغاء " کالفظ باب افتعال کا مصدر ہے اور اس کی اصل " رَغو، رغو یا رُغو " ہے. دودھ کے جھاگ کو " رغو " کہا جاتا ہے ۔ یہ مکر وفریب کے لئے ایک مثال ہے کیونکہ جب مکھن نکالنے کے لئے مشکیزہ وغیرہ میں دہی ڈال کر اس کو ہلایا جاتا ہے تو کچھ دیر بعد دہی کے اوپر جھاگ ابھر آتی ہے جو بعد میں مکھن کی شکل اختیار کر جاتی ہے ۔ جب کوئی دھوکہ باز شخص کسی کو دھوکہ دینا چاہے تو اس سے کہتا ہے کہ: بھائی تیرے لئے تو یہ مکھن نقصان دہ ہے، لہذا میں پہلے اس جھاگ کو پی لیتا ہوں، آپ بعد میں خالص لسی پیئں، بس جونہی گلاس اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ پوری لسی پی جاتا ہے. " حسو " اس پینے والی چیز کو کہا جاتا ہے جسے آہستہ آہستہ اور مزے سے پیا جائے ۔

یہاں پر آپ ؑ تشبیہ سے استفادہ فرماتی ہیں. عربی زبان میں تشبیہات کا دائرہ بہت وسیع ہے. "تشربون " یعنی تم خلافت کے مفادات سے لطف اندوز ہوتے ہو. " حسوا " یعنی آہستہ آہستہ اس کے تمام فوائد اور ثمرات سے استفادہ کر رہے ہو. " فی ارتغاء " یعنی اس بہانے کے ساتھ کہ ہم صرف ظاہری جھاگ سے اپنی پیاس بجھانا چاہتے ہیں. یعنی ہم مسلمانوں کو در پیش مشکلات اور فتنوں سے نجات دلانا چاہتے ہیں! اس قسم کی تشبیہ اور کنایہ سے حضرت زہراء (ع) کا مطلب یہ ہے کہ تم اسلام، اسلامی نظام کے تحفظ اور پاسبانی کے بہانے سے خلافت پر قابض ہوئے ہو. اسلام کی خدمت کے دعویدار بنے ہوئے ہو اور ایسے الفاظ کی آڑ میں خلافت کے مقام اور اختیارات سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہو اور ہر خشک وتر کی طرف دست درازی کرنے لگے ہو. اس طرح اسلام کی خدمت کے بجائے خلافت سے ذاتی مفادات کے حصول کے لئے کافی استفادہ کر رہے ہو اور تمام اسلامی اقدار کو اپنے اقتدار کے تحفظ اور بقاء پر قربان کر رہے ہو .

دوستی کے انداز میں دشمنی:

" وتمشون لاهله وولده فی الخمرة والضراء "

(درختوں اور زمین کی پستی و بلندی کی آڑ میں ۔ یعنی خفیہ اور آشکار طور پر ۔ اہل بیت (ع) کے خلاف، قدم اٹھا رہے ہو)

دشمن دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک دشمن تو وہ ہوتا ہے جو علی الاعلان دشمنی اور مقابلہ کرتا ہے، دوسرا دشمن جو زیادہ خطرناک ہوتا ہے وہ ہے جو خفیہ طریقے سے اور چھپ کر وار کرتا ہے اور کبھی یہ دوست کی شکل میں آکر موقع پاتے ہی کاری ضرب لگاتا ہے ایسے افراد انسان کے لئے زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں. ابوبکر یہ نہیں کہتا تھا کہ میں اہل بیتؑ کا دشمن ہوں اور ان کی مخالفت کرنا چاہتا ہوں بلکہ بظاہر، باتوں کی حد تک وہ حضرت زہراء (ع) کی تعظیم و تکریم کرتا تھا، لیکن موقع پاتے ہیں کاری ضرب لگا دیتا تھا۔

"وتمشون" "تم قدم اٹھاتے ہو،" "لاهله وولده" "پیغمبر اسلام (ص) کے اہل بیتؑ کے خلاف، لیکن خفیہ اور در پردہ. تم سامنے آکر اپنی دشمنی کا اظہار نہیں کرتے تاکہ کوئی یہ نہ پوچھے کہ تم پیغمبر (ص) کی اکلوتی بیٹی کے مخالف کیوں ہو؟ بلکہ بظاہر تم کبھی دلسوزی اور عقیدت مندی کا اظہار بھی کیا کرتے ہو لیکن حالات کو مناسب پاتے ہیں خنجر گھونپ دیتے ہو۔

" تمشون لاهله وولده فی الخمرة "خمرہ، پردے اور گھنی جھاڑی کو کہا جاتا ہے، دشمن جب آشکار اور سامنے نہ ہو بلکہ اس طرح جھاڑیوں اور گھنے درختوں کے پیچھے چھپا ہوا ہو کہ انسان متوجہ ہی نہ ہو سکے اور اس طرح وہ اپنے رقیب کو غافل کر کے اچانک اس پر حملہ کر دے، تو اس قسم کے حملے کو خمرہ کہا جاتا ہے. اس لفظ کے ذریعے آپؑ یہ بتانا چاہتی ہیں کہ تم گھنی جھاڑیوں کی آڑ میں چھپ کر موقع کی تلاش میں رہتے ہو اور موقع پاتے ہی اہل بیتؑ کو اپنے حملے اور ظلم کا نشانہ بناتے ہو. لفظ "ضراء" کے دو معنی ہیں ایک گھنے درخت اور دوسرے کھڈا اور گڑھا. دشمن حملے کے دوران کبھی درختوں، جنگلوں اور جھاڑیوں سے استفادہ کرتا ہے تو کبھی زمین کے نشیب و فراز سے حملے کے لئے فائدہ اٹھاتا ہے اور پست و گہرے کھڈے اور گڑھوں میں خود کو چھپا لیتا ہے. پس اگر ضراء پہلے معنی میں استعمال ہوا ہو تو یہ لفظ خمرہ کے لئے عطف تفسیری (۱) ہو گا لیکن اگر دوسرا معنی مقصود ہو تو حملے کا مطلب یہ ہو گا کہ تم کبھی گھنے درختوں اور جھاڑیوں میں چھپ کر اور کبھی زمین دوز مورچوں میں گھس کر اہل بیتؑ کے خلاف مصروف

۱۔ وہ کلمہ یا جملہ جو کسی سابقہ جملے کی توضیح یا تشریح کے لئے لایا جائے، عطف تفسیری کہلاتا ہے۔

پیکار ہو (۲) پھر آپ جو ضربیں لگاتے ہیں وہ کس قدر خطرناک ہوں گی؟ جس کی ضرب انسان کے بدن میں چاقو اور تلوار سے زیادہ کاری اور خنجر سے زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہے. اسی لئے آپؑ فرماتی ہیں کہ:

سختیوں پر صبر:

"ونصبر منکم علیٰ مثل حز المدیٰ"

(اور ہم مجبور ہیں کہ۔ تمہارے خنجر کی کاٹ کا صبر سے مقابلہ کریں)

"مدیٰ، مدیہ" کی جمع ہے اور اس کے معنی ہیں خنجر، "حز" کاٹنے اور قطع کرنے کے معنی میں آتا ہے.

آپؑ کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح خنجر جسم کو کاٹتا ہے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے اسی طرح تمہاری طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم بھی ہمارے دل و جگر کو پارہ پارہ کر رہے ہیں، لیکن ہم صبر کر رہے ہیں تاکہ اسلام محفوظ رہے اور اسلام دشمن عناصر کو مفاد پرستی کا موقع نہ ملے۔

" نصبر منکم " تمہارے ظلم و ستم پر ہم صبر کر رہے ہیں. " علی حز المدیٰ " ایسا صبر جو خنجر کی طرح کاٹتا ہے.

" ووخز السنان فی الحشاء "

(اور جس طرح نیزہ کی انی دل و جگر میں چبھا دی گئی ہو)

"وخز" سوئی یا نیزہ کا بدن میں چبھو دینا. "حِشاء، حُشاء" اندرون بدن، سینہ اور پسلیوں کے درمیان موجود اعضائے بدن کو کہتے ہیں۔

ہم تمہارے ظلم و ستم پر اس شخص کی طرح صبر کر رہے ہیں جس کے دل میں نیزہ کی انی چبھو دی گئی

۱۔ ضمرہ، پردہ، کینہ و عداوت، مستی اور گھنی جھاڑیوں کے معانی میں استعمال ہوتا ہے اور ضراء کا ایک معنی، وسیع کھلا میدان بھی ہے. لہذا شاید حضرت زہراءؑ کا مقصد یہ ہو کہ تم نے ہماری دشمنی اور عداوت اور حکومت کی مستی کی وجہ سے ہمارے خلاف وسیع، پیچیدہ اور خفیہ سازش کا جھال بچھایا ہے اور اسی سازش پر عمل کرتے ہوئے تم کبھی آشکار اور کبھی خفیہ طور پر ہمارے خلاف میدان میں آتے ہو. خلافت اور فدک کا غصب اور اسی طرح پھر دوسرے مظالم اس سازش کا ٹھوس ثبوت ہیں.

ہو، اگر ہم تمہاری طرح جاہ طلب اور صرف حکومت کی فکر میں ہوتے اور اسلام کے عظیم تر مفاد کا خیال نہ رکھتے تو شاید تمہارے ساتھ کوئی دوسرا رویہ اختیار کیا جاتا۔

فدک، میراث پیغمبر (ص):

" وانتم الآن تزعمون ان لا ارث لنا، افحکم الجاهلية تبغون "

(اور اب تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم پیغمبر (ص) سے ارث نہیں پاتے،

کیا تم نے جاہلیت کے قانون کو اختیار کر رکھا ہے؟)

تمہارے مظالم میں سے ایک ظلم یہ ہے کہ کہتے ہو کہ ہم۔ خاندان نبوت۔ پیغمبر (ص) سے ارث نہیں پاتے اور پیغمبر (ص) کی طرف جھوٹی نسبت دیتے ہو کہ آپ (ص) نے فرمایا: " نحن معاشر الانبياء لانورث وماترکناه صدقة " (یعنی، ہم انبیاء اپنے بعد ارث نہیں چھوڑتے، جو مال ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے!)۔ حقیقت میں یہ حدیث ابوبکر کی گھڑی ہوئی ہے تاکہ اسی بہانے سے فدک کو حضرت زہراء (ع) سے چھینا جائے۔ اس بارے میں عائشہ، حفصہ اور اوس بن حدثان نے بھی ابوبکر کی حمایت میں یہ گواہی دی کہ ہم نے یہ جملہ خود رسول خدا (ص) سے سنا ہے۔ ان کی اسی ملی بھگت اور غلط نسبت کی وجہ سے حضرت فاطمہ (ع) فرماتی ہیں کہ: " وانتم الآن تزعمون " یعنی تم ابھی یہ گمان کررہے ہو۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ جس کی حقانیت پر تمہیں یقین بھی نہیں۔

"زعم" گمان کو کہتے ہیں یعنی کسی بات کے صحیح ہونے میں انسان کو شک ہو اور اس کی حقانیت پر یقین نہ رکھتا ہو بلکہ شک اور تردد کی حالت میں کوئی بات کہہ دے، یعنی زبان سے ایسی بات کہہ دے جسے دل جھٹلائے یا قبول نہ کرے (۱)۔

۱۔ تاریخ نے یہ بات نقل کی ہے کہ جب ابوبکر کے مرنے کا وقت آیا اور لوگ اس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے تو اس نے فدک غصب کرنے پر انتہائی پشیمانی کا اظہار کیا اور لوگوں سے کہا کہ اپنی بیعت واپس لے لو۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ... خود ابوبکر بھی اس جعلی حدیث کی صحت کے قائل نہ تھا، دوسری بات یہ ہے کہ ابوبکر فدک کے بارے میں حضرت زہراء ؑ کے استدلال اور احتجاج ==

" ان لا ارث لنا " گمان کرتے ہو کہ ہم پیغمبر (ص) سے ارث نہیں پاتے ! " افحکم الجاھلیة تبغون " کیا جاہلیت کے قوانین کو اپنے لئے انتخاب کرتے ہو؟ جاہلیت کے دور میں لڑکیوں کو ارث سے محروم رکھتے تھے ،میں نے کسی زمانے میں کہیں پڑھا تھا کہ برطانیہ میں بھی لڑکیوں کو ارث سے محروم رکھتے تھے اور جائیداد لڑکے کے نام منتقل ہوتی تھی تا کہ لڑکا لارڈ بن جائے، کیونکہ اگر دولت تقسیم کی جاتی تو لارڈ خاندانوں کے لاڈلے مطلوبہ جائیداد نہ ہونے کی بنا پر لارڈ نہیں بن سکتے تھے، بعض قبائلی خاندانوں میں بھی یہ رسم تھی کہ باپ کے باغات سے لڑکی کو ارث نہیں ملتا تھا، دور جاہلیت میں بھی یہی قانون نافذ تھا۔

" ومن احسن من اللّٰہ حکما لقوم یوقنون[1] افلا تعلمون "

(صاحبان یقین کے نزدیک، خدا سے بہتر کون حکم کرتا ہے کیا تم نہیں جانتے ہو)

خداوند بزرگ و برتر نے قرآن میں یہ حکم دیا ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں ارث پاتے ہیں یعنی تمام اولاد ارث کے مالک ہوں گے، یہ ایک قانون کلی ہے قرآن نے کسی بھی جگہ پر یہ نہیں فرمایا کہ لڑکی باپ کے ترکہ سے محروم ہوگی یا یہ کہ قانون ارث سے انبیاء مستثنیٰ ہیں، بلکہ بعض آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دوسرے لوگوں کی طرح انبیاء بھی ارث چھوڑ جاتے ہیں۔ اور ارث لیتے بھی ہیں۔

" بلیٰ قد تجلیٰ لکم کالشمس الضاحیة، انی ابنته "

(ہاں! تم پر آفتاب عالمتاب کی طرح روشن ہے کہ میں ہی پیغمبر خدا (ص) کی بیٹی ہوں)

پس کیوں مجھے ارث سے محروم کررہے ہو؟! تاریخ میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کہ ابو بکر نے ازواج سمیت دوسرے ورثہ کو پیغمبر (ص) کے ترکہ سے محروم کیا ہو، اسی لئے آپؑ فرماتی ہیں کہ ابو بکر کا یہ اقدام قرآنی آیات کی سراسر خلاف ورزی ہے کیونکہ آیات ارث کے عموم میں لڑکی بھی شامل ہے اور

== سے قانع ہوگیا اور اس بات پہ آمادہ ہوگیا کہ فدک کو ارث کے عنوان سے حضرت زہراءؑ کو واپس کر دیا جائے لیکن عمر نے حالات کو بھانپ لیا اور آپؑ کے حق میں فیصلہ دینے سے ابو بکر کو روک دیا۔

۱۔ یہ عبارت مختصر فرق کے ساتھ سورۂ مائدہ کی آیت / ۵۰ سے ماخوذ ہے۔

سب جانتے ہیں کہ میں پیغمبر (ص) کی بیٹی ہوں (۱)۔

"ایھا المسلمون: اغلب علی ارثیه؟"

(اے مسلمانو! کیا میں اپنے ارث کے مسئلے میں بھی مغلوب ہو جاؤں؟)

"علی ارثیه" میں جو "ھاء" ہے وہ "ھاء" سکت ہے (۲) اور قرآن کریم میں بھی اسی ھاء سکت کے ساتھ "کتابیه (۳)" اور "حسابیه (۴)" کے الفاظ آئے ہیں کہ جن میں کتاب اور حساب پر ھاء سکت کا الحاق ہوا ہے (۵)۔

"یابن ابی قحافة: افی کتاب اللّٰہ ان ترث اباک ولا ارث ابی؟!!"

(اے ابی قحافہ کے بیٹے! ۔ ابوبکر سے خطاب ہے۔ کیا کتاب خدا میں یہ بات ہے کہ تم تو اپنے باپ سے ارث لے سکتے ہو اور میں اپنے باپ کا ارث نہیں لے سکتی؟!!) (۶)

۱۔ جناب باقر مقدسی نے اپنی فدک نامی کتاب میں، سید حیدر آمدی کے کشکول سے، امام جعفر صادقؑ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ: امام جعفر صادقؑ نے مفضل بن عمر سے فرمایا کہ: جب ابوبکر کی بیعت ہوگئی تو عمر نے اس سے کہا کہ علیؑ اور اہل بیت رسولؐ سے، خمس، فئ اور فدک کو چھین لے، کیونکہ جب لوگ یہ دیکھیں گے کہ علیؑ اور اہل بیتؑ خالی ہاتھ ہیں تو ان کو چھوڑ دیں گے اور تمہاری طرف آئیں گے! ابوبکر نے ایسا ہی کیا اور اہل بیتؑ کو اپنے حق سے محروم کر دیا!! (فدک، دار المعلم للطباعة ص ۱۷۵)۔

۲۔ سکت، سکوت سے ماخوذ ہے اور اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جب کسی لفظ کو اپنے بعد والے لفظ سے جدا کرنا چاہیں تو پہلے لفظ کے آخر میں ھاء سکت لگا دیتے ہیں، یہ بعض جگہوں میں لازم ہے اور بعض مقام پر جائز ہے۔ اگر لفظ کے آخر میں اضافت کا ایک حرف (مثل یا) ہو، جیسا کہ اس خطبے کے متن میں "ارثیه" کا لفظ آیا ہے تو وہاں ھاء سکت کا اضافہ جائز ہے لازم نہیں۔

۳۔ سورۂ حاقہ / ۱۹ ۔ ۲۵۔

۴۔ سورۂ حاقہ / ۲۰ ۔ ۲۶۔

۵۔ حضرت زہراءؑ، مسلمانوں کے احساسات اور جذبات کو بیدار کرنا چاہتی تھیں اسی لئے فدک کو ارث کے عنوان سے پیش کیا تا کہ رائے عامہ کے سامنے ابوبکر کے غلط افکار کی قلعی کھل جائے، وگرنہ بہت ساری روایات کے مطابق، رسول خداؐ نے اپنی زندگی میں ہی فدک کو بطور بخشش اور ھبہ اپنی اکلوتی بیٹی کو سنبھال دیا تھا۔

۶۔ اس کلام کا پہلا حصہ بھی تمام مسلمانوں سے مربوط ہے کہ اتنے بڑے ظلم کو دیکھتے ہوئے بھی خاموش تماشائی بنے رہے، جبکہ اس جملہ میں ابوبکر کو مخاطب قرار دیا ہے اور اس کے بعد والے جملے میں پھر مسلمانوں کو مخاطب کرتی ہیں کہ: قرآنی احکامات کی تحریف کی جا رہی ہے اور تم خاموش بیٹھے ہو؟!!!

اگر قرآن معیار ہے تو قرآن نے ارث کے مسئلے میں پیغمبر (ص) اور دوسرے افراد میں کوئی فرق نہیں رکھا ہے۔

" لقد جئت شیئاً فریاً۔ علی اللّٰہ و رسولہ۔ "

(بیشک تم نے۔ خدا و پیغمبر (ص) کی طرف۔ ایک آشکار جھوٹی نسبت دی ہے)

" فری " واضح اور آشکارا جھوٹ کو کہا جاتا ہے اور یہ " فری " سے مشتق ہے اور " فری " تہمت اور جھوٹی نسبت دینے کو کہتے ہیں۔

ابو بکر اور اس کے ہمنواؤں نے بھی پیغمبر (ص) کی طرف یہ جھوٹی نسبت دی تھی کہ آپ (ص) نے فرمایا کہ: ہم انبیاء ارث نہیں چھوڑتے، حالانکہ آپ (ص) نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی! بنیادی طور پر یہ بات، قرآنی آیات کی تصریح کے بالکل برخلاف ہے چونکہ ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح انبیاء بھی ارث چھوڑتے ہیں۔

" افعلی عمد ترکتم کتاب اللّٰہ ونبذتموہ وراء ظھورکم "

(کیا جان بوجھ کر کتاب خدا کو چھوڑ چکے ہو اور اسے پس پشت ڈال دیا ہے؟)

قرآن صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ بیٹی باپ سے ارث پاتی ہے اور ارث چھوڑنے اور لینے میں انبیاء اور دوسرے لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہے. (قرآن کی اس صریح دلالت کے مقابلے میں) کیا تم جان بوجھ کر پیغمبر (ص) کی طرف منسوب کر کے جعلی حدیث بنا رہے ہو؟ یا اپنی جہالت کی وجہ سے قرآن کو نظر انداز کر کے ایک من گھڑت روایت کو اپنی سیاست کا محور قرار دے رہے ہو؟!۔

آیات ارث اور انبیاء (ع):

ابو بکر اور دوسروں کی گھڑی ہوئی جعلی حدیث کے مقابلے میں حضرت زہراء (ع) قرآن کی چند آیات سے استدلال فرماتی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انبیاء بھی دوسرے انسانوں کی طرح اپنے بعد ارث چھوڑتے ہیں، لہذا آپؑ فرماتی ہیں کہ:

(۱) "اذ یقول، وورث سلیمان داود (۱)"

(جہاں خداوند فرماتا ہے: اور سلیمان نے داود سے ارث پایا)

(۲) "وقال فیما اقتص من خبر یحیی بن زکریا"

(اور حضرت یحیی بن زکریا کی داستان کے ضمن میں خدا فرماتا ہے)

"اذ قال، فهب لی من لدنک ولیاً یرثنی ویرث من آل یعقوب (۲)"

(جب زکریا نے خدا سے التجا کی کہ پروردگارا! اپنی طرف سے مجھے ایک جانشین عنایت فرما جو مجھ سے اور یعقوب کے خاندان سے ارث پائے)

"ولی" یعنی وہ شخص جو کسی کے پیچھے آئے "ولی میت" کا معنی بھی یہی ہے کہ وہ شخص جو میت کے بعد آئے۔ اور اس کے باقیماندہ کاموں کو پورا کرے۔ "ولایت" اور "تلو" دونوں ایک ہی مادہ سے ہیں "تلو" یعنی وہ چیز جو کسی کے ساتھ رہے، "والی" کو اس لئے والی کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کے ساتھ رہتا ہے اور ان کے اندر موجود کمی کو پورا کرتا ہے، اگر آقا اور بندے، دونوں کو اصطلاح اور بعض روایات میں "مولی" سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں، ولایت کے لفظ کا اصلی معنی ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہے۔ اولاد کو اسی لئے "ولی" کہتے ہیں کہ وہ باپ کے بعد اس کی ذمہ داریوں کو نبھاتی ہیں (۳)۔

مذکورہ آیت میں حضرت زکریا علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: "فهب لی من لدنک ولیا یرثنی ویرث من آل یعقوب" پروردگارا! مجھے اپنی طرف سے ایک ولی عنایت فرما، جو میرا اور آل یعقوب کا وارث بنے۔

حضرت زہراء (ع) نے یہ دو آیات ذکر فرمائیں، چونکہ یہ آیتیں، انبیاء کے ارث چھوڑنے پر دلالت رکھتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ قانون ارث میں انبیاء بھی شامل ہیں، اس کے بعد تین اور آیتیں جو شاہد کے

۱۔ سورۂ نمل / ۱۶۔ ۲۔ سورۂ مریم / ۵۔۶۔

۳۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہونا، ضروریات کو پورا کرنا اور مرنے کے بعد کسی کا میت کے حقوق اور فرائض کو سنبھالنا، یہ تین چیزیں ولایت اور ولی کے اجزائے ترکیبی میں سے ہیں۔

طور پر ذکر فرماتی ہیں، قانون ارث کی عمومیت پر دلالت کرتی ہیں کہ رشتہ دار ایک دوسرے سے ارث پاتے ہیں اور قانون ارث میں کوئی قید اور تخصیص موجود نہیں ہے. آپؑ کا مقصد یہ ہے کہ ان آیتوں کے ذریعے ابوبکر اور دوسرے جعلی حدیثیں بنانے والوں کو رد کریں اور ان کی جھوٹ کی قلعی کھول دیں۔

(۳)" وقال، واولوا الارحام بعضهم اولیٰ ببعض فی کتاب اللّٰہ (۱)"

(اور خداوند ارشاد فرماتے ہے کہ: خدا کی کتاب کی رو سے بعض رشتہ دار دوسرے بعض پر مقدم اور اولیٰ ہیں)

یہ آیت بھی ارث کے قانون کلی پر دلالت رکھتی ہے. حضرت زہراء (ع) اس آیت کے عموم سے استدلال فرماتی ہیں کہ: قانون ارث میں پیغمبر اسلام (ص) اور دوسروں میں کوئی فرق نہیں ہے، لیکن یہ افراد عموم قرآن سے متناقض روایت سے کیوں استدلال کرتے ہیں؟

(۴)" وقال، یوصیکم اللّٰہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین (۲)"

(اور ارشاد ربانی ہے کہ:

تمہاری اولاد کے بارے میں خدا تمہیں یہ وصیت کرتا ہے کہ بیٹے کو دو بیٹیوں کے برابر حصہ دیا جائے)

یہ آیت شریفہ بھی عام طور پر ارث میں بیٹے اور بیٹیوں کے حصے کو مقرر کرتی ہے۔

(۵)" وقال، ان ترک خیراً الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقاً علی المتقین (۳)"

(اور خداوند فرماتا ہے کہ:۔

اگر کسی کے مرنے کا وقت قریب آجائے۔ اور وہ کوئی مال چھوڑ کے جارہا ہو تو اس کو چاہئے کہ اپنے والدین اور رشتہ داروں کے حق میں نیکی۔ کچھ مال انہیں دینے۔ کی وصیت کرے، یہ پرہیزگاروں پر ایک ذمہ داری ہے (۴)"

۱۔ سورۂ انفال / ۷۵۔ ۲۔ سورۂ نساء / ۱۱۔ ۳۔ سورۂ بقرہ / ۱۸۰۔

۴۔ اس آیت میں میت کے اموال کو خیر سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے مال کے بارے میں والدین اور تمام رشتہ داروں کو اصولی طور پر، کسی حد تک ذی حق تسلیم کیا گیا ہے، اگرچہ بعض مفسرین اسے آیات ارث کے ذریعے منسوخ قرار دیتے ہیں، بہرحال اس آیہ کریمہ کی بنیاد پر حضرت زہراءؑ اموال پیغمبرؐ کی بہ نسبت خود کو حقدار سمجھتی ہیں کیونکہ آپؑ یقیناً پیغمبرؐ کی رشتہ دار۔ اور اکلوتی بیٹی تھیں۔ چاہے وہ ارث کے عنوان سے ہو یا کسی اور عنوان سے۔

" وزعمتم ان لاحظوة لی، ولا ارث من ابی ولا رحم بیننا(۱)"

(اور تم نے یہ خیال کیا کہ: ۔ پیغمبر (ص) کے ترکہ میں ۔ میرا کوئی حق نہیں، مجھے اپنے باپ سے ارث نہیں ملے گا اور ہمارے درمیان کوئی رشتہ داری ہی نہیں ہے؟!)

یہاں ایک ادبی نکتہ عرض کروں کہ عربی زبان میں کبھی مضاعف (۲) اور ناقص (۳) ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال ہوتے ہیں. بطور نمونہ قرآن کی یہ آیت: " ما انزلنا علیک القرآن لتشقیٰ (۴) " میں "لتشقیٰ"۔ جو کہ ناقص ہے ۔ اصل میں لتشق تھا. یعنی اصل میں مضاعف تھا اور مضاعف کی جگہ پر ناقص ذکر ہوا ہے. حضرت زہراء (ع) کے کلام میں بھی "حظوة" اصل میں "حظ" تھا یعنی ناقص مضاعف کی جگہ پر آیا ہے البتہ دونوں، حصہ اور فائدہ کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں.

یہاں آپؑ فرماتی ہیں کہ: دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی میرے پدر بزرگوار کا ارث ملنا چاہیے کیونکہ قانون ارث کے عموم میں، میں بھی شامل ہوں، مجھے اس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا، لیکن تم یہ خیال کرتے ہو کہ قانون ارث تو تمہارے لئے ہے اور ہم اس میں شامل نہیں ہیں! لہذا مجھے یہ حق نہیں کہ اپنے باپ سے میراث پاؤں ۔ گویا ہمارے درمیان کوئی رشتہ داری ہی نہیں ہے! ۔

آیات ارث کے سمجھنے میں غلط فہمی کی وجوہات:

(۱) " افخصکم اللّٰہ بآیۃ اخرج ابی ۔ محمد (ص) منہا؟! "

(کیا خدا نے کسی آیہ کو تمہارے ساتھ مخصوص کر دیا ہے اور میرے پدر ۔ بزرگوار محمد (ص) ۔ کو اس سے خارج کیا ہے؟!)

۱۔ ممکن ہے کہ: ۔ یہاں آپؑ گزشتہ تین آیتوں کی تطبیق کرنا چاہتی ہوں اس طرح کہ ۔ "لاحظوۃ لی" کا جملہ آیہ "للذکر مثل حظ الانثیین" کی طرف اور "ولا ارث من ابی" کا جملہ آیہ "ان ترک خیرا..." کی طرف اور "ولا رحم بیننا" کا جملہ آیہ "اولوا الارحام..." کی طرف اشارہ ہو.

۲۔ مضاعف اس لفظ کو کہا جاتا ہے جس کا دوسرا اور تیسرا حرف ایک ہی جنس سے ہو جیسے "مدد" جو ادغام ہو کر "مدّ" بن گیا ہے.

۳۔ ناقص اس کلمہ کا نام ہے کہ جس کے لام الفعل یعنی آخری حرف، حرف علت ہو یعنی واو، یاء اور الف میں سے ایک ہو جیسے رمیٰ.

۴۔ سورہ طہٰ / ۲

(۲) "ام هل تقولون ان اهل الملتين لا يتوارثان ؟!"

(یا یہ کہتے ہو کہ دو دین ومذہب کے ماننے والے ایک دوسرے سے ارث نہیں پاتے ؟!)

جب حضرت زہراء (ع) ان آیات کو لوگوں کے لئے بیان کرنے کے بعد فرماتی ہیں کہ: یہ آیات صراحت کے ساتھ اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ انبیاء بھی دوسرے انسانوں کے طرح ارث چھوڑتے تھے اور قانون ارث، ایک عام قانون ہے، اب بتائیں کہ ان آیات کا آپ کیا جواب دیں گے ؟ کیا یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ آیات مقصود پر دلالت نہیں کرتیں بلکہ یہ صرف امت کے ساتھ مخصوص ہیں اور خود رسول خدا (ص)، خدا کے اس قانون اور حکم سے مستثنیٰ تھے ؟! یا یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرا مذہب اور دین، رسول خدا (ص) کے مذہب اور دین سے الگ ہے۔ یعنی کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ نعوذ باللہ میں اسلام سے پھر چکی ہوں اور اسلام سے خارج ہو چکی ہوں تاکہ تم یہ بتا سکو کہ پیغمبر اسلام (ص) تو مسلمان تھے اور کوئی کافر مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا ؟ اب تم اس بارے میں کیا جواب دو گے ؟۔

" اولست انا وابی من اهل ملة واحدة "

(کیا میں اور میرا باپ ایک ہی مذہب وملت سے تعلق نہیں رکھتے ؟۔ اور کیا ہم دونوں مسلمان نہیں ہیں ؟!۔)

یہ دوسرا فرض مذکورہ فرض کی تشریح ہے کہ مثلاً العیاذ باللہ، آنحضرت (ص) اور حضرت زہراء (ع) ایک مذہب پر ہوں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے درمیان توارث بھی نہ ہو۔

(۳) " ام انتم اعلم بخصوص القرآن و عمومه من ابی وابن عمّی "

(کیا قرآن کے عام اور خاص کے بارے میں

تم میرے والد گرامی (ص) اور چچازاد۔ علیؑ۔ کے مقابلے میں زیادہ علم رکھتے ہو ؟!)

اگر وہ یہ دعویٰ کر دیتے کہ آیات ارث ہمیں قبول ہیں کہ رشتہ دار ایک دوسرے سے ارث پاتے ہیں۔ اور یہ بھی قبول ہے کہ آپؑ اور پیغمبر (ص) ایک ہی دین ومذہب کے پیرو کار ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ آیات ارث کی تخصیص ہوئی ہے۔ اس کا دائرہ محدود کر دیا گیا ہے کہ۔ انبیاء اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں وہ ارث اور میراث نہیں رکھتے بلکہ جو کچھ چھوڑ کے جاتے ہیں وہ صدقہ ہے، لہذا ان کے اس

دعوے کے جواب میں فرماتی ہیں کہ: تم جو یہ دعویٰ کررہے ہو کہ عموم قرآن کی یہاں تخصیص ہوئی ہے تو یہ بتاؤ کہ قرآن کے۔ اسرار و رموز۔ اور عام و خاص کے بارے میں کیا تم، میرے والد گرامی رسول خدا (ص) اور چچا زاد علی علیہ السلام سے زیادہ علم و آگاہی رکھتے ہو؟ کیا۔ یہ ممکن ہے۔ کہ تم اس مخصص کو جانتے ہو لیکن پیغمبر (ص) کے وصی اور بھائی علی (ع) اس سے بے خبر ہیں؟!۔

ارث کے مسئلے پر اتنی تاکید کیوں؟

فدک کو حضرت زہراء علیہا السلام کبھی "نحلہ" یعنی ہبہ و بخشش کے عنوان سے اور کبھی ارث کے عنوان سے یاد فرماتی ہیں۔ منجملہ اسی خطبے کے اس حصے میں آپؑ ارث کے مسئلے پر کافی تاکید فرماتی ہیں اور آیات قرآنی کے ذریعے قانون ارث کی عمومیت کو اس طرح ثابت کرنے پر زور دیتی ہیں کہ اس کی عمومیت میں انبیاء بھی شامل ہیں۔ اس مسئلے پر اتنی تاکید اور اس کو اہمیت دینے کے اسباب میں سے اہم ترین اسباب یہ ہوسکتے ہیں:

۱۔ (مقام نبوت کا دفاع): ابوبکر اور دوسرے چند افراد نے ایک جعلی حدیث گھڑلی اور اس کی نسبت رسول خدا (ص) کی طرف دے دی،۔ وہ جعلی حدیث کچھ یوں تھی۔ "ہم انبیاء ارث نہیں چھوڑتے بلکہ جو کچھ ہم چھوڑ کے جاتے ہیں وہ صدقہ ہے"۔ چونکہ یہ جعلی حدیث، ارث سے مربوط آیات قرآنی کے سراسر خلاف تھی اور پیغمبر اکرم (ص) جیسی عظیم شخصیت کی طرف ایسی حدیث کی نسبت دینا آپ (ص) کے اوپر سراسر ظلم اور ناانصافی تھی۔ لہذا حضرت زہراء (ع) نے آیات قرآنی کے حوالے سے سب سے قبل یہ ثابت کیا کہ یہ حدیث جعلی ہے۔

۲۔ (دشمن کی دلیل کا توڑ): ابوبکر اور عمر فدک کے بارے میں اسی جھوٹی حدیث کا حوالہ دے کر ارث کے مسئلے کو اچھال رہے تھے اور کہتے تھے کہ خود رسول خدا (ص) نے فرمایا کہ ہم ارث نہیں چھوڑتے، بنابریں فدک تمام مسلمانوں کی ملکیت ہے اور حضرت زہراء (ع) اس پر کوئی حق نہیں رکھتی ہیں، لہذا آپؑ نے چاہا کہ خود ان کی اپنی دلیل سے ہی ان کو رسوا کریں، اور آپؑ فرماتی ہیں کہ۔ کیا تم

قبول کرتے ہو کہ فدک رسول (ص) کے زمانے میں فئ مسلمین میں شامل نہیں تھا اور رسول خدا (ص) کی ملکیت تھی اور ابھی قرآن کی آیات کے مقابلے میں تم ایک جھوٹی حدیث نقل کر رہے ہو تو جان لو کہ۔ تمہاری یہ باتیں، نص قرآن کے خلاف ہیں اور حقیقت میں تم قرآن اور حق کی راہ سے منحرف ہو چکے ہو اور اپنے سیاسی مفادات کی خاطر، حدیث گھڑنے۔ کے مذموم فعل۔ کے مرتکب ہوئے ہو[1]۔

ارث سے آپ(ع) کی مراد کیا ھے؟

ارث سے مربوط آیات سے تمسک کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کی مراد وہی اصطلاحی ارث ہے۔ جو ماں باپ کے مرنے کے بعد انسان کو ملتا ہے۔ لیکن ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ارث کے لفظ سے آپؑ کا ہدف صرف اصطلاحی اور فقہی کتابوں میں مذکور ارث نہ ہو بلکہ ہر وہ چیز ہو جو ماں باپ کی طرف سے اولاد کو ملتی ہے، چاہے ان کی زندگی میں ہبہ و بخشش کی شکل میں دی گئی ہو یا ان کی دفات کے بعد ارث اور ترکہ کے عنوان سے ملتی ہو. حقیقت حال بھی یہی ہے کہ آپؑ کا مقصد صرف فقہی کتابوں میں مذکور ارث نہیں ہے بلکہ اس سے وسیع تر معنی میں آپؑ نے ارث کے لفظ کو استعمال کیا ہے اور نحلہ وہبہ بھی اس میں شامل ہے. اس طرح آپؑ کے کلمات میں جو تضاد دکھائی دیتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اس خطبے کی ایک جگہ پر فدک کو ہبہ اور نحلہ کے طور پر اور خطبے کے بعد والے حصے میں ارث کے عنوان سے یاد فرماتی ہیں، اس سے بظاہر تضاد نظر آتا ہے۔ لیکن جب ہم ارث کو اپنے وسیع اور کلی مفہوم میں لیں اور یہ کہیں کہ آپؑ کا مقصد ہر وہ چیز ہے جو ماں باپ کی طرف سے اولاد کو ملتی ہے، چاہے وہ زندگی میں ہو یا ان کی دفات کے بعد، تو اس صورت میں ارث کے معنی میں "نحلہ" اور فقہی کتابوں میں مذکور "ارث" دونوں شامل ہو جاتے ہیں۔

---

[1]۔ علامہ مجلسیؒ اس سلسلے میں فرماتے ہیں کہ "آپؑ نے فدک کے ہبہ ہونے کا دعویٰ فرمایا، آیات قرآن پیش کیں اور حضرت علیؑ۔ اور ام ایمن۔ نے گواہی دی لیکن ابو بکر نے اسے رد کر دیا، لہذا آپؑ نے ارث کے مسئلے کو، ضروریات دین میں سے ایک کے عنوان سے پیش کیا اور اس مسئلہ پر قرآنی آیات سے استدلال فرمایا تاکہ ابو بکر کے لئے انکار کے دروازے بند ہو جائیں.

بحار الانوار۔ طبع قدیم۔ ج ۸ ص ۱۲۰.

البتہ کچھ شواہد ایسے بھی ہیں جو اس بات کی تائید کرتے ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ شیعہ اور سنی دونوں نے نقل کیا ہے کہ جب آیہ " وآت ذا القربیٰ حقّه (۱) " (یعنی اے رسول! قریبی رشتہ داروں کا حق ادا کر دو)، نازل ہوئی تو رسول خدا (ص) نے حضرت زہراء (ع) کو بلا کر انہیں فدک عنایت فرمایا (۲)۔

پیغمبر خدا (ص) کے اپنی حیات میں فدک، حضرت زہراء (ع) کو بخشنے اور ان کے حوالے کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کی، لفظ ارث سے مراد، وہ ارث نہیں ہے جو ہمارے درمیان مشہور ہے، کیونکہ اگر آپؑ کا مقصد، اصطلاحی ارث ہوتا تو رحلت پیغمبر (ص) کے بعد فدک آپؑ کو مل جاتا، حالانکہ رسول خدا (ص) نے اپنی حیات طیبہ میں، رحلت سے چند سال پہلے ہی، فدک حضرت زہراء کو بخش دیا تھا۔

۲۔ ایک دوسری روایت میں ذکر ہوا کہ: ایک دن امیر المؤمنین علیہ السلام ابوبکر پر وارد ہوئے، ابوبکر مسجد میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ارد گرد مہاجرین وانصار کا ایک گروہ بیٹھا ہوا تھا اس وقت امیر المؤمنین (ع) نے ابوبکر کو مخاطب کر کے فرمایا: " یا ابابکر! لم منعت فاطمه میراثها من رسول الله وقد ملکته فی حیاة رسول الله؟ (۳) " (اے ابوبکر! فاطمہ زہراء (ع) کو پیغمبر (ص) کی میراث سے کیوں روکا ہے حالانکہ فاطمہ (ع) پیغمبر خدا (ص) کی زندگی میں ہی اس کی مالک تھیں) یہاں، حضرت علی (ع) ایک ہی عبارت اور جملہ میں لفظ ارث کو استعمال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پیغمبر خدا (ص) کی زندگی میں ہی حضرت زہراء (ع) فدک کی مالک تھیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی (ع) کے کلام میں ارث سے مراد صرف وہ ارث نہیں ہے جو ہم سمجھتے ہیں۔ کہ جو ماں باپ کے مرنے کے بعد اولاد کو ملتا ہے بلکہ یہ لفظ اس سے کہیں وسیع تر معنی رکھتا ہے اور والدین کی زندگی میں دی جانے والی چیزوں کو بھی ارث کہا جاتا ہے۔ اگر آپؑ کا مقصد اصطلاحی ارث ہی ہوتا تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ رحلت پیغمبر (ص) کے بعد فدک حضرت زہراء (ع) کو ملے، حالانکہ حضرت علی (ع) فرماتے ہیں کہ: " قد ملکته فی حیاة رسول

۱۔ سورۂ اسراء (بنی اسرائیل) / ۲۶۔

۲۔ مزید اطلاع کے لئے " دراسات فی ولایة الفقیه وفقه الدولة الاسلامیة " ج ۳ ص ۳۲۹ کے بعد کے صفحات کی طرف رجوع کریں۔

۳۔ الاحتجاج ج ۱ ص ۲۳۷۔

اللہ "یعنی پیغمبر(ص) کی حیات طیبہ ہی میں حضرت زہراء(ع) فدک کی مالک تھیں.

۳۔ تاریخ گواہ ہے کہ فدک کے علاقے میں حضرت زہراء(ع) کی طرف سے چند مزدور اور کاشتکار متعین تھے ،جب ابوبکر نے آپ ؑ سے فدک چھیننے کا فیصلہ کیا تو اس نے اپنے چند آدمیوں کو بھیجا تاکہ وہ حضرت زہراء(ع) کے کاشتکاروں کو وہاں سے نکال دیں!

۔تاریخ کی اس گواہی سے ۔یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ،پیغمبر اکرم(ص) کی وفات سے پہلے ہی فدک حضرت فاطمہ زہراء(ع) کے قبضے میں تھا ،ایسی بات نہیں تھی کہ رسول خدا(ص) کی رحلت کے بعد آپ ؑ کو فدک ملا ہو(۱)۔

ان شواہد اور قرائن کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ،خطبے میں موجود ارث کے لفظ سے اصطلاحی ارث مراد نہیں ہے جو باپ کے انتقال کے بعد اولاد کو ملتا ہے اس سے ہر وہ چیز مقصود ہے جو والدین کی جانب سے اولاد کو ملتی ہے ،چاہے وہ ان کی زندگی میں اولاد کو ملے یا ان کے مرنے کے بعد۔اس مطلب پر اہل عرف کا روزہ مرہ کا استعمال بھی شاہد ہے مطلب واضح ہونے کیلئے ہم ایک مثال دیتے ہیں کہ :جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں صاحب کو ذہانت اور صلاحیت اپنے باپ سے ورثے میں ملی ہے یا یہ کہ ،شجاعت اور دلیری اس کو اپنے باپ سے میراث میں ملی ہے تو ان دو مثالوں سے یہ مراد نہیں ہے کہ باپ مرگیا ہو اور بیٹے کو ذہانت ،صلاحیت اور شجاعت ترکہ میں ملی ہو ،بلکہ مقصود یہ ہے کہ اگرچہ اس کا باپ زندہ ہے لیکن اس کو باپ کا ہوش اور اس کی صلاحیت ،میراث میں ملی ہے ،یعنی باپ کے نطفے میں جو

۱۔ ممکن ہے کوئی یہ اعتراض کرے کہ حضرت زہراء ؑ کی طرف سے جو مزدور اور کاشتکار وہاں متعین تھے شاید وہ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد آپ ؑ نے متعین فرمائے ہوں .یعنی رحلت پیغمبرؐ کے فوراً بعد آپ ؑ نے اپنے مزدور بھیج کر قبضہ کیا ہو اور اپنی ملکیت میں شامل فرما لیا ہو ،اس طرح خطبے میں ارث سے مراد اصطلاحی ارث ہو تو اس میں کیا اعتراض ہے؟

اس اعتراض کے جواب میں یہ کہنا چاہئے کہ ،پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے فوراً بعد فدک غصب کیا گیا ہے اور یہ بعید نظر آتا ہے کہ حضرت زہراء ؑ نے ان بحرانی دور اور مصیبت کے ایام میں ،فدک کے وسیع علاقے کے لئے کاشتکار پیدا کرکے وہاں بھیجے ہوں.

اس کے علاوہ شیعہ سنی روایات اس بات پر تصریح کرتی ہیں کہ رحمۃ للعالمینؐ نے اپنی زندگی میں ہی فدک حضرت زہراء ؑ کو بخش دیا تھا اور آپ ؑ نے اپنے بابا کی زندگی میں ہی فدک پر قبضہ کرکے وہاں اپنی طرف سے نمائندے اور کاشتکار معین فرمادیئے تھے .

سلوّل "Cellule" تھے وہ اس بات کا سبب بنے ہیں کہ باپ کی صلاحیتیں بیٹے میں منتقل ہوجائیں، ان مثالوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہر اس چیز کو ارث کہا جاتا ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہوجائے، خواہ وہ پہلی نسل کی زندگی میں ہی کیوں نہ ہو(۱)۔

حضرت زھـراء(ع) کی ابوبکر کو وارننگ:

حضرت زہراء (ع)۔ ابوبکر کو اس خیانت کے انجام بد سے خبردار کرتے ہوئے۔ خطبے کو آگے بڑھاتی ہیں کہ:

" فدونکھا مخطومة مرحولة تلقاک یوم حشرک "

(پس۔اے ابوبکر۔فدک۔کی اس اونٹنی۔کو لے لو،حالانکہ اس کی نکیل تمہارے ہاتھ میں ہے اور اس پر کجاوہ کس دیا گیا ہے۔یہاں تک کہ۔تم سے قیامت کے دن ملاقات کرے)

۱۔ آیت اللہ شہید صدرؒ اپنی " فدک " نامی کتاب میں فرماتے ہیں کہ: میراث سے مراد وہی اصطلاحی میراث ہے اور اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ دوسرے علماء کی طرح یہ کہیں کہ: آپؑ نے پہلے فدک کو نحلہ یا ہبہ کے عنوان سے یاد فرمایا اور بعد میں۔ جب اسے رد کیا گیا تو۔ فدک پر ارث کا دعویٰ فرمایا بلکہ طبیعی ترتیب یہ ہے کہ " پہلے حکمرانوں کے ساتھ سیاسی جدوجہد میں، ارث کے مسئلے کو پیش کیا جائے جو اسلام کے قطعی احکامات میں سے ایک ہے تا کہ اس کے ذریعے اپنے غصب شدہ حق کو واپس لے سکیں کیونکہ میراث میں، فدک، خمس اور پیغمبر کا کل ترکہ شامل ہے، جبکہ ہبہ کا دعویٰ تو صرف فدک تک ہی محدود ہے لہذا پہلے مرحلے میں کامیاب نہ ہونے کی صورت میں ہبہ ہونے کے اعتبار سے فدک کے مسئلے کو اٹھایا جائے... " فدک فی التاریخ ص ۸۷.

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ: فدک ایک یہودی نشین علاقہ تھا جو اسلحہ اور طاقت (لشکر کشی) کے ذریعے فتح نہیں ہوا تھا بلکہ وہاں کے یہودیوں نے پیغمبرؐ کے حوالے کر دیا تھا اور اکثر فقہاء کے نزدیک ایسی زمینیں خود پیغمبر اکرمؐ کی ملکیت ہوتی ہیں نہ کہ تمام مسلمانوں کی، بنابریں فدک پر قانون ارث لاگو ہوتا ہے کیونکہ پیغمبرؐ کی زوجات، خود زمین سے ارث نہیں پاتیں اور اس قسم کے اموال کی وارث خود بخود حضرت زہراءؑ بن جاتی ہیں، البتہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ " خالصہ جات " یعنی وہ تمام اموال جو بغیر کسی جنگ کے، مصالحت کے ذریعے پیغمبرؐ کے ہاتھ آئے ہوں وہ سب، پیغمبر اکرمؐ کے مقام، منصب اور زعامت کے ساتھ مخصوص ہوں اور پیغمبرؐ کے بعد ان کو برحق حکومت الٰہیہ کے اختیار میں ہونا چاہیے تھا اور اس الٰہی حکومت۔ کا امین اور سربراہ۔ حضرت علیؑ اور پیغمبرؐ کے خاندان عصمت وطہارت کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ فدک کے مسئلے میں حکمران ٹولے پر حضرت زہراءؑ کا اعتراض بھی درحقیقت امامت اور امت کی =

اس وقت عربوں کی زندگی میں اونٹ کی بہت اہمیت تھی اور ان کی زندگی اونٹ سے ہی وابستہ تھی، اسی لئے عربی زبان میں بہت ساری چیزوں کو اونٹ سے تشبیہ دیا جاتا ہے۔

حضرت زہراء (ع) بھی یہاں فدک کو ایک ایسے اونٹنی سے تشبیہ دیتی ہیں کہ جس کے ناک میں نکیل اور پشت پر کجاوہ کس کر سواری کے لئے آمادہ کیا گیا ہے، چونکہ عرب لوگ اونٹ پر سوار ہوتے وقت اس کو نکیل بھی ڈالتے تھے اور پالان بھی کس دیتے تھے، جہاں آپؑ ابوبکر سے خطاب کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ: اے ابوبکر! سواری کے لئے آمادہ۔ فدک کی۔ اس اونٹنی کو لے لو اور اس پر سوار ہوکر جس قدر چاہتے ہو سواری کرو اور اسے دوڑاؤ اور اس سے استفادہ کرو! ۔ اور یہ جان لو کہ۔ قیامت نامی ایک چیز بھی ہے وہاں تمہارے امور کا حساب وکتاب ہوگا۔

"فدونکہا" دونک اسم فعل(۱) ہے اور اس کا معنی دھمکی کے ساتھ امر کرنا ہے یعنی۔ ابھی۔ اس کو لے لو۔ بعد میں پتہ چلے گا۔ یہاں جو "ھاء" کی ضمیر ہے وہ فدک کی طرف پلٹتی ہے، یعنی فدک کو لے لو۔ ابھی فدک پر قبضہ کرلو۔ "مخطومة، خطام" کا اسم مفعول ہے اور خطام، نکیل کو کہا جاتا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ اس حال میں کہ فدک کے اونٹ کی نکیل تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ "مرحولہ" رحل کا اسم مفعول ہے۔ رحل پالان، کجاوہ کو اور "مرحولہ" کجاوہ لگاکر سواری کے لئے آمادہ اونٹنی کو کہا جاتا ہے۔ "تلقاک یوم حشرک" اس وقت حشر کے دن تم سے ملاقات کرے گی، یعنی تجھے قیامت کے دن فدک کے بارے میں جواب دینا ہوگا۔

"فنعم الحکم اللّٰہ"

(پس خدا بہترین فیصلہ کرنے والا اور حاکم ہے)

وہاں خداوند متعال قاضی ہوگا، وہاں تو غلط پروپیگنڈہ اور سازش نہیں کرسکے گا اور وہاں خدا خود

== سربراہی اور سرپرستی کے غصب پر احتجاج تھا، وہی مقام امامت حقہ کہ جس کے ہاتھ میں فدک کا ہونا بھی لازم تھا۔ ابوبکر نے اس پر ناجائز قبضہ جمالیا اور مغالطہ کےذریعے خود کو حکومت حقہ الٰہیہ کا مصداق قرار دیا اور لوگوں کو بھی اسی پر فریب استدلال کےذریعے، خاموش کردیا۔

۱۔ اسم فعل ایسے کلمات کو کہتے ہیں جو لفظ کے اعتبار سے اسم ہو مگر فعل کا معنی دیتا ہے۔

ہمارے درمیان فیصلہ کرے گا۔

" والغریم-الزعیم-محمد(ص) "

(اور اس دن مدعی۔ یا رہبر۔ حضرت محمد (ص) ہوں گے)

یہ جملہ، دو طرح سے نقل ہوا ہے۔ بعض نسخوں میں "الزعیم" اور دوسرے بعض نسخوں میں "الغریم" ذکر ہوا ہے۔ "زعیم" یعنی رہبر اور پیشوا، یعنی قیامت کے دن پیشوا اور رہبر محمد مصطفیٰ (ص) ہوں گے اور تجھے اس کے اہل بیتؑ پر ڈھائے گئے مظالم کا جواب دینا ہوگا۔ "غریم" طلب کرنے والا، مدعی، یعنی قیامت کے دن تمہارے مقابلے میں رسول خدا (ص) ہوں گے جو۔ خدا کی عدالت میں۔ تم سے پوچھیں گے کہ فدک کو جسے میں نے اپنی بیٹی کو بخشا تھا تم نے کیوں غصب کیا؟ اس وقت تم جوابدہ ہو گے۔

" والموعد القیامۃ "

(ہماری ملاقات کا وقت قیامت کا دن ہوگا)

ممکن ہے ان دو جملوں کی ابتداء میں بھی نعم کا لفظ موجود ہو تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ پیغمبر اکرم (ص) کتنے اچھے مدعی یا رہبر ہوں گے اور قیامت کا دن کتنا اچھا ملاقات کا وقت ہوگا، کیونکہ قیامت کے روز عدالت میں، محمد مصطفیٰ (ص) جیسی شخصیت کے سامنے بغیر کسی تحریف کے تمام حقائق صاف اور آشکار ہوجائیں گے۔

" وعند الساعۃ یخسر المبطلون "

(اور قیامت کے دن، اہل باطل، نقصان اٹھائیں گے)

"خسران" اصلی سرمایہ کو نقصان پہنچے تو اسے خسران کہا جاتا ہے۔ پس اہل باطل جنہوں نے زندگی کی تجارت سے۔ نہ صرف کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ۔ ایمان۔ کے اصلی سرمایہ سے بھی محروم ہوگئے ہیں یہ لوگ واقعی خسران کا شکار ہوئے ہیں۔ یہاں حضرت زہراء (ع) سورۂ جاثیہ کی آیت / ۲۷ پر نظر رکھتی ہیں اور سقیفہ کے جیالوں کو اس آیت شریفہ کا مصداق قرار دیتی ہیں کہ قیامت کے دن تم متوجہ ہو گے کہ خسران عظیم سے دوچار ہو چکے ہیں۔

"ولا ینفعکم اذ تندمون"

(اس دن جس قدر پشیمانی کا اظہار کرو گے کوئی فائدہ نہیں ہو گا)

یہاں اصحاب سقیفہ اور ابوبکر کے حامیوں کو قرآن کی چند آیتوں کے ذریعے خبردار کرتی ہیں۔

"ولکل نبـاء مستقر (۱)"

(ہر خبر۔ حادثہ۔ کے لئے ایک قرار گاہ اور ٹھہرنے کا مقام ضروری ہے)

"وسوف تعلمون من یاتیہ عذاب یخزیـہ (۲)"

(اور عنقریب معلوم ہو گا کہ۔ خدا کا۔ رسوا کن عذاب، کس پر نازل ہو گا)

یہ آیت اصل میں قوم نوح علیہ السلام سے مربوط ہے۔ حضرت نوحؑ اپنی قوم کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں کہ عنقریب معلوم ہوجائے گا کہ ہم میں سے کس پر عذاب نازل ہو گا، ایسا عذاب جو ذلیل ورسوا کردے۔

مفسرین کا کہنا ہے کہ "عذاب یخزیہ" سے مراد وہی دنیوی عذاب ہے جو طوفان کی شکل میں قوم نوحؑ پر نازل ہوا تھا اور مذکورہ جملہ کے بعد آپؑ جو یہ فرماتی ہیں کہ "ویحل علیہ عذاب مقیم" قیامت کے عذاب سے مربوط ہے، کیونکہ قیامت کے عذاب میں کفار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔

"ویحـل علیہ عـذاب مقیم (۳)"

(اور کس پر ہمیشہ رہنے والا عذاب نازل ہو گا)

سقیفہ والوں کو قوم نوحؑ سے تشبیہ دینے کی علت شاید یہ ہو کہ جس طرح قوم نوحؑ دنیا وآخرت دونوں میں عذاب خداوندی میں مبتلا ہوئی اسی طرح سقیفہ کے باغیوں پر قیامت کا دائمی عذاب نازل ہو گا اور ساتھ ساتھ دنیا میں بھی وہ ذلت ورسوائی سے دوچار ہوں گے۔

۱۔ یہ جملہ سورۂ انعام کی آیت / ۶۷ سے ماخوذ ہے۔ شاید اس سے مراد، قیامت کے حتمی عذاب کا وعدہ ہو، کیونکہ قیامت کے دن دنیا کے حوادث اور کاموں کا تسلسل ختم ہوجائے گا ہر چیز اور حادثے کا پنے منطقی انجام کو پہنچ کر تسلسل، رک جاتا ہے۔ حضرت زہراءؑ یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ یہ تمہارے مظالم، ریاست اور حکومت ایک دن نابود ہوجائیں گے اور ہر چیز کی واقعیت جیسا کہ وہ ہے ظاہر ہوجائے گی۔

۲۔۳۔ سورۂ ہود آیت ۳۹ سے ماخوذ ہے۔

اگر ماضی اور حال میں مسلمانوں کی بدبختی اور ذلت کے علل واسباب کی صحیح اور دقیق جستجو کی جائے تو معلوم ہو گا کہ ان تمام بدبختیوں اور مشکلات کی جڑیں، صدر اسلام میں رونما ہونے والے حادثات، امامت کے مسئلے میں انحراف اور اس کے بعد کے واقعات میں پائیں گے۔ دوسرے الفاظ میں ان تمام بدبختیوں اور گمراہیوں کا اصلی سبب، امامت کے خلاف سقیفہ میں رونما ہونے والی بغاوت ہی نظر آئے گی۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آٹھواں درس:

- انصار سے کچھ باتیں
- سیاست اور موقف میں تبدیلی
- رحلت رسول (صلّی اللّٰہ علیہ وآلہ) کے معاشرتی اثرات
- قرآن میں رحلت رسول (ص) کی پیش گوئی
- خدا کا قانون موت اور انبیاء (ع)
- انصار سے حضرت زہراء (ع) کا شکوہ
- انصار کی مجاہدانہ خدمات

ثُمَّ رَمَتْ بِطَرْفِها نَحْوَ الْأَنْصارِ فَقالَتْ [لَهُمْ]:

يا مَعْشَرَ النَّقيبَةِ [الْفِتْيَة] [الْبَقِيَّة] وَ أَعْضادَ الْمِلَّةِ وَ حَضَنَةَ الْإِسْلامِ، ما هذِهِ الْغَميزَةُ في حقّي و السِّنَةُ عَنْ ظلامتي؟ أَما كانَ رَسُولُ الله ﷺ أبي يَقُولُ: «الْمَرْءُ يُحْفَظُ في وُلْدِهِ»؟ سَرْعانَ ما أَحْدَثْتُم وَ عَجْلان ذا إهالَة، ولَكُمْ طاقَة بِما أحاول، وَقوَّة على ما أطلب، و أزاول؛ أتقُولُونَ ماتَ مُحَمَّدٌ ﷺ؟ فَخطب جَليل، إسْتَوْسَعَ وَهْنه وَاسْتَنْهَر فتقه وَ انْفَتق رتقه و اظلمت الأَرْضُ لِغيبَتِه، و كسفت الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ، وَ انتثرت النُّجُوم لِمُصيبَتِهِ، وَ اكدت الآمال، و خَشَعَتِ الْجِبال، وَ اضيع الحَريم، و أزيلت الحُرْمَة عِنْدَ مَماتِهِ، فَتِلْكَ وَاللهِ النّازِلَة الكُبْرى، وَ المُصيبَة الْعُظْمى، لا مِثْلها نازِلَة، وَ لا بائقة عاجلة، أعْلَنَ بِها كتابُ اللهِ جَلَّ ثَناؤُه في أَفْنِيَتِكُمْ، في مَمْساكُمْ وَ مصبحكم، هتافاً و صراخاً، و تلاوةً و أَلحاناً؛ و لقبله ما حَلَّ بِأنْبِياءِ الله وَ رُسُله، حكم فصل و قضاء حتم: ﴿وَ ما مُحَمَّدٌ إلاّ رَسولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُل أَفَإنْ ماتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلى أَعْقابِكُمْ وَ مَنْ يَنْقَلِب عَلى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّالله شَيْئاً وَ سَيَجْزِي الله الشّاكِرينَ[1]﴾

إيهاً بَني قيلَة! أأُهضم تراث أبي؟ وَ أَنْتُمْ بِمَرْءىً مِنّي وَ مَسْمَع، وَ مُنْتَدىً وَ مجمع؛ تلبِسُكُمُ الدَّعْوَة، و تشملكم الْخبرة و أَنْتُمْ ذوو العَدَد و العُدَّة، و الأَداةِ وَ الْقُوَّة، وَ عِنْدَكُمُ السِّلاح وَ الجُنَّة؛ توافيكُمُ الدَّعْوَة فلاتجيبون، وَ تَأْتيكُمُ الصرخة فلاتغيثون، وَ أنْتُمْ موصوفون بالكفاح، مَعْرُوفون بِالْخَيْرِ وَ الصَّلاح، وَ النُخْبَة الّتي انتخبت، وَ الخِيَرَة الّتي اختيرت لَنا أَهْلَ الْبَيْتِ.

قاتَلْتُمُ الْعَرَب، وَ تَحَمَّلْتُمُ الكَدَّ وَ التَّعَب، وَ ناطَحْتُمُ الأُمَم وَ كافَحْتُم البُهم؛ لانَبْرَحُ أَوْ تبرَحُون، نَأْمُرُكُمْ فَتأْمرون.

***

---

۱. آل عمران: ۱۴۴.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبہ نستعین

انصار سے کچھ باتیں:

حضرت زہراء (ع) نے مسجد میں ابوبکر اور اس کے پاس موجود لوگوں کو اپنے مستدل اور عتاب آمیز خطاب کے بعد، انصار کو مخاطب کرکے چند باتیں بیان فرمائیں. شاید کہ وہ بیدار ہوجائیں اور حالات کی گہرائیوں کو درک کرسکیں۔

" ثم رمت بطرفہا نحو الانصار "

(پھر آپ (ع) انصار کی طرف متوجہ ہوئیں)

"طرف" آنکھ اور دیکھنے کے بعد آنکھ بند کرلینے کے معنی میں آتا ہے. اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار مسجد کے ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے اور آپؑ ان کی طرف متوجہ ہوئیں اور انہیں مخاطب قرار دے کر فرمایا کہ:

" فقالت لہم۔ یامعشر النقیبۃ۔ الفتیۃ، البقیۃ۔ "

(پھر ان سے فرمایا کہ: اے وہ گروہ جو صاحب نفوذ حضرات۔ جوانمرد حضرات، گزرے ہوئے لوگوں کی یادگار حضرات)

آپؑ کا یہ کلام تین طرح سے نقل ہوا ہے. بعض نسخوں میں " النقیبۃ " بعض میں " الفتیۃ " اور بعض نسخوں میں " البقیۃ " ذکر ہوا ہے.

اگر "یامعشر النقیبة" صحیح ہو تو اس کے معنی ہوں گے کہ اے صاحب نفوذ اور با اثر جماعت، "نقباء کا بھی یہی معنی ہے۔" الفتیة " کا معنی بھی جوانان اور جوانمرد حضرات ہے جبکہ اگر " البقیة " صحیح ہو تو یہ معنی ہو گا کہ اے گزشتہ لوگوں کی یادگار جماعت، کیونکہ مسلمانوں اور انصار کے بعض لوگ یا تو فوت ہو چکے تھے یا شہادت کے عظیم مرتبہ پر فائز ہو چکے تھے اور جو زندہ تھے وہ ان کی یادگار شمار ہوتے تھے.

بہرحال آپؑ انصار کی طرف متوجہ ہوئیں اور انہیں مخاطب کر کے فرمایا: اے با اثر گروہ، اے جوانمرد گروہ اور اے گزرے ہوئے لوگوں کی یادگار.

" واعضاد الملة "

(اور۔ اے دین وشریعت کے بازو)

" اعضاد " عضد کی جمع ہے اور عضد کا معنی ہے بازو. انصار کو شریعت اسلام کے قوی بازو اس لئے قرار دیا کہ انسان اپنی طاقت وقدرت کو بازو کے ذریعے استعمال کرتا ہے اور اسی بازو کے ذریعے انسان اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اور انسان پر ہونے والے حملوں اور دوسرے ضروری حالات میں بازو اس کی مدد کرتا ہے۔ یہاں حضرت زہراء (ع) انصار سے فرماتی ہیں کہ تم ہی تھے جو دین وشریعت کے بازو کی حیثیت سے اسلام کا دفاع اور اس کی مدد کرتے تھے.

" وحضنة الاسلام "

(اے، اسلام کو پناہ دینے والو، اور اسلام کے محافظو!۔)

" حضن اور حصن " پناہگاہ کو کہتے ہیں۔" حق الاحتضان " بھی اسی وجہ سے ہے یعنی بچے کو پناہ دینے اور اس کی حفاظت کا حق.

حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ اسلام تمہاری پناہ اور تمہارے ہی دامن میں پروان چڑھا ہے اور پیشرفت کی ہے، کیونکہ انصار اسلام کی حفاظت کا سبب بنے تھے انہوں نے پیغمبر (ص) کے ساتھ عہد وپیمان باندھا اور پیغمبر (ص) کو مدینہ آنے کی دعوت دی اور پہلی بار اسلامی حکومت تشکیل دی، در اصل

انصار کا ایثار و قربانی ہی تھا کہ جس کی وجہ سے مسلمان اس قابل بنے کہ اسلام کے نوخیز پودے کو تناور درخت میں تبدیل کریں. اسی وجہ سے آپؑ ان کو خطاب کرکے فرماتی ہیں کہ: " وحضنة الاسلام " یعنی، اے وہ گروہ اور جماعت، جس نے اسلام کو پناہ دی اور اسلام نے تمہارے دامن میں ترقی کی اور وسعت پائی.

" ما ھذہ الغمیزۃ فی حقی؟ "

(۔ پیغمبر (ص) کے ساتھ اتنے وفادار ہوتے ہوئے۔ میرے حق میں یہ کمزوری کیوں؟)

" غمیز " یعنی کمزوری. یہاں حضرت زہراء (ع) انصار کی توبیخ اور سرزنش کرتی ہیں کہ جب میری باری آئی اور مجھ پر ظلم ہوا تو تم نے کمزوری کا مظاہرہ آخر کیوں کیا؟ حالانکہ تم اسلام کے قوی بازو تھے، اسلام نے تمہارے دامن میں پرورش پائی تھی، تم ہمیشہ رحمۃ للعالمین (ص) کے فرمانبردار رہتے تھے، لیکن ابھی اپنے پیغمبر (ص) کی عترتؑ پر یہ سارے ظلم ہو رہے ہیں لیکن تم خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہو! آخر یہ خاموشی کیوں؟ حریم اہل بیت (ع) سے دفاع کیوں نہیں کرتے ہو؟!.

" والسنة عن ظلامتی؟ "

(میرے اوپر ہونے والے مظالم کو۔ دیکھتے ہوئے۔ تم کیوں اونگھ رہے ہو)

" سِنة " یعنی اونگھنا، قرآن میں بھی مذکور ہے کہ: " لاسنة ولا نوم[۱] " (یعنی، خدا کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ وہ سوتا ہے) " ظلامة " یعنی، وہ چیز جسے ظالم نے مظلوم سے چھین لیا ہو اور مظلوم اس کے حصول کے لئے کوشش میں مصروف ہو. یہاں " ظلامة " فدک یا خود حکومت اور امامت کی طرف اشارہ ہے.

آپؑ یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ۔ اے گروہ انصار۔ میرے اوپر ظلم و ستم ہوا ہے اور اس بارے میں تم خواب غفلت میں کیوں سو رہے ہو؟ ابوبکر اور عمر اپنی من مانی کر رہے ہیں اور تم اعتراض کرنے کے بجائے اپنے آپ کو خواب غفلت میں مبتلا کئے ہوئے ہو؟!

" أما کان رسول اللّٰہ یقول، " المرء یحفظ فی ولدہ "؟ "

۱۔ سورۂ بقرہ / ۲۵۵.

(کیا۔ میرے بابا۔ رسول خدا (ص) نہیں فرمایا کرتے تھے کہ: اولاد کے ضمن میں انسان کی حفاظت ہوتی ہے؟)

اگر کسی فوت ہونے والے انسان کے حقوق اور شخصیت کی حفاظت اور احترام مقصود ہو تو اس کی اولاد کی عزت و احترام کا خیال رکھو کیونکہ اولاد ان کی یادگار ہوتے ہیں، اب اگر تم حضرت ختمی مرتبت (ص) کا احترام کرنا چاہتے ہو تو تم پر لازم ہے کہ پیغمبر (ص) کی عترت کا احترام کرو اور اہل بیتؑ کے حقوق کا دفاع کرو۔ اسی لئے ہم سادات کا احترام کرتے ہیں کیونکہ حقیقت میں یہ پیغمبر (ص) کی عزت و تکریم شمار ہوتی ہے (۱)۔

سیاست اور موقف میں تبدیلی،

"سرعان ما احدثتم"

(تم نے انتہائی جلد بازی سے اپنی روش بدل لی)

"سرعان" اور "عجلان" دونوں انتہائی جلدی کے معنی میں اسم فعل ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ تم پیغمبر (ص) کے ساتھ رہے، حق کے ہمراہ رہے لیکن اچانک تم بدل گئے اور اپنی روش بھی بدل دی ہے، سیاسی حالات سے تم متاثر ہو گئے ہو اور ایسے امور انجام دیئے ہیں کہ جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

"وعجلان ذا اهالة"

(اور کتنی جلدی، تمہاری چربی، تمہارے ناک سے بہہ گئی ہے)

۱۔ جیساکہ بیان کیا ہے کہ سادات کا احترام لازمی ہے اور ان کا احترام محفوظ رہنا چاہیے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ حقوق کے لحاظ سے دوسرے افراد سے فرق رکھتے ہوں اور ایک قسم کی نسلی برتری اور امتیاز کے مالک ہوں کیونکہ اسلامی احکام کی نظر میں، حقوق کے لحاظ سے معاشرے کے تمام افراد برابر اور مساوی ہیں، اسی لئے سادات کا احترام لازم ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ وہ۔ نسلی بنیاد پر۔ خدا کے ہاں کسی خاص مقام اور قرب کے حامل ہوں، کیونکہ قرآن فرماتا ہے کہ "ان اکرمکم عند اللہ اتقکم" (خدا کے نزدیک سب سے بہتر وہ ہے جو زیادہ متقی ہو) اسی طرح رسول خداؐ نے فرمایا کہ: قریش کے آزاد اور آقا کو ایک کالے حبشی پر کوئی برتری نہیں مگر تقویٰ کے لحاظ سے۔ ہاں! سادات پیغمبرؐ کی اولاد اور یادگار ہیں، آپؐ کے ساتھ نسبی پیوند رکھتے ہیں اور آپؐ کے فرمان کے مطابق کہ "المرء یحفظ فی ولدہ" سادات کا احترام ہونا چاہیئے اور ان کی عزت و حرمت کا پاس رکھنا لازم ہے کیونکہ اولاد کی عزت و حرمت اصل میں باپ ہی کی عزت و حرمت ہے۔

"عجلان" اسم فعل ہے، "ذا" اسم اشارہ اور عجلان کا فاعل جبکہ "اھالہ" "ذا" کی تمیز اور منصوب ہے۔ "اھالہ" یعنی چربی۔

بڑے لوگ ہمیشہ اپنے زمانے کی متداول مثالوں سے استفادہ کرتے ہیں، یہاں پر حضرت زہراء (ع) بھی عرب کی مشہور ضرب المثل "عجلان ذا اھالۃ" سے استفادہ کرتی ہیں۔ اس تمثیل کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ: کسی آدمی کے پاس ایک کمزور اور قریب المرگ بکرا تھا اور اس کے ناک سے رینٹ، مسلسل بہتا تھا کسی نے اس سے کہا کہ: بھئی تمہارا بکرا اتنا کمزور کیوں ہے اوراس کے ناک سے کیا بہہ رہا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ: "یہ بکرے کی چربی ہے جو پگھل کر اس کے ناک سے بہہ رہی ہے، اسی وجہ سے بکرا کمزور ہوتا جارہا ہے۔ اس موقع پر اس سے یہ کہا گیا کہ" عجلان ذا اھالۃ "یعنی کس قدر جلدی اس کی چربی اس کے ناک سے نکل رہی ہے اور تیرا بکرا دم توڑ رہا ہے۔ اس کے بعد ضرب المثل کے طور پر یہ جملہ اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو بہت جلدی انجام پائے یا انتہائی عجلت میں اپنی حالت اور روش بدل دے۔

در اصل اس ضرب المثل کے ذریعے حضرت زہراء (ع) یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ: پیغمبر اسلام (ص) کی رحلت کے بعد تم انتہائی تیزی کے ساتھ بدل گئے ہو اور مفاد پرست اور کردار سے عاری افراد کی شکل میں تبدیل ہوگئے ہو کہ جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ حق پامال ہو رہا ہے لیکن چند روزہ دنیوی زندگی کی خاطر خاموش تماشائی بنے ہوئے ہو (۱)۔

آپ (ع) اپنے خطبے کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتی ہیں کہ:

"ولكم طاقـة بما احاول"

(حالانکہ تم میں اتنی طاقت ہے کہ جس چیز کو میں چاہتی ہوں۔ اسے انجام دیں۔)

۱۔ علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں علم لغت کے بعض ماہرین کے اس قول کو نقل کرتے ہیں کہ: "مذکورہ ضرب المثل، آئندہ آنے والے ناخوشگوار حوادث کی خبر دینے کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے" یہ بات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: "بعید نہیں کہ آپؑ اس مثال کے ذریعے امت مسلمہ پر آنے والی ان مصیبتوں اور حوادث کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہوں جو غصب خلافت کے بعد امت کا مقدر بن گئے تھے۔ بحار الانوار۔ طبع قدیم۔ ج ۸ ص ۲۲۰۔

یعنی، اگر آپ ابوبکر کے مقابلے میں آجائیں تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا، تم میں ابوبکر کو خلافت سے برطرف کرنے کی طاقت اور قدرت موجود ہے لیکن تم سلام وصلوات کے ذریعے اس کی رکاب پکڑے ہوئے ہو، حالانکہ ابوبکر کی نوکر شاہی نے تمہاری سادہ لوحی سے غلط فائدہ اٹھایا ہے. اسلام اور اسلامی حکومت کے نام پر تمہیں دھوکہ دیا ہے اور امامت ورہبری کی راہ کو منحرف کردیا ہے اور تم اس راہ میں ان کے آلہ کار بن گئے ہو.

" وقوة على ما اطلب وازاول "

(جس چیز کو میں بار بار۔ تم سے۔ طلب کررہی ہوں۔اس کے حصول کے لئے تم میرا ساتھ دینے کی۔ طاقت رکھتے ہو)

"مزاولہ" کسی چیز کو بار بار طلب کرنا.

آپؑ فرماتی ہیں کہ: تم اتنا تو کرسکتے ہو کہ جس ہدف کو لے کر میں آگے بڑھ رہی ہوں اس کے حصول کی خاطر میرا ساتھ دو اور میرا دفاع کرو، لیکن تم خاموش بیٹھے ہو! اہل بیتؑ کے حقوق کے لئے آپؑ کی سعی پیہم اور اس راہ میں موجود خطرات کے سامنے آپؑ کی استقامت اور ثابت قدمی، اس جملے سے بخوبی معلوم ہوتی ہے.

کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ پیغمبر(ص) وفات پا گئے ہیں اور وحی کا سلسلہ بند ہو گیا ہے لہذا ابھی ہم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی!!

اس قسم کے توہمات کو دور کرنے کے لئے آپؑ فرماتی ہیں کہ:

" اتقولون مات محمد۔ صلى الله عليه واله وسلم۔؟ "

(کیا تم یہ کہو گے کہ: محمد (ص) وفات پا گئے ہیں۔اب ہم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟)

حق کے دفاع میں جو تم سستی اور کاہلی سے کام لے رہے ہو کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ پیغمبر(ص) اس دنیا سے چلے گئے ہیں اور اس کے بعد تم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ یہ تو انتہائی تعجب خیز بات ہوگی، کیونکہ پیغمبر(ص) کے چلے جانے سے حق کے مقابلے میں تمہاری ذمہ داریاں تبدیل نہیں ہوئیں. پیغمبر(ص) کی وفات اگرچہ اتنی عظیم مصیبت ہے کہ اس کی شدت قابل وصف نہیں،

لیکن اس سے تمہاری ذمہ داری تبدیل نہیں ہوتی اور حق اور امامت حقہ کے دفاع کی مسئولیت تم سے سبکدوش نہیں ہوتی.

رحلت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معاشرتی اثرات.

" فخطب جلیل "

(پس۔ رحمۃ للعالمین (ص) کی رحلت۔ ایک بہت بڑی مصیبت ہے)

"خطب" کسی اہم اور بڑی چیز کو کہا جاتا ہے.

(۱) " استوسع وھنہ۔ وھیہ۔ "

(اس مصیبت کی وجہ سے جو کمزوری۔ یا شگاف۔ وجود میں آیا ہے وہ بہت وسیع اور زیادہ ہے)

بعض نسخوں میں مذکورہ عبارت " وھنہ " اور بحار میں " وھیہ " ذکر ہوئی ہے. پہلی عبارت کے مطابق معنی یہ ہو گا کہ رحمۃ للعالمین (ص) کی رحلت کے نتیجے میں مسلمانوں میں جو کمزوری پیدا ہوئی ہے وہ بہت بڑی اور وسیع ہے، جبکہ بحار کی عبارت کے مطابق معنی یہ ہو گا کہ آنحضرت (ص) کی وفات سے مسلمانوں میں جو جدائی اور شگاف پڑا ہے وہ بہت وسیع ہے، کیونکہ "رمی" کے وزن پر "وھی" جدائی اور شگاف کے معنی میں ہے.

آپؑ فرماتی ہیں کہ: رسول خدا (ص) کی وفات کے بعد امت کی صفوں میں جو شگاف پڑا وہ بہت وسیع اور گہرا ہے، امت مسلمہ کے اندر جتنے بھی فرقے وجود میں آئے اور مسلمان اختلاف وافتراق کا شکار ہوئے ان سب کا سبب، سقیفہ کی بغاوت اور امامت کی راہ سے انحراف ہی ہے.

(۲) " واستنھر فتقہ "

(۔اس مصیبت کی وجہ سے پایا جانے والا۔ افتراق بہت وسیع ہے)

"استنھر، نھر" سے مشتق ہے اور وسعت اور زیادہ کے معانی میں آتا ہے جبکہ "فتق" جدائی اور پارہ پارہ ہونے کے معنی میں آتا ہے. یہ جملہ بھی مسلمانوں کے درمیان رحلت پیغمبر (ص) کے بعد واقع ہونے

والے ان فتنوں اور جدائیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو دن بدن بڑھتے چلے گئے۔

(۳) " وانفتق رتقہ "

(اور وحدت و یکجہتی۔ کا شیرازہ۔ بکھر گیا)

" انفتاق " شگاف پڑنا، ٹکڑے ٹکڑے ہونا۔ " رتق " وحدت اور یکجہتی۔

قرآن مجید میں ہے کہ: " ... ان السموٰات والارض کانتا رتقا ففتقناھما (۱) " (یعنی، بے شک آسمان اور زمین ایک دوسرے سے متصل تھے، ہم نے انہیں جدا کر دیا) یہ آیہ کریمہ اپنے ظاہری معنی کے ذریعے، علم ہیئت کے موجودہ نظریے کی تاکید کرتی ہے کہ، کسی زمانے میں زمین سمیت پورا نظام شمسی آتشین شعلے کی شکل میں آپس میں متحد تھا پھر وہ ایک دوسرے سے جدا ہو کر مخصوص مداروں پر گردش کرنے لگا، پھر وہ منجمد ہو گیا اور کرہ زمین میں انسانی زندگی کے لئے مناسب ماحول وجود میں آیا۔

(۴) " واظلمت الارض لغیبتہ "

(اور پیغمبر (ص) کی غیبت۔ رحلت۔ کی وجہ سے زمین تاریک ہو گئی)

یعنی، پیغمبر اسلام (ص) کی وفات کے ساتھ ہی، خالص اسلام، عدالت، صداقت اور حقیقت کی روشنی ماند پڑ گئی اور مفاد پرستی، جاہ طلبی، ریاکاری اور افتراق کی تاریکی پھیل گئی۔

(۵) " وکسفت الشمس والقمر "

(نیز چاند اور سورج کو گرہن لگ گیا،

۔ یہ رحمۃ للعالمین (ص) کے نور ہدایت سے محرومی اور نفاق کی ظلمت چھا جانے کی طرف کنایہ ہے۔)

" کسف " لازم و متعدی دونوں طریقے سے استعمال ہوتا ہے، البتہ اگر معلوم کے صیغے میں ہو تو لازم ہے لیکن اگر مجہول پڑھا جائے تو متعدی ہے۔

یہاں حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ پیغمبر اکرم (ص) کی وفات کی وجہ سے سورج گرہن اور چاند گرہن لگ گیا، آپ کا مقصود یہ نہیں کہ اس دن واقعاً گرہن لگ گیا ہو بلکہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ

۱۔ سورۃ انبیاء / ۳۰۔

رحلت پیغمبر(ص) کی وجہ سے۔ دنیا آپ (ص) کے نور ہدایت سے محروم ہو کر۔ تاریک اور ظلمت کدہ بن گئی ہے۔

(۶) " وانتشرت النجوم لمصیبتہ "

(آپ (ص) کی مصیبت کی وجہ سے ستارے پراکندہ و منتشر ہو گئے ہیں)

یہ تعبیریں، آپ (ص) کے مصائب کی شدت اور گہرائی کو بیان کرتی ہیں کہ آپ (ص) کی وفات سے پورا نظام خلقت متاثر ہوا اور ایک قیامت برپا ہو گئی (۱)۔

(۷) " واکدت الآمال "

(اور امیدیں، ناامیدی میں تبدیل ہو گئیں)

" اکدت " کی اصل " کدی " ہے اور اس کے معنی ہیں بے فائدہ اور بیہودہ چیز۔

مسلمانوں نے رسول خدا (ص) کے ساتھ کافی امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں اور بہت ساری تمنائیں اور آرزوئیں رکھتے تھے اور آپ (ص) کی رحلت کی وجہ سے وہ ناامید ہو گئے۔ قرآن اور خود رسول خدا (ص) کے وعدوں کے مطابق مسلمان یہ آرزو رکھتے تھے کہ روئے زمین تمام انسان، مسلمان بن جائیں اور عدالت کی طرف رجوع کریں اور کرہ ارضی پر عدالت و یکتا پرستی کا پرچم لہرائیں، لیکن رحمۃ للعالمین (ص) کی وفات اور چند مفاد پرست افراد کی جاہ طلبی اور ریاست طلبی کے نتیجے میں حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ مسلمانوں کی تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور توحید و عدالت کے پرستار سازش کا شکار ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔

(۸) " وخشعت الجبال "

(اور پہاڑ خاشع ہو گئے)

آپ ؑ کا یہ کلام کنایہ ہے پہاڑوں کے خاشع۔ و عاجز۔ ہونے سے۔ یہاں دو مقصد ہو سکتے ہیں:

۱۔ آپ ؑ کے کلمات قیامت کی صفت میں نازل شدہ ان قرآنی آیات سے ماخوذ ہیں کہ " اذا الشمس کورت واذا النجوم انکدرت و ... " آپ ؑ نے رحلت رسول ؐ کے عظیم حادثے کو قیامت کے حادثہ سے تشبیہ دی ہے۔

۱۔ رسول خدا (ص) کی رحلت کی مصیبت اتنی عظیم اور کمر شکن تھی کہ پہاڑ بھی اپنی رفعت و استقامت کے باوجود اس مصیبت کے سامنے عاجز و درماندہ دکھائی دیتے ہیں۔

۲۔ وہ افراد جو رسول خدا (ص) کی زندگی میں پہاڑوں کی طرح سینہ تان کر حوادث و مشکلات کا مقابلہ کرتے تھے ابھی سستی اور کمزوری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

(۹) "واضیع الحریم"

(اور۔ پیغمبر (ص)۔ کا حریم ضائع ہو گیا)

سیاست باز حکمرانوں نے حالات ایسے خراب کر دیئے کہ اہل بیتؑ عصمت و طہارت کہ جو حریم رسول (ص) تھے، کی توہین کی اور ان کی حرمت کو ضائع کیا گیا، وہ ہستیاں جو قرآن، معارف اسلامی اور دین و مکتب کی حامی اور مددگار تھیں اور دشمن کے خطرے سے اسلام کو محفوظ رکھتی تھیں، خود توہین اور وحشیانہ حملوں کا نشانہ بن گئیں۔

(۱۰) "وازیلت الحرمۃ عند مماتہ"

(اور۔ اہل بیت (ع) پیغمبر (ص) کی۔ حرمت آنحضرت (ص) کی وفات کے بعد پامال کی گئی)

تم نے اپنی ان حرکتوں کے ذریعے پیغمبر (ص) کے گھر کی حرمت ختم کر دی کیونکہ حقیقت میں آنحضرت (ص) اور حضرت علی (ع) کا گھر، اسلام کا مرکز تھا لیکن تم نے رحلت رسول (ص) کے بعد چند بے نام و نشان افراد مامور کئے تاکہ وہ اسلام اور خلافت کے دفاع کے نام پر اہل بیتؑ کی حرمت کو پامال کریں اور حضرت فاطمہ زہراء (ع) کے حق میں گستاخی کریں۔

در اصل۔ ان لوگوں نے اپنی ان غیر سنجیدہ حرکتوں کے ذریعے۔ حرمتوں کو پامال کیا اور تاریخ اسلام میں ہونے والے بے شمار مظالم کی بنیاد رکھی۔

"فتلک واللہ النازلۃ الکبریٰ والمصیبۃ العظمیٰ"

(پس خدا کی قسم یہ حوادث، بہت بڑی مصیبت اور فاجعہ ہیں)

حضرت زہراء (ع) بغیر کسی معیار کے صرف مبالغہ کے لئے نہیں فرماتی ہیں کہ رحلت پیغمبر (ص) کے

بعد جو واقعات رونما ہوئے ہیں وہ امت کے لئے بہت بڑا فاجعہ اور ایک عظیم مصیبت ہیں۔ اگر ہم ان واقعات کا صحیح تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام، عدالت اور خلافت کے نام پر جتنے بھی ظلم وستم، تحریفیں اور مظالم مسلمانوں کے درمیان پائے جاتے ہیں ان کی جڑیں اور اسباب، سقیفہ اور رحلت پیغمبر(ص) کے بعد خلیفہ تراشی کی وجہ سے ہیں۔

"لا مثلها نازلة"

(اس مصیبت کی مانند اور کوئی مصیبت نہیں)

کیونکہ یہ بڑی مصیبت اور اس کے بعد والے واقعات ہی، تاریخ اسلام میں ہونے والے ان جرائم کا بنیادی سبب بنے جو بنی امیہ اور بنی عباس کی نام نہاد اسلامی حکومتوں کے ذریعے انجام پائے۔

"ولا بائقة عاجلة"

(اور۔ دنیا کی۔ کوئی مصیبت بھی رحلت پیغمبر(ص) جیسی نہیں)

"بائقة" بہت بڑی مصیبت کو کہا جاتا ہے۔

قرآن میں رحلت رسول(ص) کی پیش گوئی:

"اعلن بها كتاب الله جل ثناؤه في افنيتكم"

(اس حادثے کا اعلان، کتاب اللہ۔ جل ثناؤہ۔ نے تمہارے گھروں کے اطراف میں بیان کر دیا تھا)

آپؑ یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ: اگرچہ پیغمبر اکرم(ص) کی وفات ایک عظیم حادثہ تھی لیکن خداوند جل جلالہ نے آپ(ص) کے انتقال سے قبل ہی اس کی خبر دے دی تھی۔ در اصل موت کوئی نئی بات نہیں، آپؐ سے پہلے کے انبیاءؑ بھی اس دنیا سے چلے گئے ہیں، لہذا کوئی یہ خیال نہ کرے کہ پیغمبر(ص) کے چلے جانے کے بعد اب بات ختم ہو گئی ہے اور تمہارے کندھوں پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ موت ایک طبعی چیز ہے اور رحلت رسول(ص) کی وجہ سے تمہاری ذمہ داری میں تبدیلی نہیں آتی۔ اور تم حق وحقیقت کے دفاع سے آزاد نہیں ہو گئے۔

"اعلن بها" رحلت رسول (ص) کی خبر دی ہے "کتاب اللہ جل ثناؤہ" اللہ جل ثناؤہ کی کتاب قرآن نے "فی افنیتکم" تمہارے گھروں کے اطراف میں. "فناء" کی جمع "افنیۃ" ہے اور اس کا معنی گھر کے سامنے کا میدان یا صحن ہے۔

شاید یہ جملہ اس بات کی طرف کنایہ ہو کہ: تم مہاجرین اور انصار بظاہر قرآن کی تلاوت تو کرتے رہتے تھے اور تمہارے گھر کے اندر اور ارد گرد کے گھروں سے تلاوت قرآن کی آواز بلند ہوتی رہتی تھی تو کیا خدا نے اسی قرآن کے اندر نہیں فرمایا تھا کہ: "أ فان مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم ؟(۱)" (یعنی کیا اگر رسول خدا (ص) کا انتقال ہو جائے یا آپ (ص) قتل کردیئے جائیں تو کیا تم اپنی سابقہ حالت (جاہلیت) کی طرف پلٹ جاؤ گے؟) اگر تم قرآن کی تلاوت کرتے تھے اور قرآن سے آشنا تھے تو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم رحلت پیغمبر (ص) کے بعد مکمل طور بدل گئے ہو اور قرآنی تعلیمات کو پامال کر رہے ہو؟

شاید یہ کلام عمر کی طرف اشارہ ہو کہ منقول ہے کہ جب اسے رحلت پیغمبر (ص) کی خبر ملی تو وہ بھڑک اٹھا اور کہنے لگا کہ "پیغمبر (ص) کو بھی کیا موت آتی ہے؟" اسے کہا گیا کہ قرآن نے پیغمبر (ص) کی وفات کی خبر دی ہے اور تم یہ کہہ رہے ہو کہ: پیغمبر (ص) کو بھی کیا موت آتی ہے؟(۲).

عمر اپنے آپ کو مقدس ظاہر کرنے کے لئے کبھی کبھار ایسے کام کیا کرتا تھا. تاریخ نے ایک اور نمونہ بھی نقل کیا ہے کہ اس نے لوگوں کو اپنے بچوں کا نام محمد رکھنے سے روکا تھا اور کہتا تھا کہ اگر ہر علاقے میں ہر بچے کا نام محمد رکھ دیا جائے تو اس سے آنحضرت (ص) کی توہین اور بے احترامی ہوگی ؟!.

"فی ممساکم و مصبحکم"

(تم دن اور رات کو۔ قرآن پڑھتے تھے۔)

"مصبح" اور "ممساء" یہ دونوں مصدر یا اسم مکان کے معنی میں آتے ہیں. ہر صورت اس کا معنی

۱۔ سورۂ آل عمران / ۱۴۴۔ ۲۔ بعض مؤرخین کا نظریہ ہے کہ: عمر کی یہ بات ایک سیاسی حربہ تھی کیونکہ اس وقت تک سقیفہ کے سازشی گروپ، خلیفہ تراشی کے مسئلے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے لہذا عمر اپنی اس بات کے ذریعے یہ چاہتا تھا کہ فیصلہ ہونے تک پیغمبرؐ کی وفات کو پوشیدہ رکھا جائے لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ خلیفہ کے بارے میں فیصلہ ہونے کے بعد فوراً وفات پیغمبرؐ کا اعلان ہوتا ہے اور سقیفہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہناتا ہے۔

ہے صبح اور رات کا وقت. مقصود یہ ہے کہ تم روز وشب قرآن کی تلاوت کرتے تھے اور قرآن کی تعلیمات سے آشنا تھے.

" ھتافاً وصرافاً وتلاوۃ والحافاً "

(۔ نیز تم قرآن کو۔ بلند آواز میں، گریہ وزاری کے ساتھ، معمولی تلاوت اور لحن وخوبصورتی۔ کے ساتھ پڑھتے تھے ۔)

یعنی، تمہارا ایک گروہ قرآن کی بلند آواز میں تلاوت کرتا تھا، بعض نالہ وفریاد اور گریہ وزاری کے ساتھ پڑھتے تھے بعض اور معمول کے مطابق تلاوت کرتے تھے جبکہ بعض لوگ اچھی آواز میں لحن کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتے تھے.

" الحان " اگر ہمزہ کو زبر کے ساتھ پڑھیں تو لحن کی جمع ہے اور معنی ہوگا اچھی آواز، اور اگر ہمزہ کو کسر کے ساتھ پڑھیں تو سمجھانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے. یعنی تم میں سے بعض افراد ایسے بھی تھے جو قرآن کی تلاوت کے علاوہ اس کی تفسیر اور دوسروں کو سمجھاتے بھی تھے.

خلاصہ یہ کہ: قرآن کی آواز۔ تم ہر وقت ہر جگہ اور مختلف انداز سے۔ سنتے رہتے تھے اور جانتے تھے کہ رسول خدا (ص) ایک دن وفات پاجائیں گے. اگرچہ آپ (ص) کی رحلت ایک عظیم سانحہ تھی لیکن کوئی انوکھی بات نہیں تھی. قرآن نے بھی اس کی اطلاع دی تھی۔ بنابریں رحلت رسول (ص) کی وجہ سے۔ تمہاری ذمہ داری ختم نہیں ہوتی ہے.

خدا کا قانون موت اور انبیاء (ع):

" ولقبله ماحل بانبیاء اللّٰہ ورسلہ ؟ "

(اور اس سے پہلے بھی خدا کے انبیاء اور رسل پر کیا گزری ہے ؟)

پیغمبر اسلام (ص) سے قبل دوسرے انبیاء پر کیا آن بنی تھی سوائے اس کے کہ وہ سب موت سے ہم آغوش ہوئے ؟ پس موت ایک نئی چیز نہیں تھی اور پیغمبر اسلام (ص) کو بھی دوسرے لوگوں اور انبیاءؑ کی طرح ایک دن اس دنیا کو الوداع کہنا تھا.

"حکم فصل وقضاء حتم"

(قانون موت - خدا کا قطعی حکم اور حتمی قضاء۔ میں سے ایک۔ ہے)

موت خدا کا حتمی اور ناقابل تغییر قانون ہے اور تمام انسانوں نے مرنا ہے. قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ: "کل نفس ذائقة الموت[1]" (ہر نفس نے موت کا مزہ چکھنا ہے) اور رسول خدا (ص) بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہ تھے.

حضرت فاطمہ (ع) یہاں اس آیہ کریمہ کی تلاوت فرماتی ہیں جو رحلت پیغمبر (ص) کے بارے میں نازل ہوئی تھی.

" وما محمد الا رسول قدخلت من قبله الرسل، أفإن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم[2]"

(محمد (ص) صرف اللہ کا رسول ہے، اس سے پہلے سے بھی کئی رسول گزرے ہیں،

اگر۔ ہمارا حبیب۔ وفات پا جائے یا قتل کردیا جائے تو کیا تم جاہلیت کی طرف واپس پلٹ جاؤ گے؟)

در اصل قرآن میں خداوند یہ بات بتادینا چاہتا ہے کہ رحلت رسول (ص) کے بعد لوگ اپنے ماضی (یعنی جاہلیت کے آداب و رسوم) کی طرف پلٹ جائیں گے، ہماری بعض روایات میں موجود ہے کہ: "ارتد الناس بعد رسول اللہ الا ثلاثة - او اربعة -" (پیغمبر کے بعد سوائے تین یا چار آدمیوں کے باقی تمام لوگ اپنے ماضی کی طرف پلٹ گئے تھے) بعض روایات میں تین افراد اور بعض میں چار افراد کا ذکر ہوا ہے کہ وہ دین پر ثابت قدم رہے، شیعہ اور اہل سنت کی روایات کی کتب میں، صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ:

"قیامت کے دن رسول خدا (ص) دیکھیں گے کہ ان کے اصحاب کو شمال (جہنم) کی طرف لے جا رہے ہیں. آپ (ص) دعا کریں گے کہ " یا رب اصیحابی " پروردگارا! یہ میرے اصحاب ہیں انہیں نجات دے تو خدا فرمائے گا کہ: " انک لاتدری ما احدثوا بعدک " آپ (ص) نہیں جانتے کہ تمہارے بعد ان لوگوں نے کیا کیا ہے، تو پیغمبر اکرم (ص) فرمائیں گے کہ: " وکنت علیہم شہیداً ما دمت فیہم،

۱۔ سورۂ آل عمران / ۱۸۵۔ ۲۔ آل عمران / ۱۴۴۔

فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیهم "جب تک ان کے درمیان میں زندہ رہا ہوں میں خود ان کے اعمال وکردار کا گواہ تھا لیکن جب تو نے میری جان لے لی ہے تو، تو خود ان کے اعمال وکردار کو دیکھ رہا تھا" (۱)۔

یہ حدیث صحیح بخاری اور سنن ترمذی دونوں میں ہے اور اس بات پر دلالت رکھتی ہے کہ پیغمبر (ص) کے بعد آپ (ص) کے بہت سارے صحابی بدل گئے اور رسول خدا (ص) کی راہ وروش سے منحرف ہو گئے، لیکن مجھے ۔ اہل سنت بھائیوں پر ۔ تعجب ہوتا ہے کہ وہ اصحاب کی اتنی حامی بھرتے ہیں اور ان کے اقوال کو حجت مانتے ہیں! حالانکہ صحیح بخاری اور سنن ترمذی میں جو ان کی معتبر کتابوں میں سے ہیں، ایسی روایات موجود ہیں جو صراحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ پیغمبر (ص) کی وفات کے بعد بہت سارے اصحاب نے رنگ بدلا اور قیامت کے دن جہنم میں جائیں گے ۔ ایسی روایات اور صحابہ کے ایسے کردار کے باوجود ۔ کس منطق کی بنیاد پر اہل سنت، صحابہ کے اقوال کو حجت مانتے ہیں اور سنت رسول (ص) کی طرح اس پر اعتماد کرتے ہیں ؟! جو افراد ۔ اسلام کو پشت کر کے ۔ جاہلیت کی طرف پلٹ کر چلے گئے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ انہوں نے خدا کو نقصان پہنچایا ہے بلکہ انہوں نے خود کا نقصان کیا ہے. اسی لئے آپ آیۂ شریفہ کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

" ومن ینقلب علی عقبیه فلن یضر الله شیئاً "

(جو شخص اپنی ایڑی کے بل پیچھے پلٹ جائے تو وہ ہرگز خدا کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا)

" سیجزی اللّٰــه الشاکرین (۲)"

(اور خداوند عنقریب شکر گزار بندوں کو ۔ ان کی حق پر پائیداری اور نیک اعمال کا ۔ اجر عنایت فرمائے گا)

جس آیۂ کریمہ سے حضرت زہراء (ع) نے تمسک فرمایا ہے وہاں خداوند متعال، اپنی نعمتوں کے مقابلے میں ناشکرے اور شکر گزار دونوں قسم کے افراد کی حالت بیان فرماتا ہے، ناشکرے اور ناسپاس

۱۔ صحیح بخاری ج ۳ ص ۱۴۷ سورۂ مائدہ کی تفسیر کے ضمن میں، سنن ترمذی ج ۵ ص ۴ ، سورۂ انبیاء کی تفسیر کے ضمن میں.

۲۔ سورۂ آل عمران / ۱۴۴.

بندوں کے بارے میں فرمایا کہ: جو شخص اسلام اور پیغمبر اسلام (ص)۔ کہ جو در حقیقت رحمۃ للعالمین (ص) ہیں۔ کی نعمت کو پانے کے بعد دوبارہ جاہلیت کا رخ کرے اور اسلامی اقدار کو پامال کرے، اسے جاننا چاہیئے کہ اس فعل سے خود اس کو نقصان ہوگا اور وہ خدا کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا. البتہ جو شکر گزار رہے اور پروپیگنڈوں سے متاثر ہوکر۔ جاہلیت کی طرف واپس لوٹنے کے بجائے۔ حق وحقیقت کا دفاع کرے، ان کے بارے میں خدا فرماتا ہے کہ وہ عنقریب نیک جزا پائے گا۔

انصار سے حضرت زہراء (ع) کا شکوہ:

" ایھا بنی قیلۃ! "

(اے قیلہ کے فرزندو! تم سے۔ یہ بات۔ بہت بعید تھی)

" ایھا " ھیھات کے معنی میں اسم فعل ہے اور کسی چیز یا کام کے دور ہونے اور بعید ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ "قیلہ" ایک عورت کا نام ہے کہ اوس وخزرج کے قبائل، اسی عورت کی نسل سے تھے. در اصل انصار انہی دو قبیلوں کے افراد پر مشتمل تھے اور انہی لوگوں نے پیغمبر (ص) کی بیعت کی اور آنحضرت (ص) کو مدینہ۔ اس وقت کے یثرب۔ میں تشریف لانے کی دعوت دی اور آپ (ص) نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد وہاں اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔

یہاں حضرت زہراء (ع) انصار کو مخاطب قرار دیتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ: " ایھا بنی قیلۃ " (قیلہ کے فرزندو! تم سے یہ بات بہت بعید تھی۔ کہ تم حق کی حمایت کے بجائے ظالم کے حامی بن جاؤ۔)

" أا ھضم تراث ابی؟ "

(کیا میں اپنے بابا کی میراث میں بھی مظلوم ہوں اور اس سے محروم رہوں؟)

یعنی، کیا حالات اس حد تک ابتر ہوچکے ہیں کہ ایک مسلمان معاشرے میں پیغمبر (ص) کی اکلوتی بیٹی اس قدر ظلم سہے لیکن کوئی اس کا دفاع نہ کرسکے؟!۔

" وانتم بمرء ی منی ومسمع ومنتدی ومجمع "

(درحالانکہ تم میری آنکھوں کے سامنے ہو، تمہاری باتیں میں سنتی ہوں اور ہم ایک ہی مقام میں ہیں!)

"منتدی" باب افتعال مادہ "ندی" سے اسم مکان ہے اور جمع ہونے کی جگہ (جلسہ گاہ، ہال) کو کہا جاتا ہے۔ "دار الندوۃ" بھی اجتماع کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

آپؑ فرماتی ہیں کہ: تم میرے سامنے ہو، میں تمہاری باتوں کو سنتی ہوں، ہم ایک ہی جگہ پر جمع ہیں اور تم دیکھ رہے ہو کہ مجھ پر ظلم ہو رہا اور میرا حق پامال ہو رہا ہے اور میں تمہیں مدد کے لئے پکار رہی ہوں اور تم اسے سنتے ہی نہیں ہو! یعنی ماضی میں ہم ایک ساتھ تھے ہمارا محاذ اور دشمن ایک تھا۔ تمہارا پیغمبر (ص) کے ساتھ دفاعی معاہدہ بھی تھا۔ لیکن سیاسی حالات نے تمہیں اس قدر بدل دیا ہے کہ میرا حق ضائع ہو رہا ہے اور تم یا تو دفاع کرنا ہی نہیں چاہتے یا دفاع کرنے کی سکت نہیں رکھتے؟!

"تلبسکم الدعوۃ وتشملکم الخبرۃ"

(میری دعوت تم تک پہنچ رہی ہے اور حالات سے تم باخبر ہو!)

یعنی، تم بخوبی جانتے ہو کہ ہمارے اوپر کیا مظالم ہوئے اور کس قدر ہماری حرمت پامال ہوئی۔ ظلم کے خلاف ہماری مدد اور حمایت کرنے کی، میں نے تمہیں دعوت دی ہے، تمہیں پکارا ہے لیکن تم خاموش رہے۔ لہذا تم نہ تاریخ کو یہ جواب دے سکتے ہو اور نہ ہی خدا کی عدالت میں یہ عذر پیش کرسکتے ہو کہ زہراء (ع) پر ہونے والے مظالم کا ہمیں علم نہ تھا۔

"وانتم ذوو العدد والعدۃ والاداۃ والقوۃ"

(حالانکہ تم افرادی قوت، وسائل اور سیاسی نفوذ کے اعتبار سے قوی اور طاقتور ہو!)

"عدد" یعنی، افرادی قوت، "عُدّۃ" یعنی، ہر وہ چیز جو انسان کی طاقت کا باعث بنے جیسے اجتماعی مقام اور بااثر ہونا وغیرہ "اداۃ" یعنی، اسباب ووسائل "قوۃ" یعنی، طاقت اور قدرت۔

مقصود یہ ہے کہ تمہاری آبادی زیادہ ہے اور تم جنگی ساز وسامان اور دوسرے اسباب ووسائل سے بھی لیس ہو اور اپنے معاشرے میں نفوذ بھی رکھتے ہو اس طرح تم ہر لحاظ سے اس بات کی طاقت رکھتے ہو۔ کہ حق کی حمایت کرو۔ لیکن تم اپنے پیغمبر (ص) کی یادگار بیٹی پر ظلم ہوتے ہوئے دیکھتے ہوئے بھی خاموش

تماشائی بنے بیٹھے ہو !!۔

"وعندكم السلاح والجنة"

(۔حالانکہ۔ تمہارے پاس اسلحہ اور ڈھال بھی موجود ہے)

"جنہ" یعنی، ڈھال، مقصود یہ ہے کہ تم جنگی ساز وسامان کے اعتبار سے بھی لیس اور آمادہ ہو، پس حکومت وقت کی طاقت سے کیوں ڈرتے ہو ؟!

"توافيكم الدعوة، فلا تجيبون!"

(پے در پے تمہیں دعوت دی جا رہی ہے لیکن تم جواب نہیں دیتے !)

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر المؤمنین (ع) اور حضرت فاطمہ زہراء (ع) نے لوگوں کو بار بار دعوت دی تھی لیکن ان کی دعوت پر کسی نے توجہ نہیں دی تھی اور لبیک کہنے سے گریز کیا تھا. پس یقیناً ان کے پاس خدا کے سامنے کوئی عذر نہیں ہے، کیونکہ اہل بیت (ع) پر ہونے والے مظالم سے آگاہ تو تھے لیکن خوف وہراس یا مقام ومنصب اور مادی مفادات کی لالچ میں ساکت ہوگئے تھے .

"وتاتيكم الصرحة، فلا تغيثون!"

(ہماری فریاد اور استغاثہ کی آواز تم تک پہنچ رہی ہے لیکن تم کوئی جواب نہیں دیتے ہو !)

صدائے استغاثہ سے مراد، حضرت زہراء (ع) اور امیر المؤمنین (ع) کے خطبات اور ان سے تعاون کی دعوت ہے.

انصار کی مجاہدانہ خدمات:

"وانتم موصوفون بالكفاح، معروفون بالخير والصلاح"

(حالانکہ تم جنگجوئی وشجاعت اور خیر وصلاح کے لحاظ سے شہرت رکھتے ہو !)

ڈھال کے بغیر دشمن سے لڑنے کو "کفاح" کہا جاتا ہے اور یہ ان کی شجاعت اور شہامت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، یعنی تم دلیر اور نڈر تھے لیکن آج تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ ڈرتے ہو ؟!۔

"والنخبة التی انتخبت"

(اور تم انتخاب شدہ اور برگزیدہ لوگ تھے)

یعنی، تم معمولی انسان نہ تھے بلکہ صاحب کردار اور قد آور شخصیات تھے اور اس طرح تم ملت کے برگزیدہ افراد مانے جاتے تھے۔

"والخیرة التی اختیرت لنا اهل البیت"

(اور تم وہ برگزیدہ قوم ہو جو ہم اہل بیت کے لئے انتخاب ہوئے ہو)

یعنی، عام لوگوں کے درمیان تم میں کچھ خصوصیات پائی جاتی تھیں تم پیغمبر (ص) اور ہمارے حامی ومددگار تھے اور ہماری حمایت کرتے تھے۔ اس طرح تم اہل بیتؑ کا مخصوص گروہ اور ان کی پارٹی کے طور پر پہنچانے جاتے تھے۔ لیکن تم اچانک بدل گئے ہو اور ہم سے روگردانی اختیار کرلی ہے۔

"قاتلتم العرب وتحملتم الکدّ والتعب"

(تم نے عرب۔ کے مشرک۔ سرغنوں سے جنگ لڑی اور سختیاں اور مشکلات برداشت کیں)

یعنی، اسلام کی خدمت میں تم طویل اور درخشان خدمات کے حامل ہو، خطرناک مواقع پر تم حاضر رہے، عرب کے سرداروں سے جنگیں لڑیں اور اس راہ میں مشکلات، مصائب اور سختیاں برداشت کیں۔

"ناطحتم الامم وکافحتم البهم"

(۔ مشرک۔ قوموں سے جنگیں لڑیں اور ضدی اور ہٹ دھرم جنگجوؤں کا مقابلہ کیا)

"تناطح" یعنی، سینگ مارنا۔ یہ جنگ وجہاد کے لئے کنایہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ "بہم" "بہتہ" کی جمع ہے اور ایسے دلیر ونڈر افراد کو کہا جاتا ہے جو ہٹ دھرم ہوں اور منطق واستدلال سے عاری اور اچانک مشتعل ہوکر حملہ کردیتے ہوں۔

آپ (ع) کا مقصد یہ ہے کہ تم گروہ انصار، سرکشی، بگاڑ اور انحراف کے مقابلے میں جہاد کرنے والے تھے، قوموں۔ کی جہالت وگمراہی۔ کے بارے میں بے تفاوت نہ تھے اور لاابالی نہ تھے، تمہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا اور اس راہ میں خطرات کی پرواہ بھی نہیں کیا کرتے تھے، لیکن آج حکمران

ٹولے کی انحراف، بگاڑ اور اسلام، قرآن اور سنت رسول (ص) کے نام پر ظلم وستم پر تم خاموش کیوں ہو؟ تماشا کیوں دیکھ رہے ہو؟ یہاں تک کہ تم حق وعدالت، مظلوم کی حمایت اور اسلامی اقدار کی تجدید حیات کے لئے دعوت دینے والے اہل بیتؑ کے ہمنوا ہونے اور ان کے ساتھ تعاون کرنے سے کتراتے ہو، آخر کیوں؟۔

" لا نبرح او تبرحون، تامرکم فتاتمرون "

(۔ جبکہ ماضی میں ۔ جب بھی ہم ۔ پیغمبر (ص) اور اہل بیت (ع) ۔ تمہیں کوئی حکم دیتے تو تم اطاعت کرتے تھے ۔)

" لانبرح او تبرحون " ہم اور تم ہمیشہ سے ایسے ہی رہے کہ " تامرکم فتاتمرون " جب ہم تمہیں حکم دیتے تھے تو تم اس کی اطاعت کرتے تھے . اس طرح تمہاری یہ حالت تھی کہ اپنی ہستی کو بھی اسلام اور رسول خدا (ص) پر قربان کردیتے تھے اور ہمیشہ ہم اہل بیتؑ کے فرمانبردار تھے آج کس طرح تمہیں گوارا ہے کہ ہمارے اوپر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے جائیں اور تم خاموش رہو اور ہم تم سے جتنی بھی مدد اور تعاون کی درخواست کریں، تم جواب بھی نہ دو؟۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نواں درس:

- اسلام کی کامیابی میں اهل بیت (ع) کا کردار
- انقلاب کے بعد رجعت پسندی کے آثار
- محافظہ کار اور عہد شکن افراد کا انجام
- خاموشی کی وجہ، دنیا پرستی اور راحت طلبی هے
- جاهلیت کی طرف بازگشت
- سوز دل اور اتمام حجت
- سازش کے خاتمے کی تصویر کشی

حَتّى إذا دارَتْ بِنا رحى الإسلام، وَ درَّ حلب الأيام، وَ خضعت ثغرة [نعرة] الشِّرك، وَ سَكَنَتْ فورة الإفك، و خمدَتْ نيرانُ الْكُفْرِ، وَ هَدَأَتْ دَعْوَةُ الْهرْج، و اسْتَوْسَقَ نِظامُ الدّين، فَأَنّى حزتُمْ بَعْدَ الْبَيانِ؟ وَ أَسْرَرْتُمْ بَعْدَ الإِعْلانِ؟ وَ نَكَصْتُمْ بعدَ الإِقْدام؟ وَ أَشْرَكْتُمْ بَعْدَ الإيمان؟ بؤْساً لِقَوْمٍ نَكَثُوا أيمانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ، وَ هَمُّوا بِإِخْراجِ الرَّسول، وَ هُمْ بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ، أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنينَ.

ألا وَ قَدْ أرى أن قَدْ أَخْلَدْتم إِلَى الخَفْضِ وَ أَبْعَدْتُمْ مَنْ هُوَ أَحَقّ بِالْبَسْطِ وَ الْقَبْضِ وَ أَقْواهُمْ عَلَيْه، و خَلَوْتُمْ بِالدَّعة، وَ نَجَوْتُم بِالضّيق مِنَ السَّعَةِ [وَ نَجَوْتُمْ مِنَ الضّيق بِالسَّعَةِ]، فَمججْتم ما وعيتم، و دسعتم الذى تسوغتم، فَإِن تكفروا أنتم وَ مَنْ فِي الأَرضِ جميعاً فَإِنّ اللهَ لِغَنِيٌّ حميدٌ.

أَلا وَ قَدْ قُلْتُ ما قُلْتُ هذا عَلىٰ مَعْرِفَةٍ مِنّى بِالْخذلة [الجذلة] التى خامَرَتْكُمْ والْغدرة الّتى اسْتَشْعَرَتْها قُلُوبُكُمْ؛ وَلٰكِنَّها فيضَةُ النَّفْسِ، وَ نفثة الْغَيْظِ، و خَوَرُ القناة و بثّة الصَّدْرِ، وَ تقدمة الحُجَّة؛ فَدُونَكُمُوها فَاحْتَقِبُوها دبرة الظَّهر، نقبة الخف، باقِيَة العار، مَوْسُومَة بِغَضَبِ اللهِ [الجبّار]، و شنار الأَبَدِ، مَوصُولَة بِنارِ اللهِ الْمُوقدة الّتى تَطَّلِعُ عَلَى الأَفْئِدَة؛ فَبِعَيْنِ اللهِ ما تَفْعَلون؟ وَ سَيَعْلَمُ الّذين ظَلَمُوا أَىَّ مُنْقَلبٍ يَنْقَلِبُونَ؛ وَ أَنَا ابْنَة نذير لَكُم بَيْنَ يَدَىْ عَذابٍ شَديدٍ، فَاعْمَلُوا إِنّا عامِلُونَ، وَ انْتَظِرُوا إِنّا مُنْتَظِرُونَ.

***

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبہ نستعین

گزشتہ درس میں ہم نے کہا کہ حضرت زہراء(ع) نے انصار سے فرمایا کہ:

تم نے مشرک عرب سرداروں سے جنگیں لڑیں، زحمتیں اور تکالیف برداشت کیں، غیر مسلمان قوموں سے مقابلہ کیا، سرکش، ضدی اور دلیر پہلوانوں سے جہاد کیا، جب بھی رسول خدا (ص) یا ہم اہل بیت میں سے کوئی تمہیں حکم دیتے تو تم اس کی اطاعت کرتے تھے، حریم اہل بیت کا دفاع کرتے تھے، لیکن ابھی تمہیں کیا ہوا ہے کہ اچانک بدل گئے ہو، رحلت رسول (ص) کے بعد ہمارے اوپر بے شمار ظلم وستم ہو رہے ہیں، ہمارا حق چھینا گیا ہے، تم خاموش ہو اور ہم جتنا بھی تمہیں پکار رہے ہیں تم کوئی جواب نہیں دے رہے ہو اور خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہو !!

اب آپؑ خطبے کو جاری رکھتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

اسلام کی کامیابی میں اہل بیت (ع) کا کردار:

"حتی اذا دارت بنا رحی الاسلام"

(۔ تم پیغمبر (ص) اور اہل بیت (ع) کے وفادار رہے۔

یہاں تک کہ ہماری کوششوں کی وجہ سے اسلام کی چکی کا پتھر متحرک ہو گیا)

یعنی، اسلام طاقتور، متحرک اور فعال ہوگیا، یہ کامیابیاں، رسول خدا (ص)، حضرت علی (ع)، اہل بیتؑ اور دوسرے سارے مسلمانوں کے ایثار کا ثمر تھیں۔

(۱) " ودرّ حلب الایام "

(دنیا میں خیر و برکت دودھ کی طرح فراوان ہوئی)

یعنی، اسلام کے سائے میں خیر و برکت کی فراوانی ہوئی، جب کوئی بھیڑ بکری، گائے یا اونٹنی دودھ دیتی ہے تو یقیناً وہ خیر و برکت کا باعث ہوتی ہے۔

حضرت زہراء (ع) نے اپنے اس کلام میں، اسلام کی کامیابی اور پیشرفت کو تھن سے دودھ جاری ہونے کی حالت سے تشبیہ دی ہے، یعنی آنحضرت (ص) اور مسلمانوں کی تکالیف نیز مسلمانوں کی پیغمبر خدا (ص) و اہل بیتؑ کی پیروی کی سبب سے دنیا، خیر و برکت سے بھر گئی۔ اسلام مستحکم ہوا۔ شرک، نفاق، کفر، اور جاہلیت کے آداب و رسوم معاشرے سے بالکل ختم ہوگئے۔

(۲) " وخضعت نعرۃ۔ ثـغرۃ " الشرک "

(شرک کی ناک خاک پر رگڑ دی۔ یا شرک نے گھٹنے ٹیک دیئے۔)

حضرت زہراء (ع) کا یہ کلام دو طرح سے نقل ہوا ہے: بعض نسخوں میں "نعرۃ" کے ساتھ مذکور ہے۔ "نعرۃ" ناک کو کہا جاتا ہے اور کنایۃً تکبر اور غرور کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بنابریں " خضعت نعرۃ الشرک " کا معنی یہ ہوگا، شرک کو ذلت اٹھانا پڑی، یعنی مشرکین کی ناک خاک پر رگڑی گئی اور انہوں نے اسلام کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

البتہ بعض دوسرے نسخوں میں "ثغرۃ" کا لفظ ہے اور اس کا معنی یہ ہے، گلہ کا نچلا حصہ یا سینہ۔ اس زمانے میں جب اپنے حریف کو شکست دینا مقصود ہوتی تھی تو وہ کوشش کرتے تھے کہ دشمن کو سینہ کے بل زمین پر لٹا دیا جائے، جیسا کہ آج کل کشتی میں کامیاب ہونے کے لئے اپنے حریف کو پیٹھ کے بل زمین پر لٹا دینے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح حریف اپنی شکست تسلیم کرلیتا ہے۔ یہاں چاہے اصل میں " نعرۃ الشرک " ہو یا "ثغرۃ الشرک" مقصود یہ ہے کہ مشرکین نے اسلام کے مقابلے میں

شکست کھائی اور تسلیم ہوگئے اور معاشرے سے شرک اور اس کے آثار مٹ گئے۔

(۳) " وسکنت فورة الافک "

(اور جھوٹ وتہمت کا طوفان خاموش ہوگیا)

" فورة " بھڑکنے اور مشتعل ہونے کو کہتے ہیں، جملے کا لفظی معنی یہ ہے کہ جھوٹ اور باطل کی طغیانی ختم ہوئی اب کسی ابوسفیان اور ابوجہل کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ اسلام کے مقابلے میں علم بغاوت بلند کریں اور لوگوں کی جہالت اور حماقت سے فائدہ اٹھا کر ان پر حکومت کریں۔

(۴) " وخمدت نیران الکفر "

(اور الحاد کی آگ بجھ گئی)

" نیران " آگ کو اور " خمود " آگ کے شعلوں کے نابود ہونے کو کہتے ہیں۔ تمہارے اتحاد و یکجہتی اور تمہاری پیغمبر (ص) اور ہم اہل بیت کی پیروی اس بات کا سبب بنی کہ مشرکین اسلام کے سامنے تسلیم ہوجائیں اور کفر کی آگ نیز جھوٹ وفریب کی طغیانی خود بخود ختم ہوجائے۔

(۵) " وھدات دعوة الھرج "

(فتنہ وآشوب کی موجیں رک گئیں)

تمہارے ایثار اور قربانی نیز تمہاری پیغمبر (ص) کی پیروی کے نتیجے میں فتنہ وآشوب کی جانب بلانے والوں کی آوازیں دب گئیں اور آج کی اصطلاح میں " آنارشیزم " کے حامی خاموش ہوگئے۔ فسادی سرداروں کی طاقت مضمحل ہوگئی اور لوگوں کو حق وعدالت کی شاہراہ پر گامزن ہونے کی آزادی مل گئی۔

(۶) " واستوسق نظام الدین "

(اور دین کا نظام حکومت ہم آہنگ برقرار ہوگیا)

" استیساق (۱) " یعنی متصل، منظم اور مرتب ہونا۔ مقصد یہ ہے کہ بہت ساری جنگوں، زحمتوں اور

۱۔ استیساق مثال واوی ہے اصل میں استوساق باب استفعال کا مصدر تھا اعلال کی وجہ سے استیساق بنا، کیونکہ اگر واو ساکن ہو اور اس سے پہلے کسرہ ہو تو وہ یاء میں بدل جاتی ہے۔

کافی جد وجہد کے بعد نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کا دینی نظام حیات منظم ہوگیا اور اسلامی حکومت برقرار ہوگئی اس طرح اسلام کو عظمت وشوکت ملی.

انقلاب کے بعد رجعت پسندی کے آثار:

(۱) " فانی حرتم بعد البیان ؟"

(پس ان بیانات کے بعد تم حیران کیوں ہو۔ یا حق سے کیوں روگردانی کررہے ہو ؟۔)

بعض نسخوں میں " جرتم " مذکور ہے بنابریں معنی یہ ہوگا کہ حق واضح ہونے کے بعد پھر تم جرم اور ظلم کا ارتکاب کیوں کرتے ہو، لیکن اس معنی کے بجائے وہی " حرتم " والا جملہ صحیح ہے، " حرتم، حار یحور " اور " حار یحار " دونوں سے آیا ہے اور حیرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے. مذکورہ کلام کا مقصد یہ ہے کہ: امامت ورہبری اور اس کے شرائط کے بارے میں، قرآن اور رسول خدا (ص) کے واضح بیانات کے بعد تم کیوں متحیر ہو ؟ گویا رحلت رسول (ص) کے بعد وہ لوگ ایک قسم کی حیرت اور تذبذب کا شکار تھے، ان کی اسی حیرت اور تذبذب سے، عمر اور ابوبکر کے گروہ نے غلط استفادہ کیا تھا، " فانی حرتم " تم کیوں متحیر ہو " بعد البیان " حق کے واضح ہونے کے بعد، قرآن اور پیغمبر اسلام (ص) کے بیانات اور ان کی ہدایات کے بعد حیرت وسرگردانی کی کوئی وجہ ہی نہیں بلکہ حق وحقیقت کی شناخت میں کسی قسم کی حیرت اور تذبذب کا شکار نہیں ہونا چاہیے.

البتہ " حور " رجوع کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے بنابریں مذکورہ جملے کا مطلب یہ ہوگا کہ حقیقت کے بیان اور حق واضح ہونے کے بعد، تم حق سے کیوں پھر گئے اور تم نے باطل کی طرف کیوں رجوع کیا ؟

(۲) " واسررتم بعد الاعلان ؟"

(آشکار کرنے کے بعد چھپاتے کیوں ہو ؟)

چونکہ یہ جملہ پہلے جملے پر عطف ہے لہذا " انی " اس جملے کی ابتداء میں بھی آئے گا. مقصد یہ ہے کہ: تم

نے غدیر خم میں علی الاعلان حضرت علی علیہ السلام کی حمایت کی تھی اور آشکارا ان کے ہاتھوں پر بیعت کی تھی اس کے بعد آج تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ علی الاعلان حق کی حمایت نہیں کرتے ہو؟

"واسررتم" یعنی، حق کے بیان کے سلسلے میں کیوں خفیہ طریقوں کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ "بعد الاعلان" خصوصا چند دن قبل حق کی واضح اور آشکار حمایت کرنے کے بعد اور،

(۳) "ونکصتم بعد الاقدام؟"

(حق کی طرف رخ کرنے کے بعد کیوں پیچھے ہٹ گئے ہو؟)

"نکص ونکوص" پیچھے ہٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے. تم تو سوچ سمجھ رکھنے والے، حقائق کی تشخیص کرنے والے اور حق کی راہ میں کوشش اور قیام کرنے والے تھے. آخر کیا ہوا ہے کہ آج تم پیچھے ہٹ گئے ہو اور خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہو؟ اور حق کی حمایت سے گریزاں ہو، تمہارا کیا خیال ہے کہ ان انحرافات کے بارے میں تم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟

(۴) "واشرکتم بعد الایمان"

(اور ایمان لانے کے بعد تم کس طرح مشرک بن گئے ہو؟)

حق کو پہچاننے کے بعد اس کا دفاع نہ کرنا بھی شرک کی ایک قسم ہے، شرک صرف ذات اور صفات میں کسی کو خدا کا شریک بنانے میں ہی منحصر نہیں ہے بلکہ ایک ایسے شخص کی اطاعت کرنا بھی شرک کی ایک قسم ہے کہ جس سے خدا نے منع کیا ہو یا اس کی اجازت نہ دی ہو، کیونکہ اطاعت بھی ایک قسم کی عبادت اور پرستش ہے اور عبادت صرف اور صرف خدا کی ہونی چاہیے. پیغمبر (ص) اور امام (ع) کی اطاعت در اصل خدا کی اطاعت میں شامل ہے کیونکہ خدا نے ہی ان کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے.

حضرت زہراء (ع) مسجد میں موجود سامعین سے فرماتی ہیں کہ: کسی زمانے میں تم صحیح اور خالص ایمان کے مالک تھے، آج کیوں اپنے عقیدہ کے برخلاف ایک باطل حکومت کے ساتھ تعاون کرتے ہو؟ اور اس باطل حکومت کی اطاعت کر کے شرک کے مرتکب ہوتے ہو؟.

اعتدال پسند اور عہد شکن افراد کا انجام:

حضرت فاطمہ زہراء (ع) قرآنی آیات سے استفادہ کرتے ہوئے خطبے کو جاری رکھتی ہیں۔

" بؤسأ لقوم نکثوا ایمانہم من بعد عہدھم[1]"

(تباہ و برباد ہو وہ قوم جو اپنی قسموں کو توڑتی ہے وہ بھی عہد و پیمان باندھنے کے بعد۔ تاکہ اسلام کا دفاع کریں۔)

" وھموا باخراج الرسول وھم بدء وکم اول مرۃ[2]"

(انہوں نے رسول خدا (ص) کو مدینہ سے باہر نکالنے کا فیصلہ کرلیا تھا

اور انہی لوگوں نے تمہارے خلاف سازش کی ابتداء کی ہے)

یہ آیہ سورہ توبہ کی آیت کا ایک حصہ ہے جو مدینہ کے یہودیوں کی عہد شکنی اور سازش کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور حضرت زہراء (ع) اس آیت کو سقیفہ کے عہد شکن گروہ پر تطبیق کر رہی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ (ع) کی نظر میں ان کی خیانت، یہود مدینہ کی خیانت سے کمتر نہ تھی۔

" اتخشونہم فاللّٰہ احق ان تخشوہ ان کنتم مؤمنین[3]"

(کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ خدا سزاوار تر ہے کہ تم اس سے ڈرو، اگر تم باایمان ہو)

یعنی، کیا تم ان چند لوگوں سے ڈرتے ہو جو سقیفہ میں جمع ہوگئے ہیں اور ڈرامائی انداز میں خلیفہ انتخاب کیا ہے اگر تم خدا پر یقین اور ایمان رکھتے ہو تو خدا اس بات کے لئے زیادہ سزاوار ہے کہ تم صرف اسی سے ڈرو۔

خلاصہ یہ کہ صحابہ لیبر قسم کے افراد تھے لہذا حکومت وقت کے ساتھ ظاہری طور پر ہم آہنگ ہو کر حق اور حضرت علی (ع) کی حمایت نہیں کرتے تھے یہاں حضرت زہراء (ع) ان کی سرزنش کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے شکوہ بھی کرتی ہیں اور فرماتی ہیں تم صرف کھا پی کر آرام کرنا چاہتے ہو اور حق سے دفاع کی راہ میں اپنے آرام و سکون کو خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہو۔

کسی زمانے میں ڈیموکریٹ اور حزب تودہ کے درمیان زبردست مقابلہ تھا تو کسی سے پوچھا گیا کہ تم

۱۔ سورۂ توبہ / ۱۲۔ ۲۔۳۔ سورۂ توبہ / ۱۳۔

ڈیموکریٹ پارٹی کے رکن ہو یا حزب تودہ کے، تو اس نے جواب دیا کہ بھئی! میں عیالدار ہوں۔ اب صحابہ کے لئے کوئی فرق نہیں تھا کہ حکومت حضرت علی (ع) کے ہاتھ میں رہے یا ابوبکر کے ہاتھوں میں. البتہ ان کے لئے جو چیز اہم تھی وہ آسائش اور آرام دہ زندگی تھی، اسی لئے ہر آنے والی حکومت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے تھے!.

خاموشی کی وجہ، دنیا پرستی اور راحت طلبی ہے:

" الا وقد اری ان قد اخلدتم الی الخفض "

(آگاہ رہو! میں جانتی ہوں کہ تم نے ہمیشہ عیاشی اور آسائش کو اپنایا ہے)

" خفض " یعنی، عیاشی اور آسائش. حضرت زہراء (ع) کا مقصد یہ ہے کہ تم اب مبارزہ اور جہاد کو چھوڑ چکے ہو اور راحت کے ساتھ عیاشی کی زندگی گزارنا چاہتے ہو! " اخلدتم " کے لفظ سے شاید یہ سمجھانا مقصود ہے کہ تم ہمیشہ کے لئے دنیا کے دلدادہ بن گئے ہو جس کے نتیجے میں ایثار و قربانی کی صفت کو تم کھو چکے ہو.

" وابعدتم من ھو احق بالبسط والقبض واقویٰھم علیہ "

(خلافت سے اس شخص کو تم نے دور رکھا جو اسلامی ریاست کی باگ ڈور سنبھالنے میں سب سے زیادہ حقدار تھا اور سب سے زیادہ اس پر طاقت رکھتا تھا)

امیر المؤمنین (ع) کا اسلام میں جو مقام تھا، اس لحاظ سے اسلامی حکومت اور خلافت کے آپ (ع) ہی حقدار تھے لیکن تم نے ایسے لوگوں کو اقتدار تک پہنچایا جو اس کی اہلیت نہیں رکھتے تھے.

یہاں کلمہ " احق " ۔ جو کہ اسم تفضیل ہے ۔ کا یہ معنی نہیں کہ کہ دوسرے افراد بھی اس منصب کی اہلیت رکھتے تھے لیکن حضرت علیؑ زیادہ حقدار تھے ۔ بلکہ انحصار کے لئے ہے، یعنی تمام مسلمانوں میں آپؑ کی ذات مبارک ہی ایسی تھی جو اس منصب کی حقدار تھی باقی کسی میں بھی اس مقام کی اہلیت نہیں پائی جاتی تھی ۔ اور یہ جملہ اس آیہ شریفہ کی مانند ہے کہ:

" اذلک خیر ام جنۃ الخلد (۱) " (۔ کیا یہ دنیا کی دلبستگی ۔ بہتر ہے یا بہشت جاویدان ؟) اس آیہ شریفہ کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اس پست دنیا کے ساتھ محبت اور دلبستگی بھی اچھی چیز ہے لیکن اس کے مقابلے میں بہشت زیادہ بہتر ہے ۔ ایسی بات ہرگز نہیں ۔ بلکہ آیہ کا مقصد یہ ہے کہ صرف بہشت جاویدان ہی بہتر اور اچھی ہے اور جتنی بھی خوبیاں اور کمالات ہیں وہ جنت میں ہیں ۔ دنیا میں نہیں ۔

یہاں پر بھی حضرت زہراء (ع) جو فرماتی ہیں کہ: اسلامی ریاست کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے حضرت علیؑ "احق" تھے یعنی، آپؑ کے علاوہ اس مقام کا کوئی اہل ہی نہ تھا۔ آپؑ کا مقصد یہ نہیں کہ غاصبین خلافت بھی اہلیت رکھتے تھے لیکن مولائے متقیان (ع) اس کے زیادہ اہل تھے ۔

" وخلوتم بالدعـة "

(تم نے سکون، آسائش اور عیش و نوش کی وجہ سے خلوت نشینی اختیار کی)

"دعہ" جنگ، سختی و زحمت کے مقابلے میں ہے سکون اور راحت طلبی کو "دعہ" کہا جاتا ہے۔ اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی بے تفاوتی اور آسائش نے ہی غصب خلافت کی راہ ہموار کی تھی، کیونکہ اگر اسلامی اقدار و اہداف سے لوگ وفادار ہوتے تو چند اقتدار کے بھوکے لوگوں کو اس بات کی جرات نہ ہوتی کہ وہ عوام فریبی اور دین، قرآن اور سنت رسول (ص) سے تمسک اور دفاع کے نام پر امامت کی راہ کو منحرف کر دیں اور امامت کو بادشاہت میں تبدیل کرنے کی راہ ہموار کریں ۔

حضرت زہراء (ع)، حضرت علیؑ کو خلافت اور امت کی رہبری سے دور رکھنے کی علت، لوگوں کے سکون اور دنیا پرستی کو قرار دیتی ہیں ۔

" ونجوتہم بالضیق من السعـة "

(اور تم نے وسعت و کشادگی سے ۔ فرار کر کے ۔ تنگ جگہ میں پناہ لے لی ہے)

یعنی، تم نے اس چیز کو چھوڑ دیا جس میں وسعت اور کشادگی تھی اور ایسی جگہ پر چلے گئے جو تنگ ہے ۔ مقصود یہ ہے کہ تم نے برحق اور الٰہی حکومت کو چھوڑ دیا جس میں عدالت اور حق کے لئے وسعت تھی اور باطل حکومت کا رخ کیا جو انسان کے لئے تنگی اور سختی کا سبب ہے، اس طرح تم نے اپنے آپ کو چند خود

خواہ اور جاہ طلب افراد کی خواہشات نفسانی کا شکار بنایا ہے

البتہ یہ جملہ، بحار الانوار میں دوسری عبارت کے ساتھ ذکرا ہوا ہے جو زیادہ مناسب نظر آتا ہے، چونکہ اپنے ماقبل سے مطابقت رکھتا ہے:

" ونجوتم من الضيق بالسعة "

(اور تم نے خود کو، تنگی اور سختی سے، آسائش اور وسعت کی طرف نجات دی)

یعنی، اگر حق کی حمایت کرتے تو یقیناً ابوبکر اور عمر کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑتا اور تم تنگی، سختی اور دباؤ کا شکار ہوتے، لیکن حق کی حمایت کے راستے میں موجود سختیوں سے تم نے اپنے آپ کو نجات دلائی اور ان کی ہمراہی میں راحت و سکون کی زندگی اپنائی!۔

" فمججتم ما وعيتم "

(اس طرح جو کچھ تم نے جمع کیا تھا اسے ہوا میں اڑا دیا)

"مج" اس چیز کو کہا جاتا ہے جو انسان تھوک کر منہ سے باہر پھینکتا ہے۔ جیسے کوئی منہ میں پانی بھر لے اور اس کو باہر پھینک دے۔ مقصود یہ ہے کہ: خالص ایمان جو تمہارا معنوی سرمایہ تھا اور تم نے دل کی گہرائیوں میں محفوظ کیا ہوا تھا سیاست کا رخ بدلتے ہی اور امتحان کا وقت آتے ہی تم نے اس کا سودا کیا اور الٹی کر کے دور پھینک دیا اور حق کو پامال کیا

جاهلیت کی طرف بازگشت:

" ودسعتم الذی توغتم "

(اور جو کچھ تم نے کھایا اسے نکال باہر پھینکا)

"دسع" اونٹ اور جانوروں کی جگالی۔ اور منہ بھر قے کرنے۔ کو کہاجاتا ہے جبکہ "تسوغ" اس خوشگوار چیز کو کہا جاتا ہے جس کو کھانے کے بعد قے کے ذریعے دوبارہ باہر نکالے۔

اس تشبیہ کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کی حقیقت کو حاصل کرنے اور دل کی گہرائیوں میں اتارنے کے

بعد تم نے اسے اپنے سے دور کر دیا اور جس قدر تم نے ۔ پیغمبر (ص) کی زندگی میں ایمان اور انسانیت کے اعتبار سے ۔ ترقی کی تھی ابھی اسی قدر دوبارہ انحطاط اور تنزل کا شکار ہو گئے ہو۔

"دسعتم" واپس لوٹا دیا ہے "الذی تسوغتم" اس چیز کو جسے تم نے خوشی اور مزے سے حلق میں اتارا تھا، یعنی جس ایمان کو تم نے خوشی اور معنوی لذت کے ساتھ قبول کیا تھا اسے مسترد کر دیا، اس طرح تم ایک قسم کے کفر وارتداد کے مرتکب ہو گئے جیسا کہ روایت میں بھی آیا ہے کہ: "ارتد الناس بعد رسول اللّٰہ الا ثلاثۃ ۔ او اربعۃ ۔" (پیغمبر (ص) کے بعد سوائے تین ۔ یا چار ۔ افراد کے، باقی سب مرتد ہو گئے) البتہ جس طرح ایمان کے درجات ہیں اسی طرح کفر وارتداد کے بھی مراتب ہیں ۔ کفر وارتداد کے خفیف مراتب، مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ جمع ہو سکتے ہیں کیونکہ ہر گناہ اس بات کی علامت ہے کہ انسان، خدا کی خدائی، قدرت، قیامت پر مکمل یقین نہیں رکھتا یا اگر یقین رکھتا بھی ہے تو اس یقین میں کمی آگئی ہے۔ عدم یقین کا یہ مرض جس قدر بڑھتا جائے گا کفر وارتداد کے مراتب بھی شدید تر ہوتے جائیں گے اور آخری درجے پر آکر انسان اصطلاحی مرتد بن جاتا ہے۔

"فان تکفروا انتم ومن فی الارض جمیعاً فان اللّٰہ لغنی حمید(۱)"

(پس اگر تم اور روئے زمین کے تمام لوگ کافر ہو جائیں ۔ تو خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ۔

کیونکہ خداوند غنی اور صاحب حمد ہے)

"کفر" کا لغوی معنی پردہ اور ڈھانپنا ہے ۔ لیکن شرعی اصطلاح میں خدا کے منکر کو کافر کہا جاتا ہے ۔ کفر کے مراتب ہیں، کبھی انسان واقعی اسلام کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے اور خدا و پیغمبر (ص) کا انکار کر دیتا ہے، اس صورت میں کافر سے مربوط احکام اس پر لاگو ہوں گے ۔ جو فقہی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں ۔ اور کبھی انسان ایمان کے بعض مراتب اور درجات کو پامال کرتا ہے، اس کو بھی کافر کہا جاتا ہے یعنی اس کے ایمان کے بعض مراتب ڈھانپے گئے ہیں اس طرح کفر کے ہلکے اور

۱۔ سورۂ ابراہیم / ۸۔

خفیف مرتبہ کے حامل شخص کو بھی کافر کہا جاتا ہے (۱).

" فان کفر تم انتم ومن فی الارض جمیعا " اگر تم اور روئے زمین پر بسنے والے تمام لوگ کافر بن جائیں " فان اللہ لغنی حمید " خدا بے نیاز اور صاحب حمد ہے. خدا کو تمہاری ضرورت نہیں، ایسا خیال نہ کریں کہ اپنے کفر کے ذریعے خدا کو نقصان پہنچا سکیں، نہیں ایسا ہرگز نہیں بلکہ تم صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچاؤ گے.

سوز دل اور اتمام حجت:

اس کے بعد حضرت زہراء (ع) اپنے خطبے کو جاری رکھتے ہوئے فرماتی ہیں کہ: یہ بات تمہیں بتادوں کہ اگر میں یہاں آکر خطبہ دیتی ہوں اور فدک اور میرے اور میرے شوہر کے غصب شدہ حقوق کے بارے میں تم سے خطاب اور عتاب کرتی ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ تم سے توقع رکھتی ہوں کہ تم میری اور امیر المؤمنین (ع) کی مدد کرو گے، نہیں ایسی امید نہیں رکھتی ہوں، کیونکہ میں تمہیں پہچان چکی ہوں اور جانتی ہوں کہ تم حق کی خاطر، خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں ہو! بلکہ میں درد دل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اتمام حجت بھی کرنا چاہتی تھی. اسی لئے آپ فرماتی ہیں کہ:

" الا وقد قلت ما قلت ھـذا علیٰ معرفة منی بالخذلة التی خامرتکم "

(آگاہ رہو! جو کچھ مجھے کہنا تھا کہدیا ہے اور میں نے یہ جانتے ہوئے کہ تم ہماری مدد نہیں کرو گے یہ خطاب کیا ہے اور یہ آپ کا حامی نہ ہونا تمہاری روح کی گہرائیوں تک پہنچ چکا ہے)

" خذلہ " یعنی کسی کو بے سہارا چھوڑ دینا، کسی کی مدد نہ کرنا " مخامرة " یعنی مخلوط ہونا۔ کوئی چیز دوسری چیز میں اس طرح حل ہوجائے کہ اس کا جزء بن جائے.

۱۔ علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار، طبع قدیم، ج ۸ ص ۱۲۳ میں ایک اور احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ " ممکن ہے یہاں کفر سے مراد شکر کے مقابلے میں کفران نعمت ہو، جیسا کہ اس آیۂ شریفہ میں ایسا ہی ہے کہ " واذ تاذن ربکم لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید " جب خدا نے اعلان کیا کہ اگر تم شکر گزار ہوگے تو نعمتوں میں اضافہ کروں گا لیکن اگر کفران نعمت کروگے تو بے شک میرا عذاب بہت سخت ہے.

آپؑ فرماتی ہیں کہ میں جانتی ہوں کہ تم ہماری مدد نہیں کروگے اور یہ۔ تعاون نہ کرنا۔ تمہاری روح کا جز بن چکا ہے اور ذات سے مخلوط ہوچکا ہے۔" علی معرفة منی بالخذلة " یعنی تمہارے ساتھ نہ دینے کو میں جانتی تھی" التی خامرتکم " اور یہ ہماری مدد نہ کرنے کا رجحان، تمہاری روح سے گھل مل چکا ہے اور اس کا جزء بن گیا ہے. یعنی اقدار سے بے اعتنائی اور حکمران ٹولے کے مظالم سے بے تفاوتی، گویا تمہاری ذات کا جزء بن چکی ہے اور اس نے تمہیں مخصوص حالت میں بدل ڈالا ہے اور تمہاری یہ۔ سستی۔ اور بے اعتنائی اور لا ابالی ایک عارضی صفت نہیں ہے کہ جس کے تبدیل ہونے کی امید رکھی جائے.

" والغدرة التی استشعرتھا قلوبکم "

(اور میں اس بے وفائی کو بھی جانتی تھی جو تمہارے دلوں میں اتر چکی ہے)

" غدر " ترک کرنے، چھوڑنے کے معنی میں ہے. قرآن شریف میں بھی ارشاد ہوا ہے کہ: " ما لهذا الکتاب لایغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصیٰها[۱] " (یعنی یہ کیسا۔ نامہ عمل۔ لکھا ہوا ہے کہ جس میں چھوٹی۔ سے چھوٹی اور بڑی سے۔ بڑی چیز کو بھی لکھا گیا ہے، یعنی سب اعمال اس میں لکھ دیئے گئے ہیں) اس آیہ کریمہ میں " لایغادر " " لایترک " کے معنی میں آیا ہے یعنی کسی چیز کو چھوڑا نہیں گیا بلکہ سب کو ذکر کیا گیا ہے.

آپؑ کے اس جملے میں لفظ " الغدرة " وفا کے مقابلے میں آیا ہے." وفا " یعنی عہد وپیمان پر عمل کرنا جبکہ " غدرة " یعنی عہد وپیمان پر عمل نہ کرنا اور اسے چھوڑ دینا. آپؑ فرماتی ہیں کہ: تمہارے دلوں میں جو بے وفائی اور خیانت تھی اسے میں۔ پہلے سے۔ جانتی ہوں.

" شعار " اندر پہننے والے۔ جسم سے چپکے ہوئے۔ لباس کو کہا جاتا ہے جبکہ " دثار " اوپر پہننے والے لباس کو کہا جاتا ہے. " شعار، شعر " سے مشتق ہے اور اس لباس کو کہا جاتا ہے جو انسان کو جسم پر اگنے والے بالوں سے چپکا ہوا ہو. اسی طرح " شعار " ہر اس بات اور نعرہ کو بھی کہا جاتا ہے جس پر دل سے

۱۔ سورۂ کہف / ۴۹.

یقین رکھتا ہو، بالکل ہمارے اکثر نعروں کے برخلاف جسے ہم صرف زبان سے جاری کرتے ہیں اور اس کے مطابق عمل نہیں کرتے، اگر ہم زبان سے " امریکہ مردہ باد" کا نعرہ لگائیں لیکن عمل میں امریکی مصنوعات خریدیں اور ہمارا کردار ورفتار اور اخلاق امریکہ کے معیار کے مطابق ہو تو اس وقت "امریکہ مردہ باد" کہنا صرف دکھاوا اور ریاکاری ہے اسے نعرہ نہیں کہا جاسکتا. لہذا حقیقی نعرہ وہ بات ہے جو انسان کے دل وجان سے نکلی ہو اور انسان کو میدان عمل میں لے آئے. در اصل نعرہ، عمل کا پیش خیمہ ہے.

یہاں حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: " استشعرتہا قلوبکم " یعنی بے وفائی اور ہمارے ساتھ خیانت تمہارا شعار اور اندرونی لباس بن چکے ہیں اور یہ صفت تمہارے دل وجان میں جڑ پکڑ چکی ہے. اگرچہ میں جانتی ہوں کہ تم ہماری مدد کرنے والے نہیں ہو لیکن اس کے باوجود تم سے خطاب کر رہی ہوں تاکہ اپنے درد دل اور سوز جگر کا اظہار کر سکوں.

" ولکنہا فیضۃ النفس "

(لیکن یہ سارے شکوے، پیمانہ صبر لبریز ہونے کا نتیجہ تھے)

جب کوئی برتن پانی سے لبریز ہوجاتا ہے تو برتن سے پانی گرنا شروع ہوجاتا ہے اس حالت کو فیضان کہا جاتا ہے. انسان بھی اس برتن کی طرح ہے کہ جب اس کا پیمانہ صبر لبریز ہوجاتا ہے تو دل میں موجود غم وغصہ ابلنے لگتا ہے اور ظاہر ہوجاتا ہے اور انسان کی اس حالت کو " فیضان النفس " کہا جاتا ہے.

حضرت فاطمہ زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: میرے دل میں اس قدر غم وغصہ اور سوز وگداز ہے کہ اب پیمانہ صبر لبریز ہو کر چھلک رہا ہے اسی لئے آئی ہوں تاکہ خطبہ پڑھوں.

" ونفثۃ الغیظ "

(اور یہ ساری باتیں۔ جوش غضب اور اندرونی پریشانی۔ کا اظہار۔ تھا)

جب انسان غضبناک ہوتا ہے تو ایک عرصہ تک اپنے غصے اور غضب کو چھپا کے رکھتا ہے لیکن جب غصہ اور پریشانی حد سے بڑھ جاتی ہے تو پھونک مارنا اور آہ کرنا شروع کر دیتا ہے، اس حالت کو

اصطلاح میں "نفث" یا "نفخ" کہا جاتا ہے "نفث" اور "نفخ" میں یہ فرق ضرور ہے کہ "نفث" میں منہ سے پانی کے قطرے بھی ساتھ نکلتے ہیں اور "نفخ" میں خالی ہوا خارج ہوتی ہے۔

" ونفثة الغیظ " یعنی یہ باتیں، جوش غضب اور دلی پریشانی کی وجہ سے کہ رہی ہوں۔

" وخور القناة "

(اور نیزہ کی انی کند اور بیکار ہے۔ کہ جس کی وجہ سے میں یہ باتیں کر رہی ہوں۔)

" خور " یعنی ٹوٹ جانا، کند ہونا، کمزور ہونا "قناۃ" یعنی نیزہ کی انی۔ آپؑ نے اپنے مقصد کو بہتر سمجھانے کے لئے تشبیہ سے کام لیا ہے۔ "خور القناۃ" یعنی نیزہ کا کند ہوکر ناقابل استفادہ ہونا، جب نیزہ کی انی کند ہوکر ناقابل استفادہ ہوجائے اور دشمن کے مقابلے میں کوئی اور چارہ بھی نہ ہو تو آہستہ آہستہ انسان کا صبر و حوصلہ ساتھ دینا چھوڑ دیتا ہے۔ لہذا حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: میرے اوپر جو ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے گئے۔ اور علیؑ جیسا اسلحہ، مظلوموں کی تلوار اور اسلحہ، اسلام کے اہم تر مفادات کی خاطر کند ہوکر نیام میں ہے۔ تو اس حالت نے مجھے تڑپا دیا اور مضطرب و بے تاب ہوکر میں یہاں پہنچی ہوں تاکہ تمہیں اپنے درد دل سے آگاہ کروں۔

حضرت زہراء (ع) اگرچہ معصوم تھیں لیکن پھر بھی ایک انسان ہیں جیسا کہ وہ بھوک و پیاس کا احساس کرتی تھیں بالکل اسی طرح جب آپؑ اسلام کے اندر ہونے والے انحرافات کو دیکھتی تھیں تو آپؑ کے غم و غصہ میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ صبر و بردباری کا یہ بلند پہاڑ جوش غیظ و غضب نے آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑا۔

" وبثة الصدر "

(تاکہ اپنے درد دل اور سوز و گداز کا اظہار کرسکوں)

" بث " یعنی، واقف کرنا، آشکار کرنا، پراکندہ حالی۔

یہاں مقصود یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے درد دل اور رنج و غم سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔ قرآن میں بھی۔ " بث " پراکندہ حالی اور آشکار کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

" انما اشکو بثی وحزنی الی اللّٰہ (۱) " (میں اپنے غم واندوہ اور پراکندہ حالی کی شکایت صرف خدا سے کرتا ہوں) .

" وتقدمة الحجة "

(تا کہ تم پر اتمام حجت کرسکوں)

یعنی، میں نے ان باتوں کے ذریعے صرف اپنے درد دل اور غم واندوہ کا اظہار کیا ہے اور تم پر اتمام حجت۔ وگرنہ فدک اور خلافت تو معلوم ہے کہ ہمیں نہیں دوگے اور تم ایسے افراد نہیں ہو جو ہماری مدد کرو .

سازش کے خاتمے کی تصویر کشی:

" فدونکموها "

(پس ۔فدک۔ پر قابض رہو)

اس سے قبل بھی آپؑ نے فرمایا تھا کہ: فدک (۲) کو کجاوہ کسا ہوا اور لگام ہاتھ میں لیا ہوا اونٹ سمجھ کر اس پر سوار ہوجاؤ اور جس قدر چاہو اسے دوڑاؤ اور یہ جان لو کہ قیامت نامی کوئی دن بھی ہے. آپؑ یہاں پر بھی فرماتی ہیں کہ: فدک پر قابض ہوجاؤ اور اسے اپنی ملکیت میں داخل کردو، لیکن یہ تمہیں بتائی ہوں کہ تمہارے لئے یہ کام آسان نہ ہوگا کیونکہ قیامت تک، انسانی تاریخ اس حقیقت کو بیان کرتی رہے گی اور تم رسوا ہوتے رہو گے، قیامت کے دن بھی خدا اور رسول خدا (ص) کے سامنے جواب دینا پڑے گا .

" فاحتقبوها "

(پس اس بار اور وزن کی رسی کو پالان پر مضبوطی سے باندھ لو)

" حقب " اس رسی کا نام ہے کہ جسے اونٹ کے شکم کے نیچے سے نکال کر لدے ہوئے سامان کو

۱۔ سورۂ یوسف / ۸۶ .

۲۔ ممکن ہے یہاں ضمیر " ھا " سے خلافت مراد ہو .

مضبوطی سے باندھ دیا جاتا ہے۔

"احتقبوھا" یعنی پالان اور اس پر لادے ہوئے سامان کو باندھ دو، پھر اس کو اونٹ کے شکم کے نیچے سے رسی کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دو، لیکن یہ یاد رکھو کہ یہ اونٹ جس طرح تم سمجھتے ہو عیوب سے خالی نہیں ہے(۱) کیونکہ:

"دبرة الظهر"

(اس کی پیٹھ زخمی ہے)

یعنی خلافت کی اونٹنی سے جس طرح تم سواری لینا چاہتے ہو وہ تمہیں سواری نہیں دے گی۔

"نقبة الخف"

(اس کی ٹانگیں کمزور اور ناتواں ہیں)

"خف" یعنی اونٹ کی ٹانگیں، "نقب" یعنی سست اور کمزور، "نقبة الخف" یعنی اونٹ کی ضعیف اور کمزور ٹانگیں۔

واضح سی بات ہے کہ جب اونٹ کی ٹانگیں سست، ضعیف اور کمزور ہوں تو وہ زیادہ دور تک نہیں چل سکتا۔ مقصد یہ ہے کہ فدک یا خلافت اس راہوار اونٹ کی طرح نہیں ہے جو بے عیب ہو اور تم آسانی سے اس پر سوار ہو سکو۔

"باقية العار"

(اس کا ننگ و عار تمہارے لئے ہمیشہ باقی رہے گا)

آنے والی نسلیں یہ کہیں گی کہ مسلمانوں کے خلیفہ نے، پیغمبر (ص) کی ۔ اکلوتی ۔ بیٹی کا مسلم حق غصب کیا اور اس پر قبضہ جمالیا ہے یا یہ کہ اس نے ۔ اہلیت نہ رکھتے ہوئے بھی ۔ خلافت کو غصب کیا ہے۔

۱۔ جیسا کہ علامہ مجلسیؒ نے بحار میں فرمایا ہے کہ: باب افتعال سے "احتقبوھا" کے بجائے باب افعال سے "احقبوھا" زیادہ مناسب ہے لیکن جو لفظ روایت میں مذکور ہے اور معنی کے اعتبار سے، اکٹھا کر کے باندھنے کے معنی میں آتا ہے وہ "فاحتقبوھا" ہی ہے "ھاء" کی ضمیر سے فدک یا خلافت مراد ہے اور ایک ایسی معیوب اونٹنی سے تشبیہ دی گئی ہے جو سوار ہونے کے لئے آمادہ کی گئی ہو۔

" موسومة بغضب اللّٰہ۔ الجبار۔"

(خدا کے غضب کا داغ اس پر لگ چکا ہے)

"موسومہ، وسم" کا اسم مفعول ہے۔ "وسم" گرم لوہے سے کسی کی جلد پر نشان لگانے کا نام ہے اور "موسومہ" اس چیز کو کہا جاتا ہے جس پر مذکورہ نشان لگ چکا ہو۔

یعنی، تم نے سوچے سمجھے بغیر جو قدم اٹھایا ہے اور چند مفاد پرست عناصر کے گرد جمع ہو کر ہر چیز کو تہس و نہس کر دیا ہے اس کے اثرات اتنی جلدی ختم نہیں ہوں گے بلکہ یہ لوہے سے لگائے ہوئے داغ کی علامت کی طرح ہمیشہ باقی رہے گا۔

" وشنار الابد "

(۔ تمہارے لئے۔ دائمی ننگ ور سوائی کا باعث بنے گا)

" موصولة بنار اللّٰہ الموقدة "

(۔ فدک یا خلافت کا غصب۔ تمہیں خداوند کے۔ قہر و غضب کے۔ بھڑکتے شعلوں تک پہنچا دے گا)

" التی تطلع علی الافئدة "

(وہ آگ جو دلوں پر چھا جائے گی۔ یعنی دل کو بھی جلا دے گی۔)

یعنی فدک یا خلافت کا غصب کرنا۔ تم جس قدر آسان اور زود گزر سمجھتے ہو ایسا نہیں بلکہ۔ دنیا میں تمہاری رسوائی اور قیامت میں خدا کے۔ دردناک۔ عذاب میں مبتلا ہونے کا سبب بنے گا۔ یہ جملہ بعینہ قرآن سے ماخوذ ہے[۱]۔

" فبعین اللّٰہ ما تفعلون "

(تم جو کچھ کر رہے ہو اسے خداوند دیکھ رہا ہے)

یہ۔ ساری خیانتیں اور مظالم کہ۔ جن کے تم مرتکب ہو رہے ہو اسے خداوند دیکھ رہا ہے اور اس پر گواہ ہے۔ یعنی تم یہ خیال نہ کرو کہ تم نے جو ظلم و ستم کئے ہیں اس سے خدا غافل ہے اور خدا اسے نہیں

۱۔ سورۂ ہمزہ / ۷۔

جانتا، بلکہ خدا تمہاری ہر حرکت اور تمہارے تمام کاموں کو دیکھ رہا ہے اور اس سے آگاہ ہے۔ پھر آپؑ۔ ظالموں کو انجام بد سے متعلق۔ قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

" وسیعلم الذین ظلموا ایّ منقلب ینقلبون(۱)"

(ستم کار لوگ عنقریب جان لیں گے کہ ان کا انجام کیا ہوگا)

" وانا ابنة نذیر لکم، بین یدی عذاب شدید "

(میں اسی پیغمبر کی بیٹی ہوں جو تمہیں خدا کے سخت۔ اور دردناک۔ عذاب سے ڈرانے کے لئے آیا تھا)

رسول خدا (ص) آئے تھے تاکہ تمہیں سخت ترین عذاب سے ڈرائیں اور میں اسی پیغمبر (ص) کی بیٹی ہوں، پس تم خدا سے ڈرو۔ اور مجھ پر ظلم نہ کرو۔!

" فاعلموا انا عاملون وانتظروا انا منتظرون(۱)"

(تم جو چاہو کرو، ہم بھی اپنا کام کر گزریں گے۔ قیامت اور خدا کے عذاب کا۔ تم انتظار کرو ہم بھی انتظار کرتے ہیں)

یہ جملہ بھی قرآن سے ماخوذ ہے اور یہاں جو امر کے دو صیغے آئے ہیں " فاعلموا " اور " وانتظروا " یہ دھمکی دینے کے معنی میں آتے ہیں۔ در اصل آپؑ اس دور کے لوگوں کو یہ بتانا چاہتی تھیں کہ آج تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو اور جس قدر ظلم و ستم کر سکتے ہو کرو، لیکن یہ جان لو کہ قیامت کے دن ان تمام کاموں کا جواب دینا پڑے گا اور وہاں خدا ہر ایک سے حساب لے گا۔

یہاں تک پہنچ کر مسجد میں حضرت زہراء (ع) کی تقریر ختم ہوتی ہے اور اس کے بعد ابوبکر آپؑ کے جواب میں کچھ مطالب بیان کرتا ہے اور پھر دوبارہ آپؑ تقریر فرماتی ہیں کہ جس کے بارے میں انشاء اللہ آنے والے درس میں بحث کریں گے۔

والسلام علیکم ورحمة اللّٰہ وبرکاتہ

۱۔ سورۂ شعراء / ۲۲۷۔

۲۔ سورۂ ھود / ۱۲۱۔ ۱۲۲۔

دسواں درس:

- گزشتہ بحث کا خلاصہ
- ابوبکر کی ریاکارانہ باتیں
- ابوبکر کی زبانی، عترت رسول (ص) کا مقام
- غصب فدک کی عوام فریبانہ توجیہہ
- ملت کا ارادہ یا پانچ آدمیوں کی ذاتی خواہش
- ابوبکر کو حضرت فاطمہ (سلام اللہ علیہا) کا جواب
- سقیفہ کے سرداروں کی خیانت
- دشمنوں کے شبہات اور قرآن
- ابوبکر کا نیا حربہ

فَأَجابَها أَبُوبَكر عَبْدُالله بْنُ عُثمان، وَ قالَ: يا بِنْتَ رَسُولِ‌الله ﷺ، لَقَدْ كانَ أَبُوكِ بِالْمُؤْمِنينَ عَطُوفاً كَريماً، رَؤُوفاً رَحيماً؛ وَ عَلَى الكافِرينَ عَذاباً أَليماً، وَ عِقاباً عَظيماً؛ إِنْ عَزَوْناه وَجَدْناهُ أَباكِ دُونَ النِّساء، وَ أَخا إِلْفِكِ دُونَ الأَخِلاء؛ آثَرَهُ عَلى كُلِّ حَميم، وَ ساعَدَهُ في كُلِّ أَمرٍ جَسيم؛ لايُحِبُّكُمْ إِلّا سَعيدٌ وَ لايُبْغِضُكُمْ إِلّا شَقِيٌ بَعيد؛ فَأَنْتُمْ عِتْرَةُ رَسُولِ‌الله الطَّيِّبُونَ، وَ الْخِيَرَةُ الْمُنْتَجَبُونَ، عَلَى الْخَيْرِ أَدِلَّتنا، وَ إِلَى الجَنَّةِ مَسالِكنا؛ وَ أَنْتِ يا خِيَرَةَ النِّساء، وَ ابْنَةَ خَيْرِ الأَنْبِياء، صادِقَةٌ في قَوْلِكِ، سابِقَةٌ في وُفُورِ عَقْلِكِ، غَيْر مَرْدُودَة عَنْ حَقِّكِ، وَ لامَصْدُودَة عَن صِدْقِكِ؛ وَ الله ما عَدَوْتُ رَأْيَ رَسُولِ‌الله ﷺ، وَ لاعَمِلْتُ إِلّا بِإِذْنِهِ، و إِنَّ الرّائِدَ لايَكذب أَهْله؛ وَ إِنّي أُشْهِدُ الله و كَفى به شَهيداً، أَنّي سَمِعْتُ رَسُولَ‌الله ﷺ يَقُول: «نَحْنُ مَعاشِرَ الأَنْبِياءِ لانُوَرِّثُ ذَهَباً وَ لافِضَّةً وَ لاداراً وَ لاعقاراً و إِنَّما نُوَرِّثُ الْكِتابَ و الْحِكْمَةَ وَ الْعِلْمَ و النُبوَّة، وَ ما كانَ لَنا مِنْ طعمة فَلِوَلِيِّ الأَمْرِ بَعْدَنا أَنْ يَحْكُمَ فيهِ بِحُكْمِهِ» وَ قَدْ جَعَلْنا ما حاوَلتِهِ فِي الكراع و السلاح يُقاتِلُ بِها الْمُسْلِمُونَ وَ يُجاهِدون الكُفّار، وَ يُجادِلونَ المردة الفُجار، وَ ذلِكَ بِإِجْماعٍ مِنَ الْمُسْلمين، لَمْ أَنْفَرِدْ بِهِ وَحْدي، وَ لَمْ أَسْتَبِدَّ بِما كانَ الرَّأي عِنْدي، وَ هذِهِ حالي وَ مالي، هي لَكِ وَ بَيْنَ يَدَيْكِ، لانزوي عَنْكِ، وَ لاندخر دُونَكِ، وَ أَنْتِ سَيِّدَةُ أُمَّةِ أَبيكِ، و الشَّجَرةُ الطَّيِّبَةُ لِبَنيكِ، لاندفع مالك مِنْ فَضْلِكِ، وَ لانوضع مِنْ فَرْعِكِ وَ أَصْلِك، حُكْمُكِ نافِذٌ فيما مَلَكَتْ يَداي، فَهَلْ ترينَ أَنْ أُخالف في ذلِكَ أَباكِ ﷺ.

فقالت ؑ: سُبْحانَ الله، ما كانَ أَبي رَسُولُ‌الله ﷺ عَنْ كِتاب الله صادِفاً وَ لا لِأَحْكامِهِ مُخالِفاً! بَلْ كانَ يَتَّبِعُ أَثَرَهُ، وَ يَقْفُو سُوَرَه، أَفَتَجْمَعُونَ إِلَى الغدر إِعتِلالاً عَلَيْهِ بِالزُور وَ الْبُهْتانِ، وَ هذا بَعْدَ وَفاتِهِ شَبيهٌ بِما بُغِيَ لَهُ مِنَ الغَوائل في حَياتِه، هذا كِتابُ الله حُكماً عَدْلاً، وَ ناطقاً فَصْلاً، يَقُول: ﴿يَرِثُني وَ يَرِثُ مِنْ آل يعقوب[1]﴾ [و يقول:] ﴿وَ وَرِثَ سُلَيْمانُ داوُودَ[2]﴾ فَبَيَّنَ عَزَّوَجَلَّ فيما وزع مِنَ الأَقْساطِ، وَ شرع مِنَ الْفَرائِض وَ الميراث، وَ أَباحَ مِنْ حَظِّ الذكران وَ الإِناث، ما أَزاحَ بِهِ عِلَّةَ المُبْطِلينَ، وَ أَزال التَّظَنّي وَ الشُّبهات فِي الغابِرين؛ كَلّا بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أمراً، فَصَبْرٌ جميلٌ وَاللهُ الْمُسْتَعانُ عَلى ما تَصِفُونَ.

فَقالَ أَبُوبكر: صَدَقَ‌الله وَ صَدَقَ رَسُوله، وَ صَدَقَتْ إِبْنَتُه، أَنْتِ مَعْدنُ الْحِكْمَةِ وَ مَوْطِنِ الْهُدى و الرَّحْمَة، وَ رُكْنِ الدين، وَ عَيْنِ الحُجَّة، وَ لا أُبعد صوابكِ، وَ لا أُنكر خِطابكِ، هؤُلاءِ الْمُسْلِمونَ بَيْني وَ بَيْنك، قَلَّدُوني ما تقلَّدْت، وَ بِاتِّفاقٍ مِنْهُمْ أَخَذْتُ ما أَخَذْتُ، غَيْر مكابرٍ و لا مستبدٍ، وَ لا مُستأثرٍ، وَ هُمْ بِذلِكَ شُهودٌ.

***

---

۱. مريم: ۶

۲. نمل: ۱۶.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبہ نستعین

گزشتہ بحث کا خلاصہ:

گزشتہ دروس میں ہم نے حضرت زہراء(ع) کے خطبہ کو پڑھا اور یہ کہا کہ: آپؑ نے مسجد میں یہ خطبہ ارشاد فرمایا اور ابوبکر اور دوسرے افراد جنہوں نے خلافت کو غصب کیا تھا اور اسلام اور رہبری کو انحراف کا شکار بنایا تھا ان پر اعتراض کیا، مسجد میں موجود انصار و مہاجرین سے خطاب کر کے فرمایا کہ:

"اس عظیم فتنے اور انحراف کے مقابلے میں تم کیسے خاموش ہو؟ یہاں تک کہ حق ضائع ہو گیا ہے اور اسلام کے اندر بہت بڑے انحراف کی بنیاد رکھی گئی ہے اور تم نے کوئی اقدام نہیں کیا ہے! تم جو عرب کے دلیر اور شجاع افراد شمار ہوتے تھے اور بہت ساری جنگیں لڑیں اور مبارزہ کیا اور اسلام کا دفاع کیا، ہمیشہ تم رسول خدا (ص) اور اہل بیت (ع) کے مدد گار اور فرمانبردار رہے، لیکن ابھی تمہاری حالت یہ ہے کہ تم نے ابوبکر کو خلیفہ بنایا اور اس نے ہم سے فدک چھینا لیکن تم خاموش رہے اور اس پر کوئی مخالفت یا اعتراض نہیں کیا آخر کیوں؟".

۔ اسلام کے لئے اہل بیتؑ اور انصار کی خدمات نیز قرآن سے ارث کے مسئلے پر مستدل گفتگو کرنے کے بعد۔ آپؑ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

"اگر اس وقت تم سے خطاب کر رہی ہوں تو اس امید پر نہیں کہ تم ہماری مدد کرو گے اور ہمارے

غصب شدہ حقوق واپس دلاؤ گے، کیونکہ تم دنیا کے دلدادہ بن چکے ہو اور عیش وعشرت کی زندگی گزار نے کی تمنار کھتے ہو، چونکہ تم دنیا اور اس کے مقام ومنصب کے طالب ہو، اسلام کے اقدار اور پیغمبر (ص) کی تعلیمات سے بے رخی برتنے لگے ہو، لہذا ابوبکر اور اس کی غاصب حکومت سے ساز باز اور سودا بازی پر خود کو مجبور پاتے ہو۔

اس خطاب سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اپنے درد دل، سوز وگداز اور مظلومیت کا اظہار کروں اور تم پر اتمام حجت کروں"۔

ابوبکر کی ریاکارانہ باتیں:

یہاں پر ابوبکر، حضرت زہراء (ع) کے خطبے کا جواب دیتا ہے، اس واقعہ کو مکمل نقل کرنے کی خاطر ہم یہاں پر ابوبکر کی باتوں کو بھی سنتے ہیں، یہاں جس نکتے کی طرف توجہ دینا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ابوبکر بظاہر حضرت زہراء (ع) کی بڑی عزت کرتا ہے اور ایک خاص پالیسی کے تحت حضرت زہراء (ع) کے خطبہ کا جواب اس طرح دینا چاہتا ہے کہ وہ خود کو بری ءالذمہ کرے ۔ تاکہ حاضرین بھی مشتعل نہ ہوں، غصب فدک کے ظالمانہ اقدام کو حق بجانب اور اپنا شرعی فریضہ قرار دے نیز خود کو اہل بیتؑ کا مخلص اور وفادار ظاہر کرے ۔ کیونکہ اس کو علم ہے کہ وہاں سب حضرت زہراء (ع) کو پہچانتے ہیں لہذا یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپؑ ۔ العیاذ باللہ ۔ جھوٹ بول رہی ہیں اور آپؑ کی یہ باتیں درست نہیں ہیں ۔ اسی لئے وہ آپؑ کے کلام کی تردید کے لئے دوسری راہ کا انتخاب کرتا ہے ! ۔

" فاجابها ابوبكر عبد الله بن عثمان [1] وقال "۔

(پھر ابوبکر عبداللہ بن عثمان نے آپؑ کو جواب دیتے ہوئے کہا :)

" يا بنت رسول الله (ص) لقد كان ابوك بالمؤمنين عطوفاً كريماً رؤوفاً رحيماً "

(اے دختر پیغمبر (ص) ! بے شک آپ کے بابا مومنین پر شفیق، مہربان، دلسوز اور صاحب کرم تھے)

۱۔ ابوبکر کا نام عبداللہ اور اس کے باپ کا نام عثمان تھا۔

" علی الکافرین عذاباً وعقاباً عظیماً "

(جبکہ کفار کے لئے خدا کا دردناک عذاب اور عظیم عقاب تھے)

ابوبکر ان کلمات کے ذریعے یہ بتانا چاہتا تھا کہ اے دختر پیغمبر (ص) آپؑ اپنے بابا کی طرح ہم پر مہربان بنیں اور شفقت ورحمت کے ساتھ پیش آئیں، اس طرح وہ اپنی ان باتوں سے حضرت زہراء (ع) کو کالعدم اور مسجد کی فضاء کو اپنے حق میں تبدیل کرنا چاہتا تھا!!

" ان عزوناہ وجدناہ اباک دون النساء "

(اگر ہم ان کے نسب کی جستجو کریں تو آنحضرت (ص) کو صرف آپؑ کے بابا پاتے ہیں نہ کہ دوسری عورتوں کے)

یہ آپؑ کے کلام کی طرف اشارہ اور اس کی تصدیق ہے کہ خطبے کی ابتداء میں آپؑ نے فرمایا تھا کہ: "اگر تم پیغمبر (ص) کے نسب کو پہچانتے ہو تو معلوم ہو گا کہ وہ میرے والد گرامی ہیں دوسری عورتوں کے باپ نہیں" ابوبکر اس بات کی تصدیق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم بھی جانتے ہیں کہ پیغمبر (ص) دوسری عورتوں کے نہیں بلکہ آپؑ کے ہی والد گرامی ہیں.

" واخا الفک دون الاخلاء "

(اور پیغمبر (ص) دوسرے دوستوں کے نہیں بلکہ آپؑ کے شوہر کے بھائی اور آپؑ سے انس رکھتے ہیں)

" اخلاء، خلیل " کی جمع ہے اور اس کا معنی " دوست " ہے " الف " یعنی انس و محبت، کنایہ ہے مونس اور ہمدم سے کہ جو حضرت علی (ع) تھے ۔ " اخلاء " کے لفظ کے ذریعے ابوبکر یہ چاہتا ہے کہ ظالموں کو بھی پیغمبر (ص) کا دوست اور اسلام کا خیر خواہ ظاہر کرے ۔

" وآثرہ علی کل حمیم "

(اور پیغمبر (ص) نے آپؑ کے شوہر اور مونس کو دوسرے تمام رشتہ داروں پر مقدم فرمایا)

" حمیم " انسان کے قریبی رشتہ دار کو کہتے ہیں .

" ساعدہ فی کل امر جسیم "

(ہر مشکل کام میں رسول خدا (ص) آپؑ کے شوہر کی ہمراہی فرماتے تھے اور ان کا ساتھ دیتے تھے)

ممکن ہے ان دو جملوں سے یہ مقصود ہو کہ حضرت علیؑ پیغمبر اسلام (ص) کو ہر قریبی رشتہ دار پر مقدم رکھتے اور ہر مشکل کام میں آنحضرت (ص) کی مدد کرتے تھے۔

ابو بکر کی زبانی، عترت رسول (ص) کا مقام:

"لا یحبکم الا سعید ولا یبغضکم الا شقی"

(سوائے سعادتمند شخص کے کوئی آپ اہل بیتؑ کو دوست نہیں رکھتا

اور سوائے بد بخت اور خدا کی رحمت سے دور شخص کے کوئی آپؑ سے دشمنی نہیں رکھتا)

ابو بکر یہاں اپنی ذہانت اور سیاست کو کام میں لاتا ہے اور حضرت زہراء (ع) کے ساتھ بظاہر احترام سے پیش آتا ہے، سیاستدان طبقہ ہمیشہ ظاہری طور پر اچھی رفتار کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن پیچھے سے خنجر گھونپ دیتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ "پہلے انگریز جب سنتے تھے کہ کچھ افراد ان کو گالی دیتے ہیں تو وہ ہنستے تھے اور کبھی کبھار بعض اخبارات کو پیسے بھی دیتے تھے تاکہ انہیں فحش و دشنام دیں اور وہ کہتے تھے کہ کوئی بات نہیں یہ ہمیں چند گالیاں دیں کیونکہ یہ لوگ گالی دینے کے علاوہ ہم سے کوئی کام نہیں رکھتے ہم ان کا تیل لے جانا چاہتے ہیں ہمیں چند گالیاں دے کر ان کو دل خوش کرنے دو!! سیاسی لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں!!۔

یہاں ابو بکر بھی حضرت زہراء (ع) کے ساتھ بڑے احترام سے پیش آتا ہے اور یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ہم آپؑ اور حضرت علیؑ کے مقام و منزلت اور فضیلت کا اقرار کرتے ہیں، البتہ وہ اہل بیتؑ کی فضیلت کا انکار بھی نہیں کر سکتا تھا اور اگر تلخی اور تندی سے جواب دیتا تو اس پر اعتراض ہونے اور لوگوں کے جذبات کو اپنے خلاف بھڑکانے کا خدشہ تھا، لہذا اس نے ہوشیاری اور نرمی سے آپؑ کا جواب دیا ہے اور اسی ضمن میں وہ اپنی بات بھی کرتا ہے۔ ابو بکر بات کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"فانتم عترۃ رسول اللّٰہ (ص) الطیبون والخیرۃ المنتجبون"

(آپ رسول اللہ (ص) کے پاک و پاکیزہ اہل بیت اور خدا کی برگزیدہ ہستیاں ہیں)

"علی الخیر ادلتنا"

(سعادت و خوشبختی کی طرف ہمارے راہنما اور رہبر آپ اہل بیتؑ ہی ہیں)

"علی الخیر" جار و مجرور "ادلتنا" کے متعلق ہے جو اس پر مقدم ہوا ہے۔

"والی الجنة مسالکنا"

(آپ ہی بہشت کی جانب ہمارا وسیلہ اور نجات کا راستہ ہیں)

"وانت یاخیرة النسآء وابنة خیر الانبیاء صادقة فی قولک"

(اے عورتوں میں سے خدا کی برگزیدہ خاتون اور تمام انبیاء سے بہتر ہستی کی بیٹی! اپنی باتوں میں آپ سچی ہیں)

اس جملہ کی وضاحت کرتے ہوئے ابن ابی الحدید کہتا ہے کہ:

"بغداد کے مدرسہ غربی کے استاد "علی بن الفارق"۔ کہ جو شاید ابن ابی الحدید کے بھی استاد تھے۔ سے سوال ہوا کہ یہاں ابوبکر حضرت زہراء (ع) سے کہتا ہے کہ "آپ صحیح فرماتی ہیں" اگر حضرت زہراء (ع) کی بات صحیح ہوتی تو ابوبکر پر لازم تھا کہ فدک کو واپس کردے کیونکہ حضرت فاطمہ (ع) فرماتی ہیں کہ "فدک میری ملکیت ہے"؟!

اس سوال کا جواب استاد نے یہ دیا کہ: "فدک کو واپس نہ کرنے کا سبب یہ تھا کہ اگر آج آپؑ کی بات مانی جاتی اور فدک واپس کیا جاتا تو دوسرے دن حضرت زہراء (ع) آکر فرماتیں کہ: "میرے بابا نے علیؑ کو مسلمانوں کا خلیفہ و سربراہ مقرر کیا تھا اور غدیر خم سمیت بہت ساری جگہوں پر اس کو۔ خلیفہ کے طور پر۔ پہچنوایا تھا" لہذا ابوبکر نے یہ سوچا کہ اگر آج فدک کو واپس کردوں تو کل خلافت بھی حضرت علیؑ کو واپس کرنا ہوگی، لہذا اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ابتداء سے ہی آپؑ کو مایوس کرے!! (۱)"

بنابریں ابوبکر اپنی ان باتوں کے ذریعے صرف دھوکہ دہی اور سیاسی چال چلنا چاہتا تھا اور ان پر عمل کرنے کا قصد نہیں رکھتا تھا اور بدقسمتی سے اس روش سے عموماً سیاستداں طبقہ استفادہ کرتا ہے اور تاریخ میں کتنے ایسے حقائق ہیں جو اس قسم کی مصلحت پسندی اور سیاست پر قربان کیے گئے ہیں!۔

۱۔ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید ج ۱۶ ص ۲۸۴۔

ابو بکر حضرت زہراء(ع) کو مخاطب کرتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ:

" سابقة فی وفور عقلک "

(اے دختر رسول (ص) عقل ودرایت میں آپ (ع) بہت آگے ہیں)

" غیر مردودة عن حقک "

(آپؑ کو اپنے حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا، آپؑ کو حق ضرور ملنا چاہیئے)

" ولا مصدودة عن صدقک "

(آپؑ کی ان سچی باتوں کو رد نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان پر عمل ہونا چاہیئے)

میدان سیاست کے کھلاڑی، باتوں اور نعروں کی حد تک ہمیشہ آزادی اور مظلوموں کے حقوق کی بازیابی کے لئے حمایت کرتے ہیں لیکن عملی میدان میں ان کا کردار کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ یعنی، قول وفعل میں تضاد ان کی ایک خصوصیت ہے۔ ابو بکر بھی اسی روش سے استفادہ کرتا ہے اور اپنی جوابی تقریر میں، حضرت زہراء (ع) کے حق، سچائی اور آپؑ کے آزادی بیان کے حق کی حمایت کرتا ہے تاکہ مجمع کو دھوکہ دے کر ان کے جذبات کو قابو میں رکھا جاسکے! (۱)۔

۱۔ ان جملوں سے چند نکتے بخوبی واضح ہوتے ہیں:

۱۔ حضرت زہراءؑ، اجتماعی شخصیت کے طور پر اور معنوی نفوذ کے اعتبار سے اس قدر عظیم مقام رکھتی تھیں کہ اگرچہ آپؑ نے اپنی تقریر سے حکمران طبقے کی حاکمیت اور حکومت کی بنیادیں ہلادی تھیں لیکن اس کے باوجود بھی ابو بکر اور اس کے حواری، علی الاعلان آپؑ کی مخالفت کی جرات نہ کرپائے بلکہ ابو بکر مختلف قسم کے بہانوں سے یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ آپؑ کو قانع اور خاموش کرے۔

۲۔ معاشرے میں موجودہ سیاسی فضا چونکہ عہد رسولؐ سے نزدیک تھی اور اسلامی اقدار اور پیغمبرؐ کی حکومت میں لوگوں کو دی گئی شرعی اور عقلی آزادیاں ابھی کسی حد تک باقی تھیں، لہذا دہشت گردی سیاسی جبر اور اس قدر زیادہ نہ تھے کہ حکومت کے مخالفین اپنی کوئی بات ہی نہ کرسکیں۔

۳۔ اپنے والد بزرگوار کی تربیت کے نتیجے میں آپؑ کا ایمان اور شجاعت وفداکاری کا جذبہ اتنا قوی تھا کہ آپؑ نے ابو بکر اور اس کے حواریوں جیسے ایک طاقتور حکمران طبقے سے ٹکر لی، جو بظاہر قرآن اور سنت کے اسلحہ سے لیس تھا اور آپؑ نے انہیں فریب خوردہ عوام کے سامنے لاکر ان سے جواب طلبی کی اور ان کی بظاہر اسلامی حکومت اور نظام کو غیر شرعی اور ناجائز قرار دیا، اس وقت کے کٹھن سیاسی ماحول میں اس قسم کا گہرا اور عظیم کام، حضرت زہراءؑ کے علاوہ کسی دوسرے شخص سے ناممکن تھا۔

اگرچہ ابوبکر حضرت زہراء (ع) کی صداقت، سچائی اور حق کی تصدیق کرتا ہے لیکن فوراً اپنی باتوں کا رخ بدل دیتا ہے اور پیغمبر اسلام (ص) کی طرف نسبت دیتے ہوئے ایک جھوٹی روایت نقل کرتا ہے تاکہ اپنی غیر معقول حرکت کی توجیہ کرسکے! لہٰذا وہ کہتا ہے کہ:

" واللہ ما عدوت رای رسول اللہ (ص) ولا عملت الا باذنه "

(خدا کی قسم میں نے رسول خدا (ص) کی رائے اور نظریئے سے انحراف نہیں کیا

اور ان کی اجازت کے بغیر یہ کام انجام نہیں دیا ہے)

یعنی، اگر میں نے آپؑ سے فدک چھینا ہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ خود آنحضرت (ص) نے فرمایا تھا کہ: "ہم گروہ انبیاء ارث نہیں چھوڑتے، ہمارا جو بھی مال باقی رہے وہ صدقہ ہے!!"

حالانکہ واقعیت یہ تھی کہ اس روایت کو ابوبکر اور اس کے حواریوں نے جعل کیا تھا اور پیغمبر (ص) کی جانب جھوٹی نسبت دی تھی۔ دراصل ابوبکر اور اس کے طرفداروں کی بنیاد ہی اس بات پر تھی کہ اپنے تمام کاموں کی نسبت پیغمبر (ص) کی طرف دی جائے کیونکہ معاشرے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ تاکہ لوگ ان کی باتوں کو من وعن قبول کریں۔ دوسری طرف سے پیغمبر اکرم (ص) دنیا سے رحلت فرما چکے تھے اور ان کی طرف دی جانے والی غلط نسبتوں کی تردید بھی نہیں ہوتی تھی۔ حضرت علیؑ، فاطمہ زہراءؑ، اہل بیتؑ اور آپؑ کے مخلص اصحاب کہ جو رسول خدا (ص) کے ساتھ گہرے روابط رکھتے تھے اور سالہا سال ان کے ساتھ رہ کر۔ پیغمبر (ص) سے تربیت حاصل کی تھی۔ سب کو گوشہ نشین کردیا تھا اور وہ اظہار حق اور ان ناروا نسبتوں کی تردید و تکذیب کی طاقت نہیں رکھتے تھے، اس مسموم اور گھٹن کی فضا میں، پیغمبر اسلام (ص) کی طرف جعلی اور ناروا نسبت دینے کی بدعت کا آغاز ہوا اور مسلمانوں کو بھی اسی روش اور حربے سے قانع اور خاموش کردیا!۔

ابوبکر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ:

" وان الرائد لایکذب اهله "

(بتحقیق پیش رو۔ راہنما۔ اپنے لوگوں سے جھوٹ نہیں بولتا)

"رائد" عربی میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی لشکر یا قافلہ کے آگے چلتا ہے تاکہ راستہ، پانی اور ٹھہرنے کی جگہ کے بارے میں قافلہ والوں کو صحیح معلومات بہم پہنچائے۔ یہ شخص کبھی جھوٹ نہیں بولتا کیونکہ اگر جھوٹ بولے تو قافلہ والوں کے ساتھ خود بھی ہلاک ہو جاتا ہے۔

اس جملے میں ابوبکر خود کو مسلمانوں کا پیش رو اور راہنما قرار دیتا ہے کیونکہ اب وہ اپنے آپ کو "خلیفة المسلمین" سمجھنے لگا ہے۔ لہذا وہ کہتا ہے کہ "میں آپ کا راہنما اور خدمت گزار ہوں لہذا ہرگز آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا!"

غصب فدک کی عوام فریبانہ توجیہہ،

" وانی اشهد اللّٰه وکفی به شهیداً "

(میں خدا کو گواہ قرار دیتا ہوں اور خدا کی گواہی کافی ہے کہ:)

" انی سمعت رسول اللّٰه یقول،

نحن معاشر الانبیاء لا نورّث ذهباً ولا فضة ولا داراً ولا عقاراً

وماکان لنا من طعمة فلولیّ الامر بعدنا ان یحکم فیه بحکمه "

(میں نے رسول خدا (ص) سے سنا کہ آپ (ص) نے فرمایا:

ہم گروہ انبیاء کوئی ترکہ نہیں چھوڑتے، نہ سونا اور نہ چاندی اور نہ ہی کوٹھی اور زمین،

بلکہ ہم صرف کتاب و حکمت اور علم و نبوت چھوڑ جاتے ہیں،

اور ہمارا مال اور جائیداد ہمارے بعد میں آنے والے حاکم کا ہے وہ اپنی صوابدید کے مطابق اس میں تصرف کرے گا!)

"عقار" یعنی غیر منقولہ جائیداد "طعمہ" وہ چیز جس سے انسان اپنی زندگی میں استفادہ کرے۔

اس حدیث کو ابوبکر، عمر اور ان کے دوسرے چند کارندوں اور خیر خواہوں نے جعل کیا ہے تاکہ غصب فدک کے لئے ایک جواز پیدا کیا جائے۔ دراصل اپنے اس کام کے لئے انہیں کسی دستاویز کی ضرورت تھی لہذا یہ جھوٹی حدیث پیغمبر (ص) کی طرف منسوب کرکے آنحضرت (ص) کی حدیث کو اپنا

شاہد قرار دیا!

شاید کوئی یہ اعتراض کرے کہ ہمارے پاس اصول کافی میں بھی اس قسم کی روایات پائی جاتی ہیں کہ: "انبیاء کوئی ارث نہیں چھوڑتے بلکہ ان کا ارث علم و حکمت ہے"؟

ان کے جواب میں یہ کہنا چاہئے کہ ان روایات کا مطلب یہ ہے کہ: "انبیاء کوئی سرمایہ دار۔ اور وڈیرے۔ تو نہیں تھے کہ قابل توجہ مال اپنے پیچھے ترکہ کے طور پر چھوڑ جاتے بلکہ وہ اپنی امت کے لئے اپنے علم و حکمت کے خزینے ارث میں چھوڑ جاتے تھے۔ ان روایات کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اگر کسی پیغمبر (ص) کے گھر میں کوئی چیز پائی جائے تو وہ اس کی اولاد کو نہ دی جائے۔ اور حکمران طبقہ اس پر قابض ہو جائے۔ بلکہ اس قسم کی روایات کا مقصد یہ ہے کہ امت کو اپنے پیغمبر سے جس چیز کی توقع رکھنی چاہئے وہ علم و حکمت اور آثار نبوت ہیں، نہ کہ مال و ثروت اور دولت و جائیداد۔

معاشرے کی طبقہ بندی کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو انبیاء زر اندوز اور سرمایہ دار طبقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ فقیر، محروم۔ اور مستضعف۔ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انبیاء کے وارث بھی در اصل ان کے مال و ثروت کے نہیں بلکہ معنوی فضائل اور نیک اخلاق کے وارث ہوتے ہیں۔ اگر فدک کو رسول خدا (ص) نے اپنی حیات طیبہ میں حضرت زہراء (ع) کے حوالے کر دیا تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ جائیداد اور ثروت، امامت و ولایت کے گھر میں رہے، تاکہ ان کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے اور امامت کی پیشرفت کے لئے صرف کیا جائے۔ در اصل رسول خدا (ص) نے فدک کو جو ان کے مقام ولایت سے مربوط تھا اپنے بعد آنے والے مقام ولایت کی برحق ہستی کے اختیار میں دے دیا۔ اس سلسلے میں حضرت زہراء (ع) ہی وہ بہترین ہستی تھی کہ پیغمبر (ص) کی طرف سے فدک کا اختیار انہیں تفویض کیا گیا اور فدک کو ان کی ملکیت قرار دیا گیا۔

ابوبکر مزید کہتا ہے کہ: " وقد جعلنا ما حاولته فی الکراع والسلاح "

(فدک کی آمدنی کو ہم نے گھوڑوں اور اسلحوں کی خرید کے لئے مختص کیا ہے)

یعنی، وہ گھوڑے جن میں جنگ کے دوران استفادہ کیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ابوبکر یہ کہنا چاہتا

ہے کہ: رسول خدا (ص) نے فرمایا کہ میری جائیداد میرے بعد ولی امر کے اختیار میں ہوگی جس طرح وہ مصلحت سمجھے اس میں تصرف کرے گا اور چونکہ میں ولی امر مسلمین ہوں لہذا فدک کی آمدنی کو جنگی ساز وسامان پر خرچ کرنا چاہتا ہوں تاکہ مسلمان، اسلام کا دفاع کرسکیں!

" يقاتل بهـا المسلمون ويجاهدون الكفار ويجادلون المردة الفجار "

(تاکہ انکے ذریعے مسلمان جنگ کرسکیں اور کفار کے ساتھ جہاد کرسکیں اور سرکش باغیوں کے خلاف مبارزہ کرسکیں)

"مردۃ، مارد" کی جمع ہے اور سرکش، اور تجاوزگر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

ابوبکر نے یہاں در اصل، اپنی نامعقول حرکت کو مذہبی رنگ دے کر ایک غلط مگر عوام پسند توجیہ پیش کی ہے۔

ملت کا ارادہ یا پانچ افراد کی ذاتی خواہش؟

" وذلک باجماع من المسلمین "

(یہ کام جو میں نے کیا ہے وہ مسلمانوں کے اتفاق رائے سے ہوا ہے)

شاید یہ اتفاق اور اجماع بھی اسی اجماع کی مانند ہو کہ جو ابوبکر کی خلافت کی بنیاد ہے اور جس اجماع کی بنا پر ابوبکر خلیفہ بنا وہ صرف پانچ آدمیوں کا اتفاق اور اجماع تھا (۱)۔

تاریخ کی گواہی کے مطابق سقیفہ میں صرف پانچ آدمیوں نے ابوبکر کی بیعت کی تھی، ان کے نام یہ ہیں، عمر، ابوعبیدہ جراح، اسید بن حضیر، بشیر بن سعد اور سالم (۲)۔

سقیفہ میں ان پانچ افراد نے بیعت کی پھر وہ بیعت مہم پر نکل پڑے اور پروپیگنڈے، دھمکی اور

۱۔ آیت اللہ شہید صدرؒ نے اپنی کتاب "فدک" کے صفحہ ۴۳ میں یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ: سقیفہ میں انتخاب خلیفہ کی بنیاد، ابوبکر، عمر اور ابوعبیدہ جراح کی مثلث تھی کہ جو حکومت پر قبضہ کرنے کے لئے باہم متحد ہوئے تھے اور ایک محاذ تشکیل دے رکھا تھا اسی طرح صفحہ نمبر ۵۸ پر فرماتے ہیں کہ ان تین افراد کی اس پارٹی نے عہدوں کو اس طریقے سے اپنے درمیان تقسیم کرلیا تھا کہ: "خلیفہ اور رہبر ابوبکر، عدلیہ کا سربراہ عمر اور وزیر خزانہ ابوعبیدہ جراح ہوگا..."۔

۲۔ احکام السلطانیہ ماوردی ص ۷۔

تلوار کی نوک سے دوسرے لوگوں سے بھی بیعت لی۔ بعد میں یہ کہنے لگے کے مسلمانوں نے ابوبکر کو خلیفہ مقرر کیا! ابوبکر صاحب کی نظر میں یہ بھی اجماع ہے اور اب جب ہم اہل سنت بھائیوں سے پوچھتے ہیں کہ ابوبکر کی خلافت کی دلیل کیا ہے؟ کہتے ہیں کہ: "مسلمانوں کا اجماع!" جب ہم ان سے کہتے ہیں کہ: بھائی! وہاں تو صرف پانچ آدمیوں نے بیعت کی تھی! اسے کس طرح آپ اجماع مسلمین کہہ سکتے ہیں؟ تو جواب میں کہتے ہیں کہ: "جمع کے لئے تین افراد بھی کافی ہیں، لہذا اگر تین آدمی بھی اتفاق کرلیں تو وہ اجماع کہلائے گا"!!

" لم انفرد به وحدی ولم استبد بما کان الرای عندی "

(یہ صرف میرا فیصلہ نہیں اور نہ ہی میں نے اس میں استبداد سے کام لیا ہے!)

پھر ابوبکر اپنی چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

" وهذه حالی ومالی، هی لک وبین یدیک "

(یہ میری جائیداد ہے کہ جو آپؑ کے سامنے اور آپؑ کے اختیار میں ہے!)

" لا نزوی عنک ولا ندّخر دونک "

(میں اپنے اس ناچیز مال کو آپؑ سے دور اور آپؑ کو محروم کر کے ذخیرہ کرنا نہیں چاہتا ہوں!)

" وانت سیدة امة ابیک والشجرة الطیبة لبنیک "

(حالانکہ آپؑ اپنے بابا کی امت کی مالک اور اپنی اولاد کا شجرۂ طیبہ ہیں)

" لا ندفع مالک من فضلک ولا توضع من فرعک "

(ہم آپؑ کی فضیلت کے منکر نہیں اور نہ ہی آپؑ کی اصل اور فرع۔ حسب ونسب۔ میں کمی کے خواہاں ہیں) یعنی، ہم آپؑ کا بخوبی احترام کرتے ہیں!!۔

" حکمک نافذ فی ما ملکت یدای "

(جو کچھ میرے ہاتھوں میں ہے۔ یعنی میرے اموال پر۔ آپؑ کا حکم نافذ ہے!!)

۔ لیکن جہاں تک فدک کا تعلق ہے تو وہ آپؑ کو واپس نہیں کیا جاسکتا! کیونکہ:۔

" فهل ترین انی اخالف فی ذلک اباک ؟"

(کیا آپ یہ صحیح سمجھتی ہیں کہ میں اس مسئلے۔ یعنی فدک کے بارے میں۔ آپ کے والد گرامی کی مخالفت کروں ؟)

۔یہاں ابوبکر پھر اسی جھوٹی روایت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ: اگر میں فدک کو واپس کروں تو پیغمبر (ص) کی مخالفت ہوگی۔ کیونکہ رسول خدا (ص) نے فرمایا ہے کہ: "ہم انبیاء ترکہ نہیں چھوڑتے اور ہمارا مال اور ہماری ثروت بعد میں آنے والے "ولی امر" کی ہے ۔لہذا میں نے "ولی امر" کی حیثیت سے فدک کو لیا ہے اور جہاد، اسلحہ کی خریداری اور دوسرے جنگی ساز وسامان پر خرچ کروں گا۔ پس میں نے رسول خدا (ص) کی کوئی مخالفت نہیں کی ہے بلکہ انکے حکم کے عین مطابق، میں نے یہ کام کیا ہے (۱)۔

ابوبکر کو حضرت فاطمہ (ع) کا جواب:

" فقالت علیہا السلام:

سبحان اللّٰہ! ماکان ابی رسول اللّٰہ (ص) عن کتاب اللّٰہ صادقاً ولا لاحکامہ مخالفاً "

۱۔ مرحوم سید شرف الدین نے اپنی کتاب "النص والاجتہاد" کے صفحہ ۱۱۳ پر محمود ابوریہ کی یہ عبارت نقل کی ہے کہ:

" حضرت زہراء کے بارے میں ابوبکر کے موقف کے بارے میں یہ کہنا لازم سمجھتا ہوں کہ: اگر ہم قبول بھی کرلیں کہ قرآن کے قطعی قوانین، ظنی روایات کے ذریعے قابل تخصیص ہیں ۔مثال کے طور پر میراث سے مربوط آیات کو "نحن معاشر الانبیاء" والی روایت سے تخصیص لگادیں۔ اور اس کے دائرے کو محدود کریں۔ (جیسا کہ ابوبکر اس کا مدعی تھا) تب بھی ابوبکر کو یہ اختیار حاصل تھا کہ پیغمبر کے ترکہ سے فدک، حضرت زہراء کو بخش دیتا کیونکہ کوئی بھی مسلمان اس امر کا مخالف نہ تھا اور ابوبکر بھی یہ طاقت رکھتا تھا جیسا کہ اس نے پیغمبر اسلام کے ترکہ سے "زبیر بن عوام"، "محمد بن مسلمہ" اور دوسرے بہت سارے افراد کو کچھ نہ کچھ بخشا ہے اور بعد میں عثمان نے فدک کو مروان کے اختیار میں دے دیا ہے " !!!

یہ نقل کرنے کے بعد علامہ شرف الدین فرماتے ہیں کہ:

" ابن ابی الحدید نے چند گزشتہ علماء سے نقل کیا ہے کہ: وہ حضرت زہراء کے بارے میں شیخین کی پالیسی اور موقف پر تعجب کرتے ہیں اور اس کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: "دینی احکام کے علاوہ، شرافت انسانی کا یہ تقاضا تھا کہ یہ دونوں خلیفہ دختر رسول کے ساتھ اس طرح پیش نہ آتے " ۔یعنی ان کا رویہ ،انسانیت سے دور تھا۔ اس کے بعد ابن ابی الحدید کہتا ہے کہ: "اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتا"۔

(پس آپؑ نے فرمایا کہ:

سبحان اللہ!(۱) میرے پدر بزرگوار رسول خدا (ص) نے کبھی قرآن سے روگردانی نہیں کی
اور نہ ہی اس کے احکام کی مخالفت کی ہے)

یعنی، کیا میرا بابا قرآنی احکام کے برخلاف قدم اٹھاتا ہے!(۲) کیونکہ قرآن میں مذکور ہے کہ: "وورث سلیمان داوود(۳)" (سلیمان نے داوود سے ارث پایا).

نیز زکریاؑ کی زبانی نقل کیا ہے کہ: "انی خفت الموالی من بعدی و کانت امراتی عاقراً فهب لی من لدنک ولیّاً یرثنی ویرث من آل یعقوب(۴)" (میں اپنے رشتہ داروں سے خوف کھاتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہو گئی ہے لہٰذا تو اپنی رحمت سے مجھے ایک فرزند عطا فرما جو میرا اور آل یعقوب کا وارث بنے)

قرآن نے صراحتاً بیان کیا ہے کہ: انبیاءؑ ارث چھوڑتے ہیں، یہ کیسی جھوٹی حدیث تم نے بنائی ہے اور رسول خدا (ص) کی طرف نسبت دے رہے ہو کہ آپ (ص) نے فرمایا کہ: "انبیاء ارث نہیں چھوڑتے"! کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ رسول خدا (ص) قرآن کے برعکس بات کیا کرتے تھے؟!!.

"بل کان یتبع اثرہ ویقفو سورہ"

(بلکہ آنحضرت (ص) قرآن کے احکامات کے تابع اور اس کی سورتوں کے مطابق چلتے تھے)

آپؑ یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ کیوں پیغمبر (ص) کی طرف جھوٹی حدیث کی نسبت دیتے ہو؟! حالانکہ پیغمبر (ص) قرآن کے احکام کے تابع تھے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ قرآن کے حکم کے برخلاف کوئی بات کہتے؟!۔ حقیقت میں۔ تم نے خیانت کی اور وہ یہ ہے کہ تم نے زور اور طاقت کے بل بوتے پر فدک کو ہم سے چھین لیا ہے اور ابھی پیغمبر اسلام (ص) کی طرف جھوٹی نسبت بھی دے رہے ہو تاکہ اپنی حرکت کی توجیہہ کر سکو.

۱۔ سبحان اللہ، یعنی خدا پاک و منزہ ہے۔ عموماً تعجب کے مقام پر بولا جاتا ہے.

۲۔ اس کلام سے بخوبی یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول خداؐ ائمہ معصومینؑ اور ولی فقیہ پر لازم ہے کہ قرآن کی تعلیمات اور شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی ولایت مطلقہ کو بروئے کار لائیں.

۳۔ سورۂ نمل / ۱۶.　　۴۔ سورۂ مریم / ۵-۶.

" افتجمعون الی الغدر ؟ "

(کیا تم سب مل کر خیانت کرنا چاہتے ہو ؟!)

آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے کہ ابو بکر نے اپنی تقریر میں کہا کہ: غصب فدک صرف میرا نظریہ ہی نہیں بلکہ تمام مسلمانوں نے اتفاق رائے سے میرا ساتھ دیا ہے اور یہ کام مسلمانوں کے اجماع سے طے پایا ہے، اس لئے یہاں حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: کیا تم سب نے اتفاق کیا ہے کہ خیانت کرو ؟!

" اعتلالاً علیه بالزور والبهتان ؟ "

(۔ اپنی اس خیانت کی ۔ غلط باتوں اور ۔ پیغمبر (ص) پر ۔ الزام تراشی کے ذریعے توجیہ کرنا چاہتے ہو ؟!) .

" اعتلال " سبب بیان کرنا اور بہانہ تراشی ۔ " زور " یعنی ناحق، باطل اور جھوٹ ۔ " بہتان " یعنی تہمت اور الزام ۔

آپ ؑ فرماتی ہیں کہ: تم نے خیانت کی، میرا حق غصب کیا اور ابھی اس کی توجیہ کے لئے ایک جعلی روایت کو دلیل بنا کر پیش کرتے ہو اور رسول خدا (ص) پر بہتان لگاتے ہو ؟! ۔

سقیفه کے سرداروں کی خیانت:

" وهذا بعد وفاته شبیه بما بغی له من الغوائل فی حیاته "

(آنحضرت (ص) کی وفات کے بعد ۔ کردار کشی کی یہ ۔ تمہاری خیانت،

بالکل ان سازشوں اور مظالم کی طرح ہے کہ جس کے تم آنحضرت (ص) کی زندگی میں مرتکب ہوتے تھے)

" غوائل، غائلہ " کی جمع ہے اور ظلم، سازش کرنا، قتل اور سرکشی کے معانی میں استعمال ہوتا ہے ۔

آپ ؑ کا یہ کلام اس سازش کی طرف اشارہ ہے جو رسول خدا (ص) کی حیات طیبہ کے آخری سال میں بعض افراد کی طرف سے تیار ہوئی اور وہ چاہتے تھے کہ " حجة الوداع " سے واپسی کے موقع پر جب آپ (ص) احد کی گھاٹی پر پہنچیں تو آپ (ص) کی سواری کو بھگا کر آپ (ص) کو شہید کیا جائے اور تاریخ کی گواہی کے مطابق ابو بکر بھی سازش کرنے والوں میں شامل تھا ! ۔

لہذا آپ (ع) فرماتی ہیں کہ: پیغمبر (ص) کی رحلت کے بعد۔ آنحضرت (ص) کی طرف قرآن کی سراسر مخالف روایتوں کی غلط نسبت دے کر، کردار کشی کی ہے۔ تمہاری خیانت ان مظالم اور سازشوں سے شباہت رکھتی ہے کہ جس کے تم آنحضرت (ص) کی زندگی میں مرتکب ہوتے تھے اور آپ (ص) کے لئے فتنہ برپا کرتے تھے۔ بہر صورت تم اس وقت بھی خیانت کرتے تھے اور اب بھی خیانت کر رہے ہو۔

"ھذا کتاب اللہ حکماً عدلاً وناطقاً فصلاً"

(یہ خدا کی کتاب ہے جو ایک عادل قاضی ہے اور حق و باطل کو جدا کر کے بیان کرتی ہے)

"یقول۔ یرثنی ویرث من آل یعقوب[1]"، "وورث سلیمان داوود[2]"

(۔ خدا کی یہ کتاب ۔ بیان کرتی ہے کہ:

۔ پروردگارا! مجھے ایک فرزند عطا کر۔ جو میرا اور آل یعقوب کا وارث بنے"

نیز قرآن فرماتا ہے کہ: "سلیمان نے داوود سے ارث پایا ہے")

بنابریں تمہاری یہ بات صحیح نہیں جو کہتے ہو کہ: انبیاء ارث نہیں چھوڑتے کیونکہ قرآن کی تصریح کے مطابق حضرت سلیمانؑ نے داوودؑ سے اور حضرت یحییٰؑ نے حضرت زکریاؑ سے۔ دنیوی مال اور حکومت۔ سے ارث پایا تھا۔

دشمنوں کے شبہات اور قرآن:

حضرت زہراء (ع) اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

"فبیّن عزوجلّ فیما وزع من الاقساط وشرع من الفرائض والمیراث

واباح من حظ الذکران والاناث، ما ازاح بہ علۃ المبطلین"

(خداوند عزوجل نے قرآن میں ارث کو تقسیم فرمایا ہے اور ارث کے حصول کا قانون بنایا ہے نیز مرد اور عورت کے حصوں کو اس طرح معین فرمایا کہ فاسد اور جھوٹے لوگوں کی غلط توجیہات اور شبہات کو زائل کر دے)

۱۔ سورۂ مریم / ۶۔ ۲۔ سورۂ نمل / ۱۶۔

" ما ازاح، بین کا مفعول ہے اور اس کلام سے آپ کا مقصد یہ ہے کہ: خداوند متعال نے ان آیات کے ذریعے قرآن میں ارث کے قانون کو بیان فرمایا ہے وہاں، ترکہ میں لڑکے اور لڑکیوں کے حصے کو بھی وضاحت سے بیان کیا ہے. اس طرح تمہارے شبہات اور بہانہ تراشی کو برملا کرنے کے علاوہ تمہاری غلط توجیہات کو بھی باطل قرار دیا ہے، کیونکہ یہ آیات صراحت کے ساتھ، تمہاری حدیث کے جھوٹ ہونے پر دلالت کرتی ہیں.

" وازال التظنّی والشبہات فی الغابرین "

(۔ اور قرآن کی ان آیات نے ۔ آئندہ آنے والوں کے وہم و گمان اور شبہات کو بھی زائل اور باطل کر دیا ہے)

ممکن ہے بعض لوگ یہ گمان کریں کہ پیغمبر (ص) کے ساتھ منسوب مذکورہ روایت درست ہے اور اپنے آپ سے یہ کہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ابوبکر جھوٹ بولے ؟ لیکن قرآن اس قسم کے وہم و گمان کا خاتمہ کر دیتا ہے.

" تظنّی " اور " تظنّن " کا معنی ایک ہے یعنی ظن اور گمان، " تظنّن " مضاعف (۱) ہے اور عربی زبان میں مضاعف، ناقص (۲) کی شکل میں بھی آتا ہے. یہاں " تظنّن " کا لفظ " تظنّی " میں تبدیل ہوا ہے. جیسا کہ " وما انزلنا علیک القرآن لتشقی (۳) " کہ اس آیت میں " لتشقی " کا لفظ اصل میں " لتشق " تھا.

" وازال التظنّی والشبہات " قرآن کی مذکورہ آیتوں نے لوگوں کے وہم و گمان اور شبہات کو دور کر دیا ہے.

" فی الغابرین " یعنی اگر کوئی مستقبل میں بھی حدیث جعل کرنا چاہے یا شبہہ اور اعتراض کرنا چاہے تو قرآن ان کو باطل کر دیتا ہے.

۱۔ مضاعف یعنی ایک لفظ میں دو حرف ایک ہی جنس سے ہوں جیسے " مَد " کہ جو اصل میں " مدد " تھا.

۲۔ ناقص وہ لفظ ہے جس کے آخر میں واو، یاء یا الف ہو جیسے " یدعو، یرمی، یابیٰ ".

۳۔ سورۂ طٰہٰ / ۲.

"کلّا، بل سوّلت لکم انفسکم امراً"

(ہرگز ایسی بات نہیں جو تم کہتے ہو بلکہ تم پر خواہشات نفسانی غالب آچکی ہیں)

"فصبر جمیل"

(پس، مجھے ایسا صبر کرنا چاہئے کہ جو پسندیدہ اور زیبا ہو)

تمہاری ان خیانتوں اور ظلم وستم کے مقابلے میں ہم صبر سے کام لیں گے اور خدا کی درگاہ میں ان کی شکایت کریں گے کیونکہ وہی ظالم سے مظلوم کا انتقام لینے والا ہے۔

"واللّٰہ المستعان علی ما تصفون(۱)"

(تمہاری ان تہمتوں اور غلط توجیہات کے مقابلے میں، خدا ہماری پناہگاہ اور ہمارا مددگار ہے)

تمہاری غلط توجیہات اور رسول خدا (ص) پر جو تم الزام لگاتے ہو، ان کے مقابلے میں ہم خدائے قادر وتوانا سے مدد چاہتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ، ابوبکر نے ایک جعلی حدیث کو پیغمبر (ص) کی طرف نسبت دی اور اس کے ذریعے غصب فدک کے مسئلے کو حق بجانب قرار دینے کی کوشش کی۔ حضرت زہراء (ع) نے قرآنی آیات سے استدلال فرمایا اور ابوبکر کے ایجاد کردہ شبہات اور اس کی توجیہات کو رد فرمایا اور ابوبکر کے اس اقدام کو خیانت قرار دیا۔

۱۔ آخری یہ تین جملے، سورۂ یوسف کی آیت ۸ سے ماخوذ ہیں۔ شاید سورہ یوسفؑ سے یہ کلمات نقل کرنے کی وجہ، وہ مشابہت ہو جو دونوں ہستیوں کی زندگی میں پائی جاتی ہے اور وہ۔ مخالفین کی طرف سے۔ جھوٹ، فریب اور تہمت کو حربے کے طور پر استعمال کرنا ہے جو دونوں واقعات میں پائے جاتے ہے۔ ابوبکر اور اس کے حواری، کبھی جعلی حدیث کے ذریعے لوگوں کو دھوکہ دے کر ان کو بے وقوف بناتے تھے اور کبھی اہل بیتؑ اور حضرت علیؑ پر یہ تہمت لگاتے تھے کہ وہ فتنہ وآشوب برپا کررہے ہیں، وہ ہر قسم کی فتنہ انگیزی کا محرک حضرت علیؑ اور اہل بیتؑ کو قرار دیتے تھے۔ اس طرح وہ جھوٹ، فریب اور تہمت کی منحوس مثلث کے بل بوتے پر۔ امامت وخلافت کو اپنی اصلی راہ سے منحرف کرنے میں کامیاب ہوئے۔

شہید صدرؒ اپنی کتاب "فدک" کے صفحہ ۷۹ پر، اہل بیتؑ کے ساتھ حکمران ٹولے کے سخت اور غیر اسلامی سلوک کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس غیر اسلامی رویے کا ایک نمونہ ابوبکر کا وہ جملہ ہے جو اس نے حضرت علیؑ کے بارے میں کہا کہ: "معاشرے میں اٹھنے والے ہر فتنہ وآشوب کی جڑ علیؑ ہے اور وہ۔ العیاذ باللہ۔ اُم طحال کی مانند برائی سے خوش ہوتا ہے"!!!۔

چونکہ ابوبکر اور اس کے ہمنوا افراد کے ہاتھوں میں حکومت اور طاقت تھی معاشرے پر جبر اور تلوار کی حکمرانی تھی اور منطق واستدلال سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔ نیز خوف وہراس یا جھوٹے پروپیگنڈوں کی وجہ سے عوام خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ لہذا انہوں نے اپنی من مانی کی اور اہل بیتؑ سے فدک کو چھین لیا۔

ابوبکر کا نیا حربہ۔

ابوبکر دوبارہ جوابی تقریر کے لیے اٹھتا ہے اور چالاکی وسیاست بازی کے ذریعے خود کو بے قصور ٹھہراتا ہے۔

" فقال ابوبکر۔"

" صدق اللّٰہ وصدق رسولہ وصدقت ابنتہ، انت معدن الحکمۃ وموطن الھدیٰ والرحمۃ،

ورکن الدین وعین الحجۃ، ولا ابعد صوابک ولا انکر خطابک"

(پھر ابوبکر نے حضرت زہراء (ع) کو مخاطب کر کے کہا:

خدا اور پیغمبر (ص) نے سچ کہا اور پیغمبر (ص) کی بیٹی بھی سچ فرما رہی ہیں، آپ حکمت کی کان اور ہدایت ورحمت کا منبع ہیں، دین کا ستون اور خدا کے واضح دلائل کا سرچشمہ آپ کی ذات ہے،

آپؑ کے حق کو دور نہیں کر رہا ہوں۔۔ یعنی یہ نہیں کہتا ہوں کہ آپؑ سچ بات نہیں فرماتیں۔۔ آپؑ کے خطاب ۔۔کی حقانیت۔۔ سے مجھے انکار نہیں۔ یعنی اس کے مطالب کا منکر نہیں ہوں)

" ھؤلآء المسلمون بینی وبینک، قلّدونی ماتقلّدت"

(یہ مسلمانوں کا مجمع میرے اور آپؑ کے درمیان گواہ ہے اور فیصلہ کرے گا، یہی لوگ تھے جنہوں نے خلافت کی ذمہ داری میری گردن میں ڈالی)

یعنی، مجھے خود خلافت کی خواہش نہیں تھی، یہی مسلمان آئے اور خلافت کی ذمہ داری میرے کاندھوں پر ڈالی تو میں نے۔ دینی۔ ذمہ داری سمجھتے ہوئے اسے قبول کر لیا!۔

" وباتفاق منهم اخذت ما اخـذت "

(جو کچھ میں نے لیا ہے وہ انہی مسلمانوں کے اتفاق رائے سے لیا ہے [۱])

یعنی، مسلمانوں نے مجھ سے کہا کہ فاطمہ (ع) سے فدک چھین لو تو میں نے چھینا! البتہ یہاں مسلمانوں کے اجماع سے ابوبکر کا مقصد سقیفہ گروپ کے چند مخصوص افراد کا اتفاق رائے ہے، وگرنہ دوسرے مسلمانوں نے ایسی رائے ہرگز نہیں دی تھی.

" غیر مکابر ولا مستبدٌ ولا مستاثـر "

(۔ فدک کا غصب اس لحاظ سے نہ تھا کہ ۔ میں تکبر کروں اور اپنے آپ کو بڑا سمجھوں

اور نہ میری ذاتی رائے کا اس میں کوئی عمل دخل ہے اور نہ ہی میں اپنے آپ کو دوسروں پر مقدم سمجھتا ہوں!)

" وهـم بذلك شهود "

(اور یہ سارے مسلمان میری ان باتوں پر گواہ ہیں)

یہاں ابوبکر کی باتیں ختم ہوتی ہیں. میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت ان باتوں کو سننے میں صرف کیا، اگرچہ ہم حضرت زہراء (ع) کے خطبہ پر گفتگو کر رہے ہیں لیکن اس واقعے کی تکمیل کے لئے ہم مجبور ہیں کہ ابوبکر کی باتوں پر بھی ایک سرسری نظر ڈالیں.

اس کے بعد حضرت زہراء (ع) کچھ اور کلمات ارشاد فرماتی ہیں کہ انشاء اللہ آئندہ درس میں بحث کریں گے.

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

۱۔ جب ابوبکر نے دیکھا کہ جعلی حدیث کا حربہ ناکام رہا اور حضرت زہراء کی مدلل تقریر سے میری جہالت اور خیانت کا پول کھل گیا ہے تو اب جعلی حدیث کے بجائے اس نے خلافت اور فدک کے غصب کرنے کی ذمہ داری دوسرے لوگوں پر ڈال دی اور کہا کہ: آپ کی ہر بات صحیح اور خدا کی طرف سے ہم پر لطف ہے لیکن مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اہل بیت سے خلافت و امامت اور فدک چھین لیا جائے!! لہذا خلافت اور فدک کسی قیمت پر بھی واپس نہیں کیا جائے گا!!!

گیارھواں درس:

- گزشتہ درس کا خلاصہ
- لوگوں کی دوبارہ مذمت
- امامت کی راہ میں تحریف اور اس کا مستقبل
- بابا کے روضے پر درد دل کا بیان

فَالْتَفَتَتْ فاطِمَةُ عليها السلام إلَى النّاسِ وَ قالَت:

مَعاشِرَ المُسْلِمِينَ الْمُسْرِعَةِ إِلىٰ قيلِ الباطِلِ [قَبُولِ الباطل]، الْمُغْضِيَةِ عَلى الْفِعْلِ الْقَبيحِ الخاسِرِ، أَفَلا تَتَدَبَّرُونَ الْقُرآنَ أَمْ عَلىٰ قُلُوبٍ أَقْفالُها؟ كَلا بَلْ رانَ عَلىٰ قُلُوبِكُمْ ما أَسَأْتُمْ مِنْ أَعْمالِكُمْ، فَأَخَذَ بِسَمْعِكُمْ وَ أَبْصارِكُمْ، وَ لَبِئْسَ ما تأولتم، و ساءَ ما بِهِ أشرتم، وَ شَرَّ ما مِنْهُ اغْتَصَبْتُم! لَتَجِدُنَّ وَاللهِ مَحْمِلَهُ ثقيلاً، وَ غبّه وَبيلاً، إذا كُشفَ لَكُمُ الْغِطاء، وَ بانَ ماوَرائَه مِنَ الضَّراء [الضَّراء] وَ بَدا لَكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ مالَمْ تكونُوا تَحْتَسِبُونَ، وَ خَسِرَ هُنالِكَ المُبْطِلونَ.

ثُمَّ عَطَفَتْ عَلىٰ قَبْرِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وآله و قالَتْ:

قَـدْ كـانَ بَـعْدَكَ أَنْباءٌ وَ هَـنْبَثَة	لَوْ كُنْتَ شاهِدَها لَـمْ تكثر الْـخطب
إِنّـا فَـقَدْناكَ فَـقْدَ الأَرْضِ وابِـلَها	وَ اخْتَلَّ قَوْمُكَ فَاشْهَدْهُمْ وَ لاتَغب
وَ كُـلُّ أَهْـلٍ لَـهُ قُـرْبىٰ وَ مَـنْزِلَة	عِنْدَ الإِلٰـهِ عَـلَى الأَدنـين مـقترب
أَبَدَتْ رِجالٌ لَنا نَجْوى صُـدُورِهِمْ	لَمامَضيتَ وَ حـالَتْ دُونَك التُّـرب
تَـجَهَّمَتْنا رِجـالٌ وَ اسْـتَخَفَّ بِـنا	لَما فُـقِدت وَ كُـلُّ الأَرْثِ مُـغْتَصَب
وَ كُنْتَ بَـدْراً وَ نـوراً يُـسْتَضاءُ بِـه	عَلَيْكَ ينزل مِنْ ذِى العِـزَّةِ الكُـتُب
وَ كـانَ جِـبْرِيلُ بِـالآيـاتِ يُـؤْنِسُنا	فَقَد فُقِدت وَ كُلُّ الْـخَيْرِ مُـحْتَجَب
فَلَيْتَ قَبْلكَ كـانَ الْـمَوْتُ صـادَفَنا	لمامضيت وَ حالَتْ دُونَكَ الكُـثُب
إِنّـا رُزِيـنا بِـما لَـمْ يُـرْزَ ذُو شجنٍ	مِـنَ البَـرِيَّة، لاعَـجم و لاعـرب

❋❋❋

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبہ نستعین

گزشتہ درس کا خلاصہ،

حضرت زہراء (ع) نے اپنے اوپر ہونے والے ظلم وستم کے بارے لوگوں کے سامنے ابوبکر پر اعتراض کیا اور اس کی مذمت کی. ابوبکر نے منافقت اور چالاکی سے استفادہ کرتے ہوئے آپؑ کی تعریف میں چند جملے کہے اور فدک کے غصب کرنے کو مسلمانوں کے اتفاق رائے کا نتیجہ قرار دیا اور ایسا ظاہر کیا کہ تمام مسلمان غصب فدک میں اس کی تائید کرتے ہیں اور اس کے ہمنوا ہیں.

ابوبکر کی اس عوام فریبی اور اس مسئلے میں پوری قوم کو ملوث کرنے کے بعد، اتمام حجت کی خاطر آپؑ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کرکے فرمایا:

لوگوں کی دوبارہ مذمت،

" فالتفتت فاطمہ (ع) الی الناس وقالت،

معاشر المسلمین المسرعۃ الی قیل الباطل "

(پھر حضرت فاطمہ (ع)، لوگوں کی طرف متوجہ ہوئیں اور ان سے فرمایا:

اے مسلمانو! تم نے بہت ہی جلد باطل باتوں پہ کان دھر لیا ہے)

"قال، قیل" دونوں بات اور کہنے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن عام طور پر "قیل" باطل باتوں کے بارے میں استعمال ہوتا ہے. مقصد یہ ہے کہ، اے وہ گروہ جو باطل کے آتے ہی اس کی طرف لپک کر چلے گئے ہو اور جب اس نے چند باتوں کے ذریعے ایک غلط فضا قائم کی اور شوشا چھوڑا تو بہت جلد اس کا ساتھ دینے لگ گئے ہو. البتہ دوسرے بعض نسخوں میں " الی قبول الباطل " ہے یعنی مسلمانو! تم نے باطل کو قبول کرنے میں بہت جلد بازی سے کام لیا ہے.

یہی لوگ جو رسول خدا (ص) کے زیر منبر رہتے تھے، علی (ع) کی شجاعت اور جہاد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے. اتنے سست عنصر نکلے. کہ جب سقیفہ میں پانچ آدمیوں نے متفق ہو کر ہرزہ سرائی شروع کی تو انہوں نے اہل بیتؑ کے ان سارے فضائل کو بھلا دیا اور باطل سے گلہ لگالیا اس طرح حق کو اکیلا چھوڑ کر اس کی حمایت سے دستبردار ہو گئے! رحلت پیغمبر (ص) کے بعد کے مسلمان یا تو بہت ہی احمق اور بے وقوف تھے یا ضعیف الایمان اور ڈرپوک تھے.

" المغضبة علی الفعل القبیح الخاسر "

(لوگو! تم برے اور نقصان دہ امور کے مقابلے میں آنکھ بند کر لیتے ہو)

"اغضاء" آنکھ بند کرنے اور چشم پوشی کرنے کے معنی میں آتا ہے.

مقصود یہ ہے کہ: لوگو! تم جب باطل کو دیکھتے ہو تو اس کا مقابلہ کرنے کے بجائے آنکھیں موند لیتے ہو اور حق کے دفاع کی ذمہ داریوں کو انجام نہ دینے کے لئے باطل کی توجیہہ کرتے ہو.

" افلا تتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالہا[1] "

(کیا تم قرآن میں تدبر اور غور و فکر نہیں کرتے ہو؟ یا. تمہارے. دلوں پر تالے لگ گئے ہیں؟!)

حضرت زہراء (ع) قرآن کی آیات کو بطور شہادت پیش کرتی ہیں اور اس طرح مسجد میں حاضر مجمع کی سادہ لوحی اور جہالت کی مذمت فرماتی ہیں اور تاکید کرتی ہیں کہ آخر کیوں غور و فکر نہیں کرتے ہو؟ حکمران طبقے کے کاموں کو تدبر اور بصیرت کی نگاہ سے کیوں نہیں دیکھتے ہو؟ اور انکے کاموں کو قرآن اور

۱۔ یہ جملہ "علی قلوبکم" تک مختصر تفاوت کے ساتھ سورہ محمدؐ کی آیت ۲۴ سے لیا گیا ہے.

اسلام کے مسلمہ معیاروں اور اقدار سے جانچ پڑتال کیوں نہیں کرتے ہو؟

"کـلا، بل ران علی قلوبکم ما اساتم من اعمالکم"

(نہیں ایسا ہرگز نہیں، بلکہ تمہارے بدکردار ہونے کی وجہ سے تمہارے دل زنگ آلودہ ہوچکے ہیں۔

اور تمہاری فطرت مسخ ہوچکی ہے۔)

تم نے اس قدر حق کو پامال کیا اور باطل کی حمایت کی کہ تمہارے دل سیاہ ہوگئے ہیں اب میری یہ باتیں اور نصیحتیں تم پر اثر نہیں رکھتیں کیونکہ ہر غلط کام اس بات کا باعث بنتا ہے کہ انسان کے دل۔ کی نورانی فضا۔ کو آلودہ کرے اور دل کو زنگ آلود بنا کر۔ نور ہدایت کی تابش سے۔ محروم کردے، اس طرح جب گناہ بڑھ جاتے ہیں تو آلودگی اور زنگ میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ۔ انسان کا دل مکمل سیاہ ہوجاتا ہے اور حق کی بات اس پر اثر نہیں کر سکتی. قرآنی اصطلاح میں دل کی اس کیفیت کو "رین" کہا جاتا ہے۔ "ران" بھی اسی مادہ سے فعل ہے۔ اور اسی کیفیت پر دلالت کرتا ہے۔

"ران علی قلوبکم" یعنی تمہارے دل زنگ آلود ہو کر سیاہ ہوچکے ہیں، جو پے در پے گناہ کرتا ہے۔ اور گناہ کو کئی بار انجام دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اس مقام پر جا پہنچتا ہے کہ خدا اور اس کی نشانیوں کا بھی انکار کردیتا ہے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے کہ: "ثم کان عـاقبۃ الذین اساؤا السوٰی ان کذبوا بآیـات اللّٰہ[1]" (پھر بدکردار لوگوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں)۔

"فاخـذ بسمعکم و ابصارکـم"

(۔ان غلط کاموں نے تم سے۔ تمہارے کانوں اور آنکھوں کو چھین لیا ہے)

یہاں کان اور آنکھ سے دل کی آنکھ اور کان مراد ہیں، یعنی تمہارے یہ برے کام اور غلط کردار اس بات کا سبب بنے ہیں کہ تمہاری بصیرت کی آنکھ نابینا ہوجائے اور تم حقیقت کو دیکھنے نہ پاؤ۔ اسی طرح تمہارے کان حق کی بات سننے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں، کیونکہ کبھی انسان، مقام و منصب یا مال دنیا کی شدید محبت کی خاطر یا حکمرانوں کی سختی، مشکلات اور خوف کی وجہ سے حقیقت سے چشم پوشی کرلیتا ہے

---

[1] سورۂ روم / ۱۰۔

اور بسا اوقات حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھنے لگتا ہے یا ان کی غلط توجیہہ کرتا ہے۔

امامت کی راہ میں تحریف اور اس کا مستقبل،

" ولبئس ما تاولتم "

(تم نے بہت بری تاویل کی ہے۔ یا: تمہارے کام کا انجام بہت ہی برا ہے۔)

اس جملے کے دو معنی ہو سکتے ہیں:

۱۔ " اول " یعنی عاقبت، نتیجہ: بنابریں جملے کا معنی یہ ہو گا کہ تمہارے اس اقدام کی عاقبت اور انجام انتہائی برے نقطے پر پہنچ چکا ہے، کیونکہ تمہاری سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم نے اسلام اور قرآن کے نام پر، ایک ایسی ہستی کے خلاف سازشیں کیں جو مجسمۂ اسلام وعدالت تھا اور اسلام کو تم نے اپنے اصلی راستے سے منحرف کر دیا ہے۔

۲۔ تم ایک غلط تاویل اور توجیہہ میں بری طرح پھنس گئے ہو، کیونکہ وہ لوگ جو ان برے اعمال کے مرتکب ہوئے تھے اور حق کو پامال کر دیا تھا، عام طور پر اپنی ایسی حرکات کے لئے شرعی جواز گھڑ لیتے تھے اور اپنے کاموں کی توجیہہ کرتے تھے وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ ہم حق کے خلاف قدم اٹھا رہے ہیں بلکہ اپنے غلط کاموں کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے، قرآن کریم اس قسم کے افراد کے بارے میں فرماتا ہے کہ: " ان الذین یکتمون ما انزل اللّٰہ من الکتاب ویشترون بہ ثمناً قلیلاً، اولئک ما یاکلون فی بطونھم الا النار، لا یکلمھم اللّٰہ یوم القیامۃ ولا یزکیھم ولھم عذاب الیم (۱) " (جو لوگ خدا کی نازل کردہ کتاب۔ اور حق بات۔ کو چھپاتے ہیں اور اسے سستے داموں بیچ دیتے ہیں، یہ لوگ اپنے پیٹ کو آتش۔ جہنم۔ سے بھر رہے ہیں، قیامت کے دن خدا ان سے بات نہیں کرے گا اور نہ ہی ان کو اپنے گناہوں سے پاک کرے گا اور ان کے لئے ایک دردناک عذاب ہے)۔

" وساء ما بہ اشرتم "

(اور جس چیز کی طرف تم نے اشارہ کیا وہ بہت بری ہے)

۱۔ سورۂ بقرہ / ۱۷۴۔

انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان کو اپنی زندگی سے سروکار رکھنا چاہیے اور معاشرتی امور میں مداخلت کی ضرورت نہیں ہے، حق کی یا باطل کی جو بھی حکومت آجائے۔ اور جو بھی حکمران بن جائے۔ اس کے ساتھ مسالمت آمیز رابطہ اور تعلق رکھنا ضروری ہے! حالانکہ یہ طرز فکر بنیاد سے ہی باطل اور غلط ہے۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ہمیشہ حق کی بات کریں، حق کے محافظ، مظلوموں کے مددگار اور ظالموں کے دشمن رہیں۔ امیر المؤمنین (ع) امام حسن اور امام حسین علیہما السلام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: "کونا للظالم خصماً وللمظلوم عوناً" (آپ دونوں ظالم کے دشمن اور مظلوم کے حامی رہیں) "قولا للحق واعملا للاجر (۱)" (حق بات کہیں اور اجر۔ خداوندی۔ کی خاطر کام کریں)۔

اسلام، رسول خدا (ص) اور ائمہ طاہرین (ع) کی راہ وروش، آسائش اور سکون نہیں ہے لہذا ہم سب پر فرض ہے کہ معاشرے میں رونما ہونے والے امور کے بارے میں ذمہ داری کا احساس کریں اور خاموش نہ رہیں۔ اگر اس دور کے مسلمان، دنیا پرستی اور مقام پرستی کے بجائے حق کا دفاع کرتے اور امر بالمعروف ونہی از منکر کرتے تو اسلام اپنی صحیح اور اصلی شاہراہ پر گامزن رہتا اور آج مسلمان، ان ساری مصیبتوں اور بدبختیوں کا شکار نہ ہوتے، لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے، اسلام کے احکام اور پیغمبر اسلام (ص) کے احکامات پر دنیا کی چند روزہ زندگی اور مقام ومنصب کو۔ جو وہم وگمان سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ ترجیح دی اور اپنے اس نامعقول کام کو شرعی لبادہ بھی پہنا دیا۔ لہذا آپؑ فرماتی ہیں کہ: بہت بری ہے وہ چیز! جس کی طرف تم نے اشارہ کیا ہے (۲)۔

"وشرّ ما منه اعتضتم۔اغتصبتم۔"

(۔۔ان مظالم کے عوض میں۔۔ جو کچھ تم نے حاصل کیا ہے۔۔ یا وہ چیز جسے تم نے غصب کیا ہے۔۔ وہ بہت بری ہے)

۱۔ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے نام حضرت علیؑ کی وصیت، مکتوب ۴۷ نہج البلاغہ۔

۲۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملے کا مقصد ابوبکر کے اس جملے کی طرف اشارہ ہو جہاں اس نے خلافت اور فدک کے غصب کو مسلمانوں کے اتفاق رائے اور اجماع کی طرف نسبت دی ہے۔ "اشارہ" حکم دینے اور چاہنے کے معنی میں ہے یعنی تم نے بہت بری راہ کو انتخاب کیا ہے اور اہل بیتؑ کے بارے میں غلط فیصلہ کیا ہے۔

یہ عبارت دو طرح سے نقل ہوئی ہے:

۱۔ "شرّ مامنه اغتصبتم" یعنی تم آئے اور خلافت کو غصب کیا او فدک کو چھین لیا۔ اہل بیت رسول(ص) پر ستم روا رکھا، یہ تمہاری آخرت کو تباہ کردے گا۔

۲۔ دوسری عبارت جسے بحار میں علامہ مجلسیؒ نے نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ "شرّ مامنه اعتضتم" اس کا مصدر "اعتیاض" اور عوض و بدلہ کے معنی میں ہے۔ یعنی تم علی(ع) کو خانہ نشین کر کے ابوبکر کے ٹولے کو اقتدار کی کرسی تک لائے اور فدک کو غصب کر کے تم نے بہت برے بدلے کا انتخاب کیا ہے۔

"لتجدنّ واللّٰه محمله ثقیلاً"

(خدا کی قسم! تم اسے وزنی پاؤ گے اور نہیں اٹھا سکو گے)

"لتجدن" میں جو لام ہے اسے لام توطئہ کہتے ہیں، چونکہ یہ قسم کا مقدمہ اور اس کی تمہید ہے۔ یہ لام اس بات کی علامت ہے کہ یہاں (واللہ کا فعل) قسم محذوف ہے۔

آپؑ کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی قسم جس چیز کو تم نے غصب کیا ہے اس کا بوجھ بہت وزنی ہے اور قیامت کے دن اس کے بارے میں تمہیں جواب دینا پڑے گا۔ البتہ دنیا میں بھی اس کی ذمہ داری اٹھانا بہت مشکل ہے، کیونکہ اموی اور عباسی دور استبداد سے لے کر امام مہدی علیہ السلام کے ظہور تک، جتنے انحرافات اور ظلم و ستم ہوئے ہیں اور ہوں گے، ان سب کی علت یہ ہے کہ صدر اسلام میں اہل بیتؑ سے امامت اور خلافت چھینی گئی تھی۔

"وغبّه وبیلاً"

(اور اس کا انجام بہت ہی برا ہوگا)

"غبّ" کسی کام کے انجام کو کہا جاتا ہے جبکہ "وبیل" اور "وبال" حالت کے صحیح نہ ہونے اور برے انجام کو بولا جاتا ہے۔ تمہارے اس اقدام کی عاقبت اور اس کا انجام دنیا و آخرت دونوں میں بہت ہی برا ہے۔ خلافت اور فدک، غصب کرنے کے برے انجام سے تم اس وقت واقف ہو گے کہ:

"اذا کشفت لکم الغطـاء"

(جب پردے ہٹا دیئے جائیں گے)

"غطاء" پردے اور ڈھانپنے کی چیز کو کہتے ہیں۔

یعنی، جب قیامت برپا ہوگی اور پردے ہٹ جائیں گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارے اس اقدام کا نتیجہ کیا تھا۔ قرآن بھی فرماتا ہے کہ: جب صور پھونکا جائے گا اور قیامت آئے گی تو ہر شخص اپنے اعمال اور اس کے نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا اس وقت اسے خطاب کیا جائے گا کہ: " لقد کنت فی غفلة من هذا فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید [1] " (بے شک۔ دنیا میں۔ تم اس عالم کے بارے میں غافل تھے پھر ہم نے تم سے پردہ ہٹایا پس آج تمہاری نگاہ بڑی تیز ہے۔

" وبان ماورائه من الضرّاء۔الضراء۔"

(اور۔اس پردے۔کے پیچھے جو سختیاں اور مشکلات ہیں وہ ظاہر ہوں گی)

"ضرّاء" بدحالی اور زندگی کی سختی کا نام ہے جبکہ اس کے مقابل میں خوشحالی کو "سرّاء" کہا جاتا ہے۔ یعنی جب پردے ہٹ جائیں گے اور اس کے پیچھے قیامت کی سختیوں اور مشکلات کا مشاہدہ کریں گے تو اپنے کاموں کی خطرناک عاقبت کی طرف متوجہ ہوں گے۔

بعض نسخوں میں مذکورہ عبارت میں "ضرّاء" کے بجائے "ضراء" (یعنی راء بغیر تشدید کے) نقل ہوئی ہے۔ "ضراء" کے معنی ہیں بہت زیادہ درخت جن کے پیچھے چھپ سکیں۔ بنابریں اس جملہ کا مقصود یہ ہے کہ اس وقت تم اپنے جواریوں اور غلط افکار ونظریات کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہو اور اپنے چہرے پہ شرعی جواز کا خول چڑھا کر چھپائے ہوئے ہو لیکن جب قیامت برپا ہوگی اور تمام پردے ہٹا دیئے جائیں گے تو تم کسی دوسری چیز کو دیکھو گے جو آج مرتکب ہونے والی خیانتوں کا نتیجہ ہوگی۔

اس احتمال کے مطابق۔ جیسا کہ علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں۔ "ورائہ" کے لفظ میں "ھاء" زائد ہے اور ممکن ہے لکھنے والے کی یا چھاپ کی غلطی کی وجہ سے "ھاء" کا حرف زیادہ ہو گیا ہو۔ البتہ پہلا احتمال اپنے سیاق وسباق کے اعتبار سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

۱۔ سورہ ق / ۲۲۔

" وبدا لکم من ربکم ما لم تکونوا تحتسبون "

(اس دن اپنے پروردگار کی طرف سے تم پر ایسی چیزیں ظاہر ہوں گی کہ جس کا تمہیں گمان بھی نہ تھا)

یعنی قیامت کے حساب وکتاب کے بارے میں تم سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ لیکن وہ آکے رہے گی۔

جب انسان دنیا کی لذتوں میں غرق ہو اور وہ مال ودولت، مقام ومنصب اور قدرت وریاست کا عاشق بن گیا ہو تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ یہ سب مقام ومنصب اور مال وثروت کسی کے حوالہ کر کے اس نے جدا ہونا ہے، لیکن ان تمام کا حساب اسی نے دینا ہے۔

" وخسر ھنالک المبطلون[1] "

(باطل کے پیروکار وہاں گھاٹے میں ہوں گے)

بابا کے روضے پر دردِ دل کا بیان،

" ثم عطفت علیٰ قبر النبیؐ (ص) وقالت، "

(پھر حضرت زہراء (ع) قبر رسول (ص) کی طرف متوجہ ہوئیں اور فرمایا:)

مسجد میں موجود مسلمانوں کو آپؑ کا خطاب، یہاں پر اختتام پذیر ہوتا ہے اور آپؑ رسول خدا (ص) کے روضے کی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور چند اشعار کے ضمن میں اپنے دردِ دل اور سوزِ جگر کا اظہار فرماتی ہیں۔ اگرچہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان اشعار کے چند بیت " ھند بنت اثاثہ " کے ہیں[2]، چونکہ یہ اشعار اس مجلس سے زیادہ مناسبت رکھتے تھے لہذا حضرت زہراء (ع) نے ان اشعار سے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے استفادہ کرتے ہوئے رسول خدا (ص) کی قبر کے سامنے ان کو پڑھا۔ اگرچہ یہ اشعار بہت زیادہ ہیں لیکن " کتاب احتجاج " میں صرف یہ چند بیت نقل ہوئے ہیں:

۱۔ سورۂ غافر / ۷۸۔

۲۔ چند بیت کے علاوہ باقی سب اشعار کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر رسول خداؐ کے بارے میں کہے گئے ہیں اب چاہے یہ اشعار خود حضرت زہراءؑ کے ہوں یا ھند بنت اثاثہ کے۔ آنحضرتؐ کے سوگ میں کہے گئے ہیں۔

"قد کان بعدک انباء وھنبثۃ   لو کنت شاھدھا لم تکثر الخطب"

(۔اے رسول خدا(ص)!۔ بتحقیق آپ کے بعد بہت ساری خبریں اور سختیاں اور حوادث رونما ہوئے ہیں
اگر آپ (ص) شاہد اور حاضر ہوتے تو ان مصیبتوں میں اضافہ نہ ہوتا)

"قد کان..." کی عبارت میں "کان" تامہ ہے[1] یعنی "وجد" "موجود ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، لہذا اسے خبر کی ضرورت نہیں (۔یہ عربی گرامر سے مربوط ایک بحث ہے۔) "ھنبثۃ" سختی اور حادثہ کو کہا جاتا ہے نیز ہنگامہ کرکے بیہودگی کا مرتکب ہونے کو بھی "ھنبثۃ" کہا جاتا ہے، چونکہ سقیفہ میں موجود ہر پارٹی کے افراد اپنی پارٹی کے لئے جد وجہد میں مشغول تھے تاکہ اپنی پارٹی کے کسی رکن کو مسلمانوں کا حاکم بنایا جائے اس سیاسی کشمکش میں پروپیگنڈے اور زور گوئی کے ذریعے ابوبکر کی پارٹی خلیفہ بنانے میں کامیاب ہوئی۔ اس سلسلے میں سقیفہ اور دوسری جگہوں پر جو حادثات رونما ہوئے ہیں ان کو یہاں "ھنبثۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"قد کان بعدک انباء وھنبثۃ" یعنی، اے رسول خدا (ص)! تیرے بعد ایسے حادثات اور ناگوار واقعات رونما ہوئے کہ "لو کنت شاھدھا" "اگر آپ (ص) حاضر ہوتے تو شاید" لم یکثر الخطب" اتنی کثرت سے ایسے المناک حادثات رونما نہ ہوتے۔ "خطب" یعنی بڑا حادثہ، یعنی آپ (ص) اس دنیا سے چلے گئے تو ان لوگوں نے اپنی مرضی سے جو چاہا کرلیا اور جو چاہا آپ (ص) کی طرف منسوب کردیا۔

"انا فقدناک فقد الارض وابلھا   واختل قومک فاشھدھم ولا تغب"

(ہم نے۔اے رسول خدا (ص)۔آپ کو اس طرح کھودیا ہے کہ جس طرح زمین بارش کو کھو بیٹھتی ہے
اور تیری قوم کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ پس اے رسول خدا (ص) گواہ رہنا اور ان سے غائب نہ رہنا)

"وابل" اس بارش کا نام ہے جو مسلسل برسے اور زمین کی آبادی کا باعث بنے، کیونکہ اگر بارش نہ برسے تو زمین بنجر بن جاتی ہے۔ چونکہ رسول خدا (ص) کا وجود با برکت ہے اور آپ (ص) انسانی

---

[1] "کان تامہ" اس "کان" کو کہا جاتا ہے جو "موجود ہے" یا "تھا" کے معنی میں آئے۔ اس "کان" کے لئے خبر کی ضرورت نہیں، جبکہ "کان ناقصہ" جملہ اسمیہ پر داخل ہوتا ہے اور اسم وخبر کا محتاج ہے نیز خبر کے ذریعے سے ہی اس کا معنی مکمل ہوتا ہے۔

معاشرے کے لئے حیات کا موجب تھے اسی لئے حضرت زہراء(ع) آنحضرت(ص) سے خطاب کرکے فرماتی ہیں کہ: ہم نے آپ(ص) کو اس طرح کھودیا ہے جس طرح زمین اس بارش کو کھودیتی ہے جو زمین کی حیات اور آبادی کا سبب بنتی ہے۔

در اصل آپ(ع) ان اشعار کے ذریعے پیغمبر(ص) کی خدمت میں اپنا درد دل بیان کرنا چاہتی ہیں اور آنحضرت(ص) کے حضور مسلمانوں کی شکایت کرنا چاہتی ہیں۔

" وکل اهـل له قربیٰ ومنزلة عند الاله علی الادنین مقترب "

(ہر وہ شخص جس کو خدا کے ہاں قرب ومنزلت حاصل ہو وہ اپنے رشتہ داروں سے بھی نزدیک ہوتا ہے)

" ادنین، ادنی " کی جمع ہے جس طرح " مصطفی " کی جمع " مصطفین " ہے۔

علامہ مجلسیؒ نے اس عبارت کے معنی کے بارے میں چار احتمال دیئے ہیں لیکن میں یہ احتمال دیتا ہوں کہ شاید حضرت فاطمہ زہراء(ع) کا مقصد یہ ہو کہ: اے رسول خدا(ص)! آپ(ص) جو خدا کے ہاں قرب ومنزلت رکھتے ہیں، ہمیں بھی یاد رکھیں اور ہمیں فراموش نہ کریں، کیونکہ جو بھی درگاہ خداوندی کا مقرب بن جائے تو وہ اپنے رشتہ داروں کی شفاعت کرتا ہے اور ان کے لئے بارگاہ خدا میں دعـا کرتا ہے تاکہ ان کی حاجات روا ہوجائیں اور ان کی مشکلیں آسان ہوجائیں۔ تو اے حبیب خدا! ۔ اپنی بیٹی اور داماد کی طرف ایک نظر کرم کر اور ان کی طرف اپنی توجہ فرما۔ بنابریں " کل اهل... " کی عبارت سے مراد پیغمبر اکرم(ص) ہیں، یعنی رسول خدا(ص) اپنے اہل بیت(ع) کو لطف وعنایت کی نظر سے دیکھیں۔

" ابدت رجال لنا نجوی صدورهـم لما مضیت وحالت دونک التراب "

(جو لوگ اپنے دلوں میں ہم سے پوشیدہ دشمنی رکھتے تھے، جب آپ(ص) چلے گئے

اور یہ مٹی ہمارے درمیان حائل ہوئی تو انہوں نے اپنی دشمنی ظاہر کردی)

جن لوگوں نے رحلت رسول خدا(ص) کے بعد حضرت علی(ع) اور حضرت فاطمہ(ع) کے خلاف سازشیں کیں در اصل وہ اپنے دل کی بیماری کو آشکار کررہے تھے۔ ان میں سے بعض لوگوں کو احد وبدر جیسی گزشتہ جنگوں میں حضرت علی(ع) کے ہاتھوں زخم لگے تھے کیونکہ ان کے عزیز اور رشتہ دار حضرت

امیر المومنین (ع) کی تلوار سے قتل ہو چکے تھے. بعض لوگ اسلام کے ابتدائی دنوں سے ہی حضرت علیؑ سے حسد رکھتے تھے اور وہ آپ (ع) کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے. جب پیغمبر اکرم (ص) نے وفات پائی تو ان کے ہاتھ کھل گئے اور دل میں جو بغض وحسد رکھتے تھے اب ان کو جامہ عمل پہنانے لگے.

" نجوی صدورھم " یعنی جو بات دل میں آہستہ کہا کرتے تھے اسے ظاہر کر دیا ہے. یہ لوگ بظاہر کچھ نہیں کہتے تھے لیکن دل سے حضرت علی (ع) کی مخالفت کرتے تھے۔ اور پیغمبر (ص) کی زندگی میں اسے اظہار کرنے کی جرات نہیں کرتے تھے۔ اور ابھی ان کو آشکار کر دیا ہے. " لما مضیت " جب آپ (ص) اس دنیا سے چلے گئے، یعنی وفات پا گئے.

" وحالت دونک التراب " اور ہمارے درمیان مٹی کے ڈھیر حائل ہو گئے. یعنی آپ (ص) کی وفات کے بعد اب جبکہ انہیں اپنے مقاصد کی راہ میں کوئی مانع نظر نہیں آیا تو اسی لئے ان لوگوں نے اپنی سازشوں اور شیطانی نقشوں پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے اور اپنی دشمنیوں کو علی الاعلان ظاہر کر رہے ہیں.

" تجھمتنا رجال واستخف بنا لما فقدت وکل الارث مغتصب "

(جب ہم نے آپ (ص) کو کھو دیا تو لوگوں نے ہمیں اپنے حملے کا نشانہ بنایا۔ اور ہمارے ساتھ، چہرہ بگاڑ کر سخت برتاؤ کیا۔ اور ہماری عزت کا خیال نہ رکھا نیز تمام کے تمام ارث کو بھی غصب کر لیا (۱))

البتہ " احتجاج " میں " کل الارض " (یعنی تمام اراضی) ذکر ہوا ہے. اس عبارت کے مطابق آپؑ کا اشارہ، فدک کی تمام اراضی کی طرف ہے.

۱۔ آپؑ کی اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ فدک، امامت کی علامت کی حیثیت رکھتا تھا اور در اصل آپ کا اعتراض اس بات پر تھا کہ اہل بیتؑ سے خلافت وامامت کیوں چھینی گئی کیونکہ یہ خلافت اور امامت، پیغمبرؐ سے اہل بیتؑ کو ملنے والی میراث تھی، اگر ایسا نہ ہوتا تو آپؑ کا یہ فرمانا کہ " کل الارث مغتصب " مناسب نہ تھا کیونکہ فدک اگر پیغمبرؐ کا ترکہ بھی ہوتا تو پھر بھی ارث فدک تک محدود نہ تھا، البتہ آپؑ نے صراحت کے ساتھ خلافت اور امامت کا ذکر نہیں فرمایا اس کی علت شاید یہ ہو کہ یا تو حاضرین مجلس سیاسی مسائل سمجھنے میں کمزور اور کوتاہ فکر تھے یا اس لئے کہ آپؑ پر دنیا پرستی اور مقام پرستی کی تہمت نہ لگے یا بعض اور وجوہات تھیں جو ہم نہیں جانتے.

" وکنت بدراً ونوراً یستضاء به   علیک ینزل من ذی العزة الکتب(۱)"

(آپ(ص)درخشاں بدر کامل اور روشنی تھے جس سے لوگ روشنی پاتے تھے

اور آپ(ص) پر خدا کی طرف سے کتابیں نازل ہوتی تھیں)

" وکان جبریل بالآیات یؤنسنا   فقد فقدت وکل الخیر محتجب"

(جبریل آیات خداوندی کے ساتھ ہمارا مونس وہمدم تھا لیکن آپ(ص) کی رحلت کے بعد خوبیاں ہم سے چھپ گئیں)

جب جبریل آیات خداوندی لے کر پیغمبر اکرم(ص) کے پاس آتا تھا تو لازمی طور پر اس کے نیک آثار سے دوسروں سے زیادہ حضرت زہراء(ع) اور حضرت امیر المؤمنین(ع) فیض یاب ہوتے تھے اسی لئے پیغمبر اسلام(ص) کی رحلت سب سے زیادہ اہل بیتؑ پر گراں گزری.

" فلیت قبلک کان الموت صادفنا   لما مضیت وحالت دونک الکثب"

(اس سے قبل کہ آپ(ص) اس دنیا سے جاتے اور ہمارے درمیان ریت اور کنکریوں کے ڈھیر حائل ہوجاتے،

کاش ہمیں موت آجاتی۔ یعنی اے کاش آپ(ص) سے پہلے ہم وفات پاچکے ہوتے۔)

"الکثب، کثیب" کی جمع ہے اور اس کے معنی ہیں ریت اور کنکریاں.

چونکہ وہ علاقہ ایک ریت والا علاقہ تھا اس لئے لوگ قبروں کو ریت سے ڈھانپ دیتے تھے. آپ(ع) یہاں رسول خدا(ص) کے مدفون ہونے کی تلخ حقیقت کو اس طرح بیان فرماتی ہے کہ ہمارے اور آپ(ص) کے درمیان ریت اور کنکریوں کے ڈھیر حائل ہوگئے.

" لقد رزینا بما لم یرز ذو شجن   من البریة، لا عجم ولا عرب"

(ہم پر ایسی مصیبت ٹوٹ پڑی کہ عرب اور عجم کے کسی بھی غمگین اور حزین انسان پر ایسی مصیبت نہیں آئی)

حضرت زہراء(ع)، ان اشعار کے ذریعے، رسول خدا(ص) کو اپنا درد دل سنانے کے بعد مسجد سے

۱۔ آنحضرتؐ پر کتابیں نازل ہونے کا مطلب یا تو خدا کے احکامات ہیں جو مجموعی طور پر قرآن کی شکل میں موجود ہیں یا قرآن نازل ہونے سے قبل، دوسری آسمانی کتابوں سے آپؐ کو واقف کرنا مقصود ہے، کیونکہ آپؐ سابقہ آسمانی کتابوں کے غیر تحریف شدہ اور واقعی حقائق سے آگاہ تھے.

نکل کر اپنے گھر کی طرف تشریف لے گئیں۔

روایت میں منقول ہے کہ اس دوران حضرت علی (ع) اپنے گھر میں تشریف رکھتے تھے اور حضرت زہراء (ع) کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے اور بار بار گھر سے باہر دیکھتے تھے تاکہ یہ دیکھیں کہ حضرت فاطمہ زہراء (ع) واپس تشریف لا رہی ہیں یا نہیں۔ جب حضرت زہراء (ع) گھر میں داخل ہوئیں تو آپؑ اور حضرت علیؑ کے درمیان ایک گفتگو ہوئی۔ انشاء اللہ آئندہ درس میں ہم اس پر بحث کریں گے۔

وصلی اللّٰہ علیٰ محمد و آل محمد (ص)

بارھواں درس:

- حضرت علی (ع)، حضرت زهراء (ع) کے انتظار میں
- حضرت علی (ع) کے حضور سوز دل کا بیان
- حکومت کے حضرت زهراء (ع) کے ساتھ عناد اور دشمنی کی تصویر کشی
- عام لوگوں کی بے توجہی کو مجسم کرنا
- جہاد کی سی خاموشی
- حضرت علی (ع) کی مظلومیت اور اسلام کی مصلحت
- اهل بیت (ع) کی مظلومیت اور بے کسی کی انتہاء
- بابا کے حضور شکایت اور بارگاہ خداوندی میں مناجات
- حضرت علی (ع) کا حضرت زهراء (ع) کو تسلی دینا
- حضرت علی (ع) کے حضور حضرت زهراء (ع) کے درد دل کا ایک تجزیه
- فدک کے بارے میں حضرت زهراء (ع) کے اصرار کا فلسفه
- ایک عرب شاعر کی زبانی، انصار اور مهاجرین کے سکوت کی تصویر کشی

ثُمَّ انْكَفَأَتْ عليها السلام وَ أميرُالمُؤْمِنين عليه السلام يَتَوَقَّعُ رُجُوعها إِلَيْه، و يتطلّع طُلُوعها عليه؛ فَلَمّا اسْتَقَرَّتْ بِهَا الدّار، قالَتْ لِأَميرِالمُؤْمِنين عليه السلام:

يَابْنَ أبى طَالِبٍ! إشْتَمَلْتَ شملة الْجَنين، وَ قَعَدْت حجرة الظَّنين، نَقَضْتَ قادِمَةَ الأَجْدل، فَخانَكَ ريشُ الأَعْزل؛ هٰذَا ابْنُ أَبى قُحافَة يَبْتَزُّنى نِحْلَةَ أَبى وَ بلغَةَ ابْنَىَ [إِبْنيِ]! لَقَدْ أَجْهَدَ فى خِصامى، وَ أَلْفَيْتُه أَلَدَّ في كَلامى حَتى حَبَسَتْنى قيلة نصرها، وَ المُهاجِرَةُ وصلها، وَ غَضَّتِ الْجَماعَةُ دُونى طَرْفَها، فَلا دافِعَ وَ لامانع، خَرَجْتُ كاظِمَةً وَ عُدْتُ راغِمَة، أَضْرَعْتَ خَدَّكَ يَوْمَ أَضَعْتَ حَدَّك، إِفْتَرَسْتَ الذِّئاب، وَ افْتَرَشْتَ التُّراب، ماكَفَفْتَ قائلاً و لاأَغْنيت طائلاً، وَ لاخِيارَ لى، لَيْتَنى متُّ قَبْلَ هينَتى وَ دُونَ ذلّتى؛ عَذيرِيَ الله مِنْكَ عادياً و مِنْكَ حامياً، وَيْلاىَ في كُلِّ شارِقٍ! وَيْلاىَ فى كُلِّ غارِبٍ! ماتَ الْعَمَدُ وَ وَهِنَ الْعَضُد؛ شَكْواىَ إِلىٰ أبى! وَ عَدْواىَ إِلىٰ رَبى! اَللّهُمَّ أَنْتَ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَ حَوْلاً، وَ أَشَدَّ بَأْساً وَ تَنْكيلاً.

فَقالَ أَميرُالْمُؤْمِنينَ عليه السلام: لاوَيْلَ لَكِ، بَلِ الْوَيْلُ لِشانِئِكِ، ثُمَّ نَهْنهى عَنْ وجْدِكِ يَا ابْنَةَ الصَّفْوَة، وَ بَقِيَّةَ النبوّة؛ فَما ونيتُ عَن دينى، و لاأَخْطَأْت مَقْدورى؛ فَإِنْ كُنْتِ تُريدينَ الْبُلْغَة، فَرِزْقُكِ مَضْمُونٌ، وَ كَفيلُكِ مَأْمُونٌ، وَ ما أُعِدَّ لَكِ أَفْضَل مِمّا قُطِعَ عَنْكِ، فاحْتَسبى الله.

فَقالَتْ عليها السلام: حَسْبِيَ اللهُ وَ نِعْمَ الْوَكيلُ؛ وَ أَمْسَكَتْ.

***

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

وبہ نستعین

گزشتہ دروس میں ہم حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کے اس خطبے سے آگاہ ہوئے جو آپؑ نے فدک کے سلسلے میں مسجد میں ارشاد فرمایا تھا. آپؑ نے اپنی صریح اور مدلل گفتگو کے ذریعے ابوبکر کی مذمت کی اور مسجد میں موجود لوگوں کی خاموشی پر ان کی توبیخ فرمائی، لیکن ابوبکر نے مکاری اور چالاکی سے کام لیتے ہوئے آپؑ کی تعریف و تمجید کرنا شروع کردی اور خلافت و فدک کے غصب کے مسئلے کی توجیہہ کر کے اسے جائز ٹھہرانے کی کوشش کی.

حضرت زہراء (ع) ابوبکر کی پر فریب گفتگو کے بعد لوگوں کی طرف متوجہ ہوئیں اور ان کی سخت توبیخ اور مذمت فرمائی، پھر رسول خدا (ص) کی قبر کے سامنے چند سوزناک ابیات کے ذریعے اپنے دردِ دل کا اظہار فرمایا کہ ہم نے اختصار کے ساتھ جن کی طرف اشارہ کیا ہے.

حضرت علی (ع)، حضرت زہراء (ع) کے انتظار میں:

گھر میں حضرت امیر المؤمنین (ع)، حضرت فاطمہ زہراء (ع) کی واپسی کے منتظر ہیں اور شاید ان کے بارے میں پریشان ہیں اسی لئے آپ (ع) بار بار گھر سے باہر کی طرف نگاہ کرتے ہیں.

روایت کے مطابق جب حضرت فاطمہ (ع) نے اپنی تقریر تمام فرمائی، تو بابا کی قبر پر سوزناک انداز

میں چند اشعار کہے اور گھر کی طرف روانہ ہو گئیں.

" ثم انکفات(ع) وامیر المؤمنین(ع) یتوقع رجوعہا الیہ "

(پھر آپ (ع) گھر کی طرف روانہ ہوئیں حالانکہ امیر المؤمنین (ع) آپ (ع) کی واپسی کے منتظر تھے)

" ویتطلّع طلوعہا علیہ "

(اور آپؑ ۔ بار بار گھر سے نکل کر۔ حضرت زہراء (ع) کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے)

" تطلّع " بار بار دیکھنا. حضرت علی (ع) بار بار گھر سے نکل کے آپؑ کی آمد کا بے چینی سے انتظار فرما رہے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے آپؑ حضرت زہراء (ع) کے بارے میں پریشان تھے کہ کہیں خدا نخواستہ دشمن آپؑ کے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہ کرے.

حضرت علی(ع) کے حضور سوز دل کا بیان،

" فلما استقرت بہا الدار، قالت لامیر المؤمنین(ع)،

یابن ابی طالب! اشتملت شملۃ الجنین "

(پس جب آپؑ گھر میں پہنچیں تو امیر المؤمنینؑ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

اے ابوطالب کے فرزند! اس طرح خانہ نشین ہو گئے کہ جس طرح رحم مادر میں بچہ چھپا ہوا ہوتا ہے)

" وقعدت حجرۃ الظنین "

(اور ملزموں کی طرح گوشہ نشین ہو چکے ہو)

وہ شخص جو ملزم ہوتا ہے عام طور پر کسی گوشے میں اپنے آپ کو چھپاتا ہے. حضرت زہراء (ع)، حضرت علی (ع) سے یہ فرماتی ہے کہ: " ملزم لوگوں کی طرح ایک کونے میں بیٹھ گئے ہو " اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟ ۔ اور تلوار کیوں نہیں چلاتے ہو اور ان کو ادب کیوں نہیں کرتے ہو. ؟!۔

" نقضت قادمۃ الاجدل فخانک ریش الاعزل "

(۔ کیا آپؑ وہی نڈر انسان نہیں کہ ۔ جس نے شاہین کے پر توڑے لیکن ابھی لوگ خالی ہاتھوں سے آپؑ سے خیانت کر رہے ہیں)

اس عبارت کے کئی معانی ذکر ہوئے ہیں، لیکن علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار (۱) میں جو معنی ذکر فرمایا ہے وہ سب سے بہتر اور مقصود کو سمجھانے کے لئے زیادہ واضح تر ہے۔

اس معنی کے مطابق حضرت فاطمہ (ع) عمرو بن عبدود جیسے عرب کے دلیر اور شجاع پہلوانوں کو شاہین سے تشبیہہ دیتی ہیں اور حضرت امیر المؤمنین (ع) سے مخاطب کر کے فرماتی ہیں کہ: "آپؑ وہی انسان تو تھے جو شکاری شاہین کے پروں کو توڑ دیتے تھے" بدر، احد اور خیبر... جیسی جنگوں میں مشرک سرداروں کو شکست فاش دیتے تھے اور ان کی ناک کو زمین پر رگڑ دیتے تھے۔ آپؑ کے مقابلے میں ابو بکر اور عمر کی کوئی حیثیت ہی نہیں کہ آپؑ ہتھیار ڈال دیں اور اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو جائیں اور کوئی قدم نہ اٹھائیں!۔

" نقضت قادمة الاجدل " "قادمہ " آگے والے پر کو کہتے ہیں، شکاری شاہین کے اگلی طرف دس پر ہوتے ہیں اور وہ انہی پروں کے ذریعے پرواز اور شکار کرتا ہے۔ پروں کے اس مجموعے کا نام "قوادم " ہے جو "قادمہ " کی جمع ہے۔ یہاں "قادمہ " اسم جنس ہے اسی لئے مفرد آیا ہے۔ " اجدل " شاہین کا نام ہے۔ بنابریں اس جملہ کا معنی یہ ہو گا کہ آپؑ تو ایسے شخص تھے کہ جس نے شجاعت کے ساتھ شاہین۔ عرب کے دلیر اور شجاع انسانوں۔ کے پر توڑ دیئے اور ان کو شکست دی۔

" فخانک ریش الاعزل " "فخانک " میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہ لفظ "فخانک " ہو یعنی خالی ہاتھ اور اسلحہ سے محروم افراد نے آپؑ کے ساتھ خیانت کی ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ "فحاتک " ہو، یعنی اسلحہ سے عاری لوگوں نے آپؑ کو شکست دی ہے۔

" ریش الاعزل " تیر کی نوک کو "اعزل " اور باقی حصے کو "ریش " کہا جاتا ہے اور "ریش الاعزل " کے معنی ہیں تیر کا وہ دستہ جس کی نوک ٹوٹ چکی ہو یعنی وہ شخص جو اپنا تیر اور اسلحہ کھو چکا ہو اور صرف لکڑی کا دستہ کے باقی رہ گیا ہو۔

بہر حال حضرت زہراء (ع) کا مقصد یہ ہے کہ۔ اے امیر المؤمنینؑ۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب آپؑ

۱۔ بحار الانوار۔ طبع قدیم۔ ج ۸ ص ۱۲۶۔

اپنی شجاعت اور دلیری سے عرب کے دلیر، بہادر اور نامی پہلوانوں کو شکست دیتے تھے ان کی شوکت ودبدبے کو خاک میں ملادیتے تھے لیکن آج آپؑ کی حالت یہ ہے کہ ابوبکر و عمر جیسے بے حیثیت لوگوں نے کہ جن کے پاس کوئی اسلحہ بھی نہیں ہے فقط شور شرابے سے آپؑ کو شکست دی ہے اور آپؑ بھی گویا ہتھیار ڈال چکے ہیں!۔

حکومت کے حضرت زہراء(ع) کے ساتھ عناد اور دشمنی کی تصویر کشی:

"ھذا ابن ابی قحافۃ یبتزنی نحلۃ ابی و بلغۃ ابنیّ- ابنی-"

(اور ابی قحافہ کا یہ لڑکا، میرے بابا کی بخشش اور میرے بچوں کے ذریعہ معاش کو مجھ سے چھین رہا ہے!!)

"ابتزاز" کی اصل "بز" ہے اور یہ کاٹنے اور چھیننے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے. کپڑے بیچنے والے کو بھی اسی لئے بزاز کہا جاتا ہے کہ وہ کپڑوں کو کاٹتا ہے۔ "نحلہ" یعنی عطیہ اور بخشش.

حضرت زہراء(ع) خطبے کے پہلے حصے میں فدک کو میراث اور یہاں پر ہبہ و بخشش قرار دیتی ہیں جیساکہ ہم نے وہاں بھی کہا تھا، ارث سے آپؑ کا مقصد اصطلاحی ارث نہیں ہے جو کسی کے وفات پانے کے بعد ورثاء کو منتقل ہوتا ہے کیونکہ رسول خدا(ص)، اپنی زندگی میں ہی فدک، حضرت زہراء(ع) کو بخش چکے تھے اور حضرت فاطمہ(ع) بابا کی حیات کے دوران ہی فدک پر قابض تھیں. اگر آپؑ کا مقصد اصطلاحی ارث ہوتا تو ضروری تھا کہ فدک رسول خدا(ص) کی رحلت کے بعد آپؑ کو ملتا. بنابریں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ارث ایک عام تر مفہوم و معنی رکھتا ہے اور والدین کی زندگی میں انسان کو ملنے والی چیزوں پر بھی ارث کا اطلاق ہوتا ہے جیساکہ کوئی شخص اپنے باپ کی طرح ہوشیار ہو تو کہا جاتا ہے کہ اس کو صلاحیت اور استعداد اپنے باپ سے ارث میں ملی ہے. اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کی استعداد اور صلاحیت ترکہ کے عنوان سے اولاد کو منتقل ہوگئی ہو، بلکہ مراد یہ ہے کہ اس کی یہ صلاحیت اور ہوشیاری باپ دادا سے اسے ورثے میں ملی ہے[1].

1۔ اسی بنا پر، رسول خداؐ اور ائمہؑ، حضرت آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے وارث ہیں۔ جیساکہ زیارت ==

" وبلغة ابنی " " بلغہ " ذریعہ معاش کی معمولی سی چیز کا نام ہے. " ابنی " سے امام حسن اور امام حسین علیہما السلام مراد ہیں. ممکن ہے " ابنی " فرمایا ہو تو اس صورت میں اسم جنس ہو گا لیکن معنی کے اعتبار سے جمع ہو گا. پس " بلغہ ابنی " یا " ابنی " یعنی میرے بچوں کا معمولی سا ذریعہ معاش.

بہر صورت حضرت فاطمہ (ع) فرماتی ہیں کہ فدک جو کہ میرے والد گرامی (ص) کا عطیہ اور میرے بچوں کے زندگی گزارنے کا معمولی سی ذریعہ تھا ابو بکر نے مجھ سے چھین لیا اور مسلمان خاموش تماشائی بن کر دیکھتے رہے! کسی نے میرے حق کا دفاع نہیں کیا!! (۱).

" لقد اجہد فی خصامی "

(بتحقیق اس۔ ابو بکر۔ نے میری دشمنی پر کمر باندھ لی ہے!)

بعض نسخوں میں " اجھر " ذکر ہوا ہے یعنی وہ علی الاعلان مجھ سے دشمنی کر رہا ہے.

" والفیتہ الدّ فی کلامی "

(اپنی گفتگو کے دوران میں نے اس کو ضدی اور اپنا سخت ترین دشمن پایا!)

" الدّ " اس دشمن کو کہا جاتا ہے جو دشمنوں میں سب سے زیادہ اور سخت مقابلہ کرتا ہو یعنی جانی دشمن کو " الدّ " کہا جاتا ہے. قرآن میں بھی " وھو الدّ الخصام (۲) " اسی معنی میں استعمال

== وارث میں مذکور ہے۔ اور انبیاء ؑ کے وارث، علماء ہیں اور اس کے مقابلے میں تاریخ کے فرعون اور نمرود جیسے لوگوں کے وارث معاویہ اور یزید جیسے افراد تھے۔

۱۔ حضرت زہراء ؑ کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیت ؑ کی سادہ زندگی کا ذریعہ معاش صرف فدک تھا اور فدک کی آمدنی کا ایک معمولی حصہ اپنی ضروریات پر خرچ کرتے تھے اور آمدنی کے بہت بڑے حصے کو مسلمانوں کے عمومی مفادات اور ضروریات کو پورا کرنے میں صرف کرتے تھے۔ جیسا کہ غیبت کبریٰ کے دوران مراجع عظام کی روش بھی یہی ہے کہ شرعی رقوم سے انتہائی قناعت کے ساتھ اپنی سادہ زندگی کے مخارج پورے کرتے ہیں اور شرعی رقوم کی بہت بڑی مقدار کو دینی مدارس اور دین کی نشر واشاعت کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ غصب فدک کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ابو بکر خیال کرتا تھا کہ اس طریقے سے اہل بیت ؑ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جائے تاکہ اہل بیت ؑ اس کی غیر شرعی وغیر قانونی حکومت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں!! جیسا کہ تاریخ کے مختلف دوروں میں حکومتوں نے اس روش سے استفادہ کیا ہے اور بہت ساری شخصیات کو ان کی مدح سرائی اور تائید پر وادار کیا ہے!!!.

۲۔ سورۂ بقرہ / ۲۰۴.

ہوا ہے، یعنی وہ دشمن جو سب سے زیادہ سختی اور مقابلہ کرتا تھا۔

عام لوگوں کی بے توجہی کو مجسم کرنا۔

"حتی حبستنی قیلة نصرھا"

(انصار نے بھی میری مدد کرنے سے دریغ کیا)

"قیلہ" ایک عورت کا نام ہے اور اوس وخزرج کے قبائل اسی عورت کی نسل سے تھے۔ یہاں "قیلہ" سے مدینہ کے انصار مراد ہیں۔

اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابوبکر کی سختی اور ہٹ دھرمی کی سیاست کی وجہ سے مہاجرین وانصار آپؑ کی مدد کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ یہ ایک معمولی بات ہے کہ حکومت جب ستمگری اور ڈکٹیٹرشپ کو اپنی روش بنا لیتی ہے تو لوگوں میں یہ جرات نہیں رہتی کہ وہ حکومت کی پالیسی کے خلاف کوئی بات کریں یا حق کی حمایت کریں، چونکہ عموماً ہر شخص اپنی زندگی سے دلچسپی رکھتا ہے اور ماحول کو دیکھتا ہے اور اپنی جگہ پر یہ سوچتا ہے کہ۔ اگر میں کوئی قدم اٹھاؤں تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اسی حوالے سے انصار و مہاجرین بھی سوچتے تھے کہ۔ اتنی ساری فضیلتوں، معاشرے میں اتنے مقام ومنزلت اور اتنی عزت وخدمت کے باوجود بھی جب حکومت حضرت زہراء(ع) کا احترام نہیں کرتی اور خود رسول خدا(ص) کی بخشی ہوئی زمین کے ایک ٹکڑے کو ان سے چھین لیتی ہے تو دوسروں کی حالت کیا ہوگی؟ ایسے حالات میں فطری طور پر اکثر لوگ خوف وہراس کا شکار ہوجاتے ہیں اور خاموشی اختیار کرلیتے ہیں۔

"والمہاجرة وصلھا"

(اور مہاجرین نے بھی ہمارے ساتھ اپنے دیرینہ روابط سے چشم پوشی اختیار کی!)

اگرچہ مہاجرین ہمارے۔ اہل بیتؑ۔ کے ساتھ دیرینہ روابط اور تعلقات رکھتے تھے، صدر اسلام کی سختیوں میں سب پیغمبر(ص) کے ساتھ رہے تھے اور سب نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی لیکن ابوبکر اور اس کے حواریوں کے پروپیگنڈے اور ان کی دشمنی اس بات کا سبب بنی کہ مہاجرین بھی میرے حق

کی حمایت نہ کریں اور خاموش رہیں.

مختصر بات یہ کہ ابوبکر کے سخت رویے کی وجہ سے مہاجرین اور انصار نے میری مدد نہیں کی. جب ابوبکر میری بات ماننے کے بجائے میرا مقابلہ کرنے پر اتر آیا ہے تو لوگ خاموش ہوگئے ہیں.

حضرت علی (ع) نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں کہ: " وانما الناس مع الملوک والدنیا الا من عصم الله(۱) " (لوگوں کی اکثریت دنیا اور حکمرانوں کے ساتھ رہتی ہے مگر یہ کہ کسی کو خدا بچالے) قوموں کا تاریخی تجربہ بھی اس حقیقت کی بخوبی تائید کرتا ہے.

ان حالات میں کہ جب حکومت اپنی اصلی شاہراہ سے منحرف ہوچکی تھی جو بھی غاصب حکومت کی حاکمیت کو تسلیم کرتا تھا اسے روٹی اور مقام حاصل ہوجاتا تھا. یہ ایک فطری بات تھی کہ انصار کسی مقام ومنصب کی لالچ میں خاموش رہیں اور حکومت کی طرف سے ہونے والی بظاہر اسلامی توجیہات سے متاثر ہوجائیں. ابوبکر اور اس کے ہمفکر افراد بھی لوگوں کی اس کمزوری سے بخوبی آگاہ تھے اور انہوں نے اپنے سیاسی اقتدار کے استحکام کے لئے اس سے استفادہ کیا.

" وغضت الجماعة دونی طرفها "

(اور۔ مسجد میں حاضر۔ لوگوں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں تاکہ مجھے نہ دیکھیں !!)

مسجد میں موجود لوگوں کے اس بڑے اجتماع نے اپنی آنکھیں بند کرلیں تاکہ مجھے نہ دیکھیں۔ اور میری مدد نہ کرنے کی شرمندگی سے بچنے کی ناکام کوشش کریں۔ کیونکہ وہ سکون کی زندگی چاہتے تھے اسی لئے انہوں نے چشم پوشی سے کام لیا(۲).

" فلا دافع ولا مانع "

(پس نہ کوئی۔ ہمارا۔ دفاع کرنے والا تھا اور نہ ہی۔ ظلم۔ کو روکنے والا)

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۲۱۰.

۲۔ بد قسمتی سے مہاجرین اور انصار کی بہت سی شخصیات ایسی تھیں جو مذکورہ حالت کا شکار ہوگئی تھیں. اس سے ہم عام لوگوں کی حالت کا اندازہ لگاسکتے ہیں.

" خرجت کاظمۃ وعدت راغمۃ "

(۔درد دل اور سوز جگر کو سینے کے اندر۔ چھپا کر گھر سے نکلی تھی اور بے کس وتنہا اور شکست کھا کر واپس آگئی)

" کظم " یعنی چھپانا، ڈھانپ دینا۔ " کظم غیظ " کا معنی بھی یہی ہے کہ انسان غصے کو اپنے اندر رکھے اور ظاہر نہ کرے۔

" خرجت کاظمۃ " یعنی میں اس حالت میں گھر سے خارج ہوئی کہ میں اپنے درد دل اور پریشانی کو چھپائے ہوئے تھی۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میرے اوپر جو ظلم وستم ہوئے اس کی وجہ سے میرا دل دکھ درد اور غم واندوہ سے بھرا ہوا تھا لیکن یہ احتمال۔ مجھے تسلی دیتا تھا۔ کہ کم از کم ایک آدمی تو میری حمایت کرے گا اور میرے حق کا دفاع کرے گا لیکن وہاں مجمع میں سب خاموش رہے گویا کہ سب مر چکے ہوں!۔

" وعدت راغمۃ " " رغم " یعنی بے کسی، شکست اور خفت، یعنی میں دل شکستہ اور بے یار ومددگار، وہاں سے واپس آئی۔ یہ سارے الفاظ اہل بیتؑ اور حضرت زہراء(ع) کی مظلومیت پر دلالت کرتے ہیں۔ آپؑ پیغمبر اسلام(ص) کی اکلوتی بیٹی اور یادگار تھیں لیکن اس کے باوجود مسجد میں حاضر لوگوں میں سے کوئی شخص بھی ڈر یا لالچ کی وجہ سے آپؑ کی حمایت اور مدد کرنے کے لئے تیار نہ تھا! وہ اپنی آنکھوں سے ابوبکر اور اس کے ہمنوا ٹولے کے۔ غیر انسانی مظالم کو دیکھتے رہے اور اہل بیتؑ کی حمایت نہیں کی!۔

جہاد کی سی خاموشی:

" اضرعت خدک یوم اضعت حدک "

(آپؑ نے جس دن تلوار کی دھار کو ضائع کیا اسی دن سے اپنے چہرے کو آپؑ نے خود کمزور اور ضعف دکھایا ہے)

آپؑ ایک ایسے مجاہد تھے کہ جس نے جنگی محاذوں پر حق وعدالت کے دشمنوں کو اپنی تلوار کی دھار سے ذلیل ورسوا کیا، لیکن جس دن سے آپؑ نے اپنی تلوار کی نوک کو توڑا اسی دن سے اپنے آپ کو ضعیف کردیا ہے۔

حضرت علی (ع) کے سکوت کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان داخلی خلفشار اور جنگ کا شکار نہ ہوجائیں اس طرح اسلام جو کہ ایک نو خیز پودے کی حیثیت رکھتا تھا خطرے سے دوچار نہ ہوجائے. لہذا حضرت علی (ع) نے اپنے حق سے چشم پوشی کر کے خود کو اسلام پر قربان کردیا (۱).

"ضرع" یعنی ذلت و رسوائی. "اضرعت" باب افعال کا فعل ہے اور یہاں اس کا معنی یہ ہے کہ۔ اپنے آپ کو کمزور دکھایا ہے اور دشمن کے سامنے تسلیم ہوگئے ہیں.

یہ جملات سب کے سب تشبیہ ہیں اور آپ کا مقصد یہ ہے کہ جس دن سے آپ نے اسلام اور مسلمانوں کے مفادات اور مسلمانوں کی داخلی صفوں میں اتحاد و یکجہتی کے تحفظ کی خاطر تلوار کو نیام میں رکھا ہے اسی دن سے چند مفاد پرست لوگوں نے ان حالات سے غلط فائدہ اٹھایا ہے اور مسند اقتدار پر قبضہ کر کے آپ کو خانہ نشین اور بزعم خود ذلیل کیا ہے.

" افترست الذئاب وافترشت التراب "

(ایک ایسا وقت بھی تھا کہ جب آپ۔ کفر و نفاق و شرک کے۔ بھیڑیوں کو پھاڑ ڈالتے تھے،

لیکن آج زمین کو بچھونا بنائے ہوئے ہیں! ۔ اور گوشہ نشین ہو چکے ہیں۔)

"افتراس" یعنی چیرنا پھاڑنا. حیوان مفترس کا مطلب بھی چیرنے پھاڑنے والا حیوان ہے۔ اگر اوپر

۱۔ اس سلسلے میں "شہید صدر" اپنی فدک نامی کتاب کے ص ۹۷ پر فرماتے ہیں کہ.

"بعض لوگوں نے حضرت علی سے حکومت وقت کے خلاف قیام کی قیادت کی پیشکش کی لیکن آپ نے اس پیشکش کو ٹھکرادیا کیونکہ آپ ان کے عزائم سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ وہ حق و عدالت کے خواہاں نہیں ہیں بلکہ حضرت علی کے ذریعے خود ایوان اقتدار تک پہنچنا چاہتے ہیں. دوسری بات یہ کہ اس وقت جبکہ اسلامی ریاست بغاوتوں اور شورشوں کے نرغے میں پھنسی ہوئی تھی اگر آپ خاموشی ختم کر کے قیام فرماتے تو یقینا معاشرے کا نظام درہم برہم ہوجاتا اور دنیائے شرک و کفر کے مقابلے میں نو خیز اسلام کو شکست ہوتی اور کفار و معاندین بھی یہی چاہتے تھے. لہذا آپ نے اپنے سکوت کے ذریعے جہاں حکمران طبقے کی قانونی حیثیت کو چیلنج فرمایا تو وہاں کفار و معاندین کے ناپاک عزائم بھی خاک میں ملا دیئے..."

والا جملہ "افترست الذئاب" ہو یعنی "تاء" پر زبر کے بجائے سکون ہو تو یہ معنی ہو گا کہ۔ "بھیڑیے چیر پھاڑ میں مشغول ہیں اور آپؑ۔ ان کے شر سے انسانیت کو نجات دینے کے بجائے۔ زمین کو بچھونا بنائے ہوئے ہو!۔

دوسرے احتمال کے مطابق اس عبارت میں ابوبکر اور اس کے ہمفکر لوگوں کو درندوں سے تشبیہ دی گئی ہے اور امیرالمؤمنینؑ سے مخاطب ہو کر فرماتی ہیں کہ: درندے اپنی درندگی میں مشغول ہیں اور آپؑ گھر کے کونے میں مٹی کو اپنا فرش بنا کر بیٹھے ہوئے ہیں!۔

حضرت علی(ع) کی مظلومیت اور اسلام کی مصلحت۔

"ماکففت قائلاً"

(اور ہرزہ سرائی کرنے والوں کو رد کتے نہیں ہو!)

"کفّ" "روکنا" "قائل" "بولنے والا، کہنے والا۔

یہاں جس کا جو دل چاہتا ہے کہہ دیتا ہے اور جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے لیکن آپؑ کی حالت اس قدر خراب ہو چکی ہے کہ ان ہرزہ گو انسانوں کو ہرزہ گوئی سے نہیں روک سکتے!

ابوبکر آشکارا ہمارے حقوق پر ڈاکہ ڈالتا ہے، من پسند حدیث گھڑ کے پیغمبر(ص) کی طرف منسوب کرتا ہے وہ غلط تبلیغات اور پروپیگنڈوں کے ذریعے جو چاہے کہہ دیتا ہے لوگوں کو فریب دیتا ہے لیکن آپؑ کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں فرماتے اور سکوت اختیار کئے ہوئے ہیں!!۔

"ولا اغنیت طائلاً"

(۔موجود فتنہ و آشوب کو برطرف کرنے کے سلسلے میں۔ کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھا سکے ہو!)

یعنی، اگر لوگوں کے درمیان آپؑ کی شخصیت محفوظ ہوتی اور آپؑ کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہوتے تو یقیناً آپؑ کچھ نہ کچھ کر گزرتے، کوئی بات کرتے یا کوئی قدم اٹھاتے اور حکمران ٹولہ بھی خوفزدہ ہو جاتا اور پیچھے ہٹ جاتا، لیکن آپؑ پر ایک ایسی حالت مسلط کر دی گئی ہے کہ جس کی وجہ سے آپؑ ہاتھ پر ہاتھ

دھرے خانہ نشینی کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے اور ہر قسم کے قیام اور حرکت کو اسلام کی مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں.

دوسرے بعض نسخوں میں " ولا اغنیت باطلاً " ذکر ہوا ہے. یعنی آپؑ نے کسی باطل کو ختم نہیں کیا. یہاں باطل سے مراد ابوبکر کی غاصب حکومت ہے. البتہ اس سارے درد دل کا جواب اور امیر المؤمنینؑ کا عذر یہ تھا کہ اصل اسلام محفوظ رہے اور مسلمان آپس میں متحد رہیں اور مسلمانوں کی خانہ جنگی کی وجہ سے کہیں خود اسلام، خطرے میں نہ پڑجائے.

" ولا خیار لی "

(حالانکہ میرے بس میں کچھ بھی نہیں)

یعنی میں کچھ نہیں کر سکتی ہوں. یہاں حضرت زہراء (ع) کا مقصد ۔ العیاذ باللہ ۔ امیر المؤمنینؑ پر اعتراض نہیں بلکہ اس حالت کا بیان ہے کہ جس سے امیر المؤمنینؑ دوچار تھے. گویا آپؑ یہ بتانا چاہتی ہیں کہ: آخر ۔ راتوں رات ۔ حالات اس قدر کیوں بدل جائیں کہ آپؑ جیسی عظیم شخصیت بھی کچھ نہ کہہ سکے اور اپنے مسلم حق اور رسول خدا (ص) کی اکلوتی بیٹی کے حق سے دفاع نہ کر سکے ؟! حالانکہ آپؑ نہ ڈرنے والے ہیں اور نہ جھکنے والے اور نہ ہی ظلم وظالم کے ساتھ مبارزہ میں کمزوری کی وجہ سے فرار کرنے والے !!.

" لیتنی مت قبل ھینتی "

(اے کاش اس گوشہ نشینی اور جمود سے قبل میں مرچکی ہوتی)

" ھینہ " یعنی نرمی اور سکون. یعنی موجودہ صورتحال کے مطابق مجھے بھی گوشہ نشینی اور جمود اختیار کرنا پڑے گا. اے کاش کہ میں ایسی حالت سے قبل اس دنیا سے جا چکی ہوتی تاکہ ایسی صورتحال کو تحمل کرنے پر مجبور نہ ہوتی.

" و دون ذلتی "

(اور ۔ ظاہری طور پر ۔ ایسی ذلت کی حالت سے دوچار ہونے سے قبل مرجاتی)

اس کے بعد آپؑ اپنی گفتگو کے رخ کو بدلتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

" عـذیری اللّٰہ منک عادیاً ومنک حامیـاً "

(خداوند میرا عذر قبول کرے گا، میرے اوپر ہونے والے مظالم کو آپؑ دفع کرتے رہے اور میری حمایت کرتے رہے)

" عذیر، عاذر " کے معنی میں ہے، یعنی عذر قبول کرنے والا۔ " عذیری اللّٰہ " یعنی میری عذر قبول کرنے والا خـدا ہی ہے۔ نحوی ترکیب کے لحاظ سے " عذیری " مبتداء ہے اور " اللہ " اس کی خبر۔ جیسا کہ علامہ مجلسیؒ نے احتمال دیا ہے کہ شاید اس جملے سے، حضرت علیؑ سے عذر خواہی مقصود ہو۔ یعنی حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: یا علیؑ۔ اگرچہ۔ میرے اوپر ہونے والے مظالم کے سلسلے میں۔ آپؑ نے ہمیشہ میرا دفاع اور میری حمایت کی ہے اگر۔ اس درد دل کے دوران۔ کوئی جسارت ہوئی ہو تو امید ہے کہ خداوند مجھے بخشے گا۔

البتہ " عذیر " مددگار اور دوست کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ممکن ہے جملے کا مفہوم یہ ہو کہ: آپؑ کی حمایت اور دفاع کے بجائے خدا میرا حامی اور دفاع کرنے والا ہے (۱)۔

اهل بیت(ع) کی مظلومیت اور بے کسی کی انتہـاء،

حضرت زہراء(ع) اہل بیتؑ پر آنے والی مصیبتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

" ویـلای فی کل شارق، ویـلای فی کل غارب "

(مجھ پر وائے ہو ہر صبح۔ طلوع آفتاب کے وقت۔ وائے ہو مجھ پر ہر شب۔ غروب کے وقت۔)

" ویل " افسوس کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور آہ وزاری اور مدد چاہنے کے وقت الف کا اضافہ کر دیا جاتا ہے اور آخری یاء متکلم کی علامت ہے۔

" شارق " یعنی طلوع آفتاب کا وقت اور " غارب " یعنی سورج کے غروب ہونے کا وقت۔

۱۔ ممکن ہے یہ دعائیہ جملہ ہو کہ " خداوندا! تو ہی میرا حامی اور مددگار ہے۔ لہذا میں اپنے اوپر ہونے والے ظلم وستم کے مقابلے میں تجھ سے دفاع اور حمایت کی طلب گار ہوں اور تجھ سے ہی حمایت اور انتقام کی امید رکھتی ہوں۔

علامہ مجلسیؒ نے "ویلای" کے تثنیہ ہونے کا احتمال دیا ہے یعنی میرے اوپر دو بار وائے ہو اور یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔ لہذا "ویلای" ۔ تثنیہ کی شکل میں ۔ ذکر فرمانے کا مقصد، مسئلے کی اہمیت کو تاکید کے ساتھ بیان کرنا ہے۔

یہاں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ یہ جملے اور تعبیریں، اہل بیتؑ کی انتہائی مظلومیت اور بے بسی کو بیان کرتی ہیں کہ ابھی آنحضرت (ص) کی رحلت کو چند دن بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ آپ (ص) کی عترت اور یادگار نیز خلیفہ برحق پر اس قدر ظلم وستم روا رکھا جاتا ہے کہ حضرت زہراء (ع) ۔ جیسی صبر واستقامت کا بے مثال نمونہ بھی ۔ تڑپ کر حضرت علیؑ کے حضور اپنے سوز وگداز اور درد دل کا اظہار فرماتی ہیں۔

"مات العمد ووھن العضد"

(۔ہماری ۔تکیہ گاہ اور بھروسے کا مقام ۔آنحضرت (ع) ۔ چل بسے اور ۔ہمارے ۔ بازو کمزور ہو گئے)

"عمد" یعنی تکیہ گاہ۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ متن کی عبارت میں ۔ عمد کے بجائے ۔"عُمُد" صحیح ہے کیونکہ "عُمُد، عمود" کی جمع ہے کہ جس کا معنی پشت پناہ ہے۔ "عضد" یعنی بازو اور یہ طاقت اور توانائی کی طرف اشارہ ہے۔

آپؑ یہ فرماتی ہیں کہ: میرے والد بزرگوار جو ہماری طاقت کا سرچشمہ اور ہمارے پشت پناہ تھے اس دنیا سے چلے گئے لہذا ہم کمزور اور ناتواں ہو گئے ہیں (۱)۔

باباکے حضور شکایت اور بارگاہ خداوندی میں مناجات:

"شکوای الیٰ ابی وعدوای الیٰ ربی"

(میں اپنی شکایت کو باباکے حضور اور مظالم کو پروردگار کی بارگاہ میں عرض کروں گی)

"شکوا" اور "عدوا" کے معنی ہیں شکایت کرنا اور جس کے پاس جاکر شکایت کی جاتی ہے اسے.

۱۔ ممکن ہے "وھن العضد" سے مراد یہ ہو کہ معاشرے میں حضرت علیؑ کی حیثیت اور شخصیت کمزور ہوئی ہے۔

"عدوا" کہتے ہیں کیونکہ ہونے والے مظالم اور تجاوزات کو اسی کے پاس لے جاتے ہیں.

"اللّٰھم انت اشدّ منھم قوۃ وحولاً"

(پروردگارا!

طاقت اور قدرت کے اعتبار سے ان۔ فدک اور خلافت کے غاصبین۔ کے مقابلے میں، تو زیادہ طاقتور اور قوی تر ہے)

یعنی، خداوندا! یہ لوگ طاقت کے بل بوتے پر جو چاہتے ہیں کرگزرتے ہیں، لیکن تیری طاقت ہر طاقت سے بالاتر ہے، لہذا تو خود ان کا حساب لے اور ان کو قرار واقعی سزا دے.

"واشدّ باساً وتنکیلاً"

(اور تیرا عذاب اور انتقام ہر چیز سے شدید تر اور سخت تر ہے)

"باس" یعنی عذاب۔ "تنکیل" یعنی سزا. یعنی خداوندا! تو ہی ان کو اپنے دردناک عذاب میں مبتلاء کرکے سزا دے.

حضرت علی(ع) کا حضرت زہراء(ع) کو تسلی دینا.

"فقال امیر المؤمنین(ع)،

لاویل لک، بل الویل لشانئک"

(پھر امیر المؤمنین (ع) نے۔ حضرت فاطمہ (ع) سے مخاطب ہوکر۔ فرمایا؛

۔اے دختر رسول۔

آپؑ پر وائے نہیں بلکہ وائے۔ اور ویل۔ ان لوگوں پر ہے، جو آپؑ سے بغض رکھتے ہیں اور آپؑ کے دشمن ہیں)

"ویل" کا اصل معنی عذاب اور عقاب ہے اس کا "ویح" سے ربط نہیں کیونکہ "ویح" کا لفظ دلسوزی کے مواقع پر بولا جاتا ہے، چونکہ یہاں حضرت زہراء(ع) نے فرمایا کہ: مجھ پر وائے ہو صبح اور شام کے وقت تو امیر المؤمنین (ع) فرماتے ہیں کہ:۔ اے دختر رسول (ص)۔ آپؑ پر وائے اور افسوس نہیں بلکہ آپؑ کے دشمنوں اور آپؑ پر ظلم کرنے والوں پر "ویل" ووائے ہو. آپؑ رسول خدا (ص) کی بیٹی

ہیں، آپ خدا کے نیک اور صالح بندوں میں سے ہیں، لہذا آپ پر "ویل" کیوں ہو؟

"بل الویل لشانئک" بلکہ وائے اور "ویل" ان لوگوں پر ہو جو آپ سے بغض رکھتے ہیں اور آپ کے دشمن ہیں۔ "شانی" اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بغض اور دشمنی رکھتا ہو۔

"ثم نہنہی عن وجدک"

(خود کو اس پریشان کن اور سخت حالت سے دور رکھیں)

"وجد" یعنی غیظ و غضب۔ "نہنی، نہنہتہ" سے فعل امر کا واحد مؤنث مخاطب کا صیغہ ہے اور دور رکھنے اور روکنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اپنے غیظ و غضب کو قابو میں رکھیں۔

"یا ابنۃ الصفوۃ و بقیۃ النبوۃ"

(اے خدا کے برگزیدہ بندے کی بیٹی اور اے یادگار نبوت۔ پیغمبر خدا (ص)۔)

"فما ونیت عن دینی"

(پس میں اپنے دین کے بارے میں ہرگز سست اور ناتواں نہیں ہوا ہوں)

"ونی" ضعف اور سستی کے معنی میں ہے۔ امیر المؤمنین (ع) یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ میں اپنے دین پر عمل کرنے کے لحاظ سے ہرگز ضعیف اور سست نہیں ہوا ہوں اور جو میری توان میں تھا میں نے انجام دیا ہے۔

حضرت علیؑ اس سے زیادہ اقدام نہیں کر سکتے تھے اور اس بارے میں سختی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ دوسرے مسائل کو بھی مدنظر رکھتے تھے۔ اگر اوائل اسلام میں سختی اور شہامت کے ساتھ مقابلہ فرماتے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت اسلام کا فائدہ اسی میں تھا لیکن ابھی دین کی مصلحت اس میں ہے کہ آپ خاموش رہیں۔ اسی لئے آپ حضرت زہراء (ع) کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اگر آپ دیکھ رہی ہیں کہ میں خاموش ہوں اور کوئی رد عمل نہیں کر رہا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں اپنے دین کے بارے میں سست یا کمزور ہو چکا ہوں۔

"ولا اخطات مقدوری"

(میں نے اپنی طاقت اور توانائی کے اندر رہتے ہوئے کوئی غلطی نہیں کی ہے)

یعنی، اپنی طاقت کے مطابق شرعی ذمہ داری ادا کردی ہے۔ اور اس میں لیت ولعل سے کام نہیں لیا ہے۔.

" فان کنت تریدین البلغة، فرزقک مضمون وکفیلک مامون "

(۔اگر آپ کا مقصد، ضروریات زندگی ہیں تو۔ آپ کی روزی کی ضمانت دی گئی ہے

اور آپ کا کفیل۔ خدا۔ قابل اعتماد ہے)

یعنی، خداوند اپنے بندوں کی ضروریات کا ضامن اور ذمہ دار ہے اس میں کسی قسم کی پریشانی کی ضرورت نہیں (۱)۔

۱۔ اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ فدک کے مسئلے میں حضرت فاطمہ کا بنیادی مقصد، مسئلہ امامت کا دفاع تھا۔ حضرت علی کے اس جملہ کو۔ ذیل کے دو طریقوں میں سے ایک کے ذریعے۔ توجیہہ کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ ایک یہ کہ وہاں تقیہ کرنے کی ضرورت تھی اور حضرت علی چاہتے تھے کہ حضرت زہراء کا بنیادی مقصد آشکار نہ ہوجائے تاکہ اہل بیت کو درپیش خطرات سے محفوظ رکھا جائے۔

۲۔ یا یہ کہیں کہ " رزق اور بلغہ " سے مراد اہل بیت کی روزمرہ کی مادی ضروریات نہیں بلکہ معاشی ضروریات کے علاوہ، سیاسی، معاشرتی ... غرض تمام زندگی کے تمام شعبوں کی ضروریات مراد ہیں، کیونکہ اس قسم کی ضروریات کسی بھی صورت میں اہل بیت کی خوراک و پوشاک کی ضرورتوں سے کمتر نہیں ہیں۔

یہاں پر چند نکات ایسے ہیں جو تقیہ والے احتمال کی تائید کرتے ہیں:

۱۔ حضرت علی سے بیعت لینے کے واقعہ میں عمر نے یہ دھمکی دی کہ اگر حضرت علی بیعت نہ کریں تو گھر کو گھر والوں سمیت، اگرچہ ان میں فاطمہ ہی کیوں نہ ہو، جلادیں گے !!۔ اس واقعہ سے ہم حکومت کی طرف سے حضرت زہراء کو درپیش خطرات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ (فدک ص ۷۹ تالیف: شہید باقر الصدر)۔

۲۔ مسجد میں حضرت زہراء کے خطبہ کے تمام ہونے کے بعد ابوبکر نے ایک گفتگو کے ضمن میں کہا کہ: " اس فتنے کی اصل جڑ، علی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ حالات پہلے کی طرح ہوجائیں ... " (بحار الانوار۔ طبع قدیم۔ ج ۸ بہ نقل از ابن ابی الحدید)۔۔ ابوبکر کی ان باتوں سے۔ بخوبی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہونے یا اس کی رہبری کرنے میں آپ پر شدید الزام تھا اس طرح آپ بھی خطرے سے دوچار تھے۔

۳۔ مندرجہ بالا ماخذ میں یہ بھی مذکور ہے کہ: مسجد میں حضرت زہراء کے خطاب کے نتیجے میں بعض لوگوں کے جذبات بھڑک اٹھے اور انہوں نے حضرت علی کے حق میں نعرے لگائے جس پر ابوبکر نے فوراً انہیں دھمکی دی اور انہیں " سفہاء " یعنی احمق سے تعبیر =

" وماعدّ لک افضل مما قطع عنک "

(اور جو کچھ خدا نے آپؑ کے لئے آمادہ کیا ہوا ہے

وہ اس چیز کے مقابلے میں بدرجہا بہتر ہے جو آپؑ سے چھین لیا گیا ہے)

" فاحتسبی اللّٰہ "

(پس اسے خدا کے حوالے کر دیں)

یہاں حضرت علیؑ ۔ حضرت زہراءؑ کو ۔ آخرت کے معنوی مقامات کی یاد دلاتے ہیں جو خداوند متعال نے اپنے اولیاء صالح ، فداکار ، صابر اور بردبار بندوں کے لئے آمادہ فرمائے ہیں. اس طرح آپؑ دختر رسول (ص) کو تسلی دیتے ہیں.

" فقالت (ع) حسبی اللّٰہ ونعم الوکیل "

(پھر حضرت زہراء (ع) نے فرمایا کہ:۔ دراصل ۔ خدا ہی میرے لئے کافی ہے اور وہی بہترین دفاع کرنے والا ہے)

" وامسکت "

(اور آپ (ع) خاموش ہو گئیں)

حضرت علی (ع) کے حضور حضرت زہراء (ع) کے درد دل کا ایک تجزیہ:

حضرت زہراء (ع) کا خطبہ یہاں اپنے اختتام کو پہنچتا ہے البتہ ایک نکتے کی طرف اشارہ ضروری ہے

= کرتے ہوئے کہنے لگا کہ: "یہ احمق لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟" یہاں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ غیر معمولی حالات میں زندگی گزار رہے تھے اور آپؑ پر حکومت کی کڑی نظر تھی.

اس طرح حالات کی نزاکت کا یہ تقاضا تھا کہ اہل بیتؑ کا بنیادی مقصد اور مبارزہ کا طریق کار حکومت کی نگاہوں سے مخفی ہی رہے.

۔ ممکن ہے یہ مراد ہو کہ اگر آپؑ فدک اور ظاہری خلافت کے خواہاں ہیں تو ان کے چھن جانے پر غمگین نہ ہوں کیونکہ ہماری مادی و معنوی ضروریات کو پورا کرنے والا خدا ہے اور واقعی امامت اور خلافت حقہ تو کوئی چھین ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کی تو خدا نے ضمانت دی ہوئی ہے۔۔

اور وہ اس خطبے سے مربوط دو اعتراض اور ان کے جواب ہیں. علامہ مجلسیؒ بحار الانوار میں (۱) فرماتے ہیں کہ: بعض لوگ۔ اس خطبے پر۔ دو اشکال کرتے ہیں:

پہلا اشکال: حضرت فاطمہ (ع) معصوم تھیں اس کے باوجود کس طرح آپؑ نے حضرت علیؑ سے تندی اور تلخی کے ساتھ بات کی؟ کیا امیر المؤمنینؑ امام اور ولی امر نہیں تھے؟ امامؑ کے ساتھ تو اس طرح کی تلخ کلامی نہیں کی جا سکتی ہے!۔

علامہ مجلسیؒ اس اشکال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:

حضرت زہراءؑ کا مقصد یہ تھا کہ خلافت کرنے والوں کے غلط کاموں کو مجسم کریں اور۔ لوگوں کو۔ یہ سمجھائیں کہ وہ کس قسم کے عظیم جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں؟ در اصل اسی مصلحت کے پیش نظر آپؑ نے تلخی کلامی سے کام لیا تھا، کیونکہ جب انسان کسی حادثہ کی گہرائی اور اہمیت کو بیان کرنا چاہتا ہے تو عتاب آمیز کلمات کے ذریعے خطاب کرتا ہے، حالانکہ اس کا مقصد اپنے مخاطب کے ساتھ سختی اور تلخی سے پیش آنا نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف حادثہ کی اہمیت اور فاجعہ کی گہرائی کو سمجھانا ہوتا ہے۔ اور یہ طریقہ بھی باہمی گفتگو اور افہام و تفہیم کی ایک روش ہے. آئیے بطور مثال فرض کرتے ہیں کہ: کسی مملکت کا بادشاہ یا حاکم جب دیکھتا ہے کہ اس ملک کے تاجروں نے کوئی بڑی غلطی کی ہے تو وہ وزیر تجارت کو سختی سے ڈانٹ دیتا ہے اور اس کو تنبیہہ کرتا ہے حالانکہ حاکم جانتا ہے کہ اس بارے میں وزیر تجارت بے قصور ہے، لیکن بادشاہ یا حاکم اپنے اس عقاب اور سرزنش کے ذریعے یہ چاہتا ہے کہ تاجروں کے غلط کام کی اہمیت اور اس کی قباحت کو مجسم کرے۔

دوسرا نمونہ یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کوہ طور سے واپس آئے تو دیکھا کہ بنی اسرائیل گوسالہ پرست ہو چکے ہیں، تو آپؑ نے حضرت ہارونؑ کو عتاب کا نشانہ بنایا اور ان کی سرزنش کی اور ہارونؑ کی داڑھی پکڑ کر ان سے پوچھا کہ یہ آپؑ نے کیا کیا ہے؟

حضرت ہارون نے جواب دیا کہ: "یابن امّ لا تاخذ بلحیتی ولا براسی...(۱)" (اے میری ماں

۱۔ بحار الانوار، طبع قدیم، ج ۸ ص ۲۷۔ ۲۔ سورۂ طہٰ / ۹۴۔

کے بیٹے! میری داڑھی اور سر کو مت پکڑ میں تو اس بات سے ڈر رہا تھا کہ کہیں آپؑ یہ نہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان اختلاف کیوں ڈالا ہے ؟...)

حضرت موسیٰؑ جانتے تھے کہ حضرت ہارونؑ کی کوئی غلطی نہیں تھی لیکن چونکہ آپؑ بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کی زشتی اور برائی کو مجسم کرنا چاہتے تھے اور اس کی قباحت سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے خواہاں تھے تو اس لئے بظاہر آپؑ نے اپنے بھائی۔ ہارونؑ۔ سے تلخ کلامی کی۔

یہاں بھی حضرت زہراءؑ چاہتی تھیں کہ ظالمین کے ظلم وستم کی گہرائی اور قباحت کو مجسم کریں لہذا اس انداز میں گفتگو کی کہ اس دور کے لوگوں اور تاریخ کو یہ سمجھادیں کہ اہل بیتؑ پر کس قسم کے عظیم مظالم ڈھائے گئے ہیں۔

یہ تھا پہلا سوال اور علامہ مجلسیؒ کا جواب۔

فدک کے بارے میں حضرت زہراء(ع) کے اصرار کا فلسفہ۔

دوسرا اعتراض: ممکن ہے بعض لوگ یہ اعتراض کریں کہ فدک ایک معاشی مسئلہ تھا اس کی خاطر حضرت زہراءؑ نے آخر کیوں اتنی معرکہ آرائی کی؟ اور اس مخصوص حالت میں مسجد تشریف لے گئیں؟ اور وہاں وہ آتشیں خطبہ ارشاد فرمایا؟ کیا حضرت زہراءؑ یہ نہیں جانتی تھیں کہ ہر شخص کی روزی خدا دیتا ہے اور وہ تمام انسانوں کا رازق ہے؟

دوسری طرف سے آپؑ زہد اور دنیا سے بے توجہی کے لحاظ سے بھی شہرت رکھتی تھیں، تو مال سے مربوط ایک مسئلے میں اس قدر سختی کا کیوں مظاہرہ فرمایا؟

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ: پہلی بات تو یہ ہے کہ فدک اگرچہ بظاہر حضرت زہراءؑ کے اختیار میں تھا لیکن دراصل یہ تمام اہل بیتؑ سے مربوط تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ فدک حضرت زہراءؑ کو بخشنے کا مقصد یہ تھا کہ حضرت علیؑ اور امامت کا گھرانہ مالی اعتبار سے بے نیاز ہو جائے، جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا کہ فدک کا امامت وخلافت اور پیغمبر (ص) کے بعد آپ (ص) کے برحق جانشین اور وصی کے

ساتھ گہرا ربط تھا، لہذا آپ اپنے اس موقف اور جد وجہد کے ذریعے یہ بیان کرنا چاہتی تھیں کہ تم نے امامت اور خلافت کو کیوں غصب کیا؟۔ خلاصہ: یہ ایک صرف مالی مسئلہ نہیں تھا بلکہ فدک، پیغمبر (ص) کی خلافت حقہ کی علامت تھی، لہذا غصب فدک پر اعتراض دراصل خلافت کے غصب پر اعتراض تھا اور آپ کا مقصد بھی غصب خلافت پر اعتراض کرنا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس خطبے کے ارشاد فرمانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ: آپ مسلمانوں پر اتمام حجت کرنا چاہتی تھیں۔ کیونکہ اعتراض نہ کرنے کی صورت میں فدک اور خلافت کے مسئلے میں ابوبکر کی خیانت کا کسی کو پتہ بھی نہ چلتا اور سب یہی سوچتے کہ ابوبکر اور اس کی تمام کاروائی حق پر مبنی ہے اور لوگ یہ سمجھتے کہ اگر وہ غلط ہوتے تو کم از کم دختر رسول خدا (ص) اس پر اور مسلمانوں کے اس کے ساتھ ہوجانے پر اعتراض فرماتیں، لہذا آپ مسجد میں تشریف لے گئیں اور خطبہ پڑھا تاکہ اتمام حجت ہوجائے۔ اسی لئے آپ نے اپنے خطبے کے دوران فرمایا کہ: میں جانتی ہوں کہ تم دنیا کے دلدادہ بن گئے ہو اور عہد شکنی تمہاری رگوں میں سرایت کر چکی ہے لیکن میں یہ خطبہ صرف اس لئے پڑھ رہی ہوں کہ اپنے دل کے سوز اور درد کا اظہار کر سکوں" ولکنہا فیضۃ النفس "اور یہ کہ تم پر اتمام حجت کروں. پس آپ کا مقصد۔ مال دنیا کی لالچ نہیں بلکہ۔ اتمام حجت تھا۔

تیسری بات کہ جو بنیادی نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ آپ اپنے اس خطاب کے ذریعے، اہل بیت کی مظلومیت اور غاصبین حکومت کے ظلم وستم کو ثابت کرنا چاہتی تھیں اگر آپ خاموش رہتیں تو لوگوں کو کیا معلوم کہ اہل بیت پر کیا بیتی ہے اور ان پر کتنے عظیم مظالم ڈھائے گئے ہیں. آپ کا یہ خطاب اہل بیت کی مظلومیت پر ایک زندہ شاہد ہے اور یہ تاریخ کے ہر دور میں اس زمانے کے غاصب حکمرانوں کے مظالم۔ اور کجرویوں۔ پر گواہی دیتا ہے نیز بعد میں آنے والی نسلیں اس تلخ حقیقت سے آگاہ ہوئیں کہ: مہاجرین اور انصار کی اکثریت کس قدر غیرت سے عاری تھی جو اپنی آنکھوں سے مظالم کو دیکھتی رہی لیکن۔ مجسموں کی طرح۔ سب خاموش تماشائی بنے رہے. اپنے پیغمبر (ص) کے اہل بیت کی حرمت اور حقوق سے معمولی سا دفاع بھی نہیں کیا!

ایک عرب شاعر کی زبانی، انصار اور مہاجرین کے سکوت کی تصویر کشی،

یہاں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس عرب شاعر کے اشعار سے چند بیت یہاں ذکر کروں، کہ جو اس نے انصار اور مہاجرین کو مخاطب کر کے کہے ہیں. وہ کہتا ہے:

"تم پیغمبر خدا (ص) کی نہیں بلکہ ابوبکر کی امت ہو اور تمہاری یہ بات کہ ہم محمد مصطفیٰ (ص) کی امت ہیں جھوٹ کے سوا کچھ نہیں. اس کی دلیل یہ ہے کہ جب پیغمبر (ص) کی بیٹی تمہارے پاس آئی اور اپنے اوپر ہونے والے مظالم کے سلسلے میں تم سے شکایت کی اور مدد چاہی تو تم نے بے توجہی سے کام لیا اور خاموشی اختیار کی لیکن جب ابوبکر کی بیٹی (عائشہ) نے تم سے مدد چاہی تا کہ علیؑ کے خلاف جنگ لڑے تو تم بڑے شوق سے اس کی مدد کے لئے آگے بڑھے اور یہ کہنے لگے کہ کیا ممکن ہے کہ خلیفہ کی بیٹی جھوٹ بولے یا اشتباہ کرے؟! پس یہ حقائق بتاتے ہیں کہ تم محمد (ص) کی امت نہیں ہو بلکہ ابوبکر کے پیرو کار اور اس کی امت ہو!۔

"ما المسلمون بامة لمحمد کلا و لکن امة لعتیق"

(مسلمان۔ تم۔ محمد (ص) کی امت ہرگز نہیں ہو بلکہ تم عتیق کی امت ہو)

"عتیق" یعنی آزاد شدہ غلام، یہ ابوبکر کے القاب میں سے ایک ہے.

"جاء تھم الزھراء تطلب ارثھا فتقاعدوا عنھا بکل طریق"

(حضرت زہراءؑ اپنا ارث مانگنے کے لئے ان کے پاس آئیں تو سب نے بے توجہی کی اور مختلف بہانوں کے ذریعے آپؑ کی مدد کرنے سے انکار کر دیا)

"وتواثبوا لقتال آل محمد لما دعتھم ابنة الصدیق"

(لیکن یہی لوگ، آل محمد (ص) سے لڑنے کے لئے ٹوٹ پڑے جب ان کو۔ ابوبکر۔ صدیق کی بیٹی نے بلایا)

"صدیق" بھی ابوبکر کا ایک لقب ہے.

"فقعودھم عن ھذہ وقیامھم مع ھذہ تغنی عن التحقیق"

(پس حضرت زہراءؑ سے ان کی بے اعتنائی اور عائشہ کے ساتھ ان کا تعاون، ان کے ماضی۔ اور مافی الضمیر اور افکار ونظریات۔ کے بارے میں تحقیق کرنے سے بے نیاز کرتا ہے)

یعنی، پیغمبر (ص) کی وفات کے بعد کے مسلمان بلاوجہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے تھے بلکہ وہ عملی طور پر پیغمبر (ص) کی امت ہونے کی بجائے ابوبکر کی امت بن چکے تھے۔ دلیل کے لئے یہی کافی ہے کہ انہوں نے حضرت زہراءؑ سے بے اعتنائی کی جبکہ عائشہ نے جب حضرت علیؑ کے خلاف لشکر کشی کی دعوت دی تو اسے لبیک کہا!! صرف یہی نہیں بلکہ امیر المؤمنینؑ کے بعد عائشہ کی پیروی اور اس کی سرکردگی میں فرزند رسول (ص) امام حسن مجتبیٰؑ کے جنازہ پر تیروں کی بارش برسائی!!!۔

پس ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ کہ ہم رسول خدا (ص) کی امت ہیں جھوٹ کے سوا کچھ نہیں بلکہ تم ابوبکر کی امت ہو اور دنیا اور اس کے مقام اور ثروت کے غلام ہو۔

اللّٰہم العن اول ظالم ظلم حق محمد وآل محمد (ص) وآخر تابع له علیٰ ذلک

پروردگارا !

جنہوں نے سب سے پہلے محمد وآل محمد (ص) پر ظلم کیا

اور

جنہوں نے اس ظلم میں ان کی پیروی کی

ان سب پر

اپنا قہر وغضب نازل فرما

والسلام علیکم ورحمة اللّٰہ وبرکاته

حصّہ دوئم:

⊖ بستر شہادت پر

انصار ومہاجرین کی عورتوں سے

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کا خطاب

تیرھواں درس،

- خطبے کی سند
- انصار اورمہاجرین کی عورتوں کاحضرت زہراء (ع) کی عیادت کرنا
- لوگوں کی بے وفائی کی ایک جھلک
- مذہب اور سیاست کے کھلاڑی
- فکری کمزوری اور آراء کا اختلاف
- حکومت کی بدعنوانی کے مقابلے میں عوام کی ذمہ داری
- شاھراہ امامت سے انحراف کا آغاز
- اصحاب سقیفہ کے سیاسی مقاصد

وَ قالَ سويد بن غفلة: لَمّا مَرِضَتْ فاطمة عليها السلام، المَرضَة الّتی تُوُفِّيَتْ فيها، اجتمعت إليها نساء المهاجرين و الأنصار ليعدنها؛ فَقُلْنَ لها: كيف أَصْبَحْتِ مِنْ عِلَّتكِ يا ابْنَة رَسُولِ الله صلى الله عليه وآله؟ فَحَمَدَتِ الله و صلّت على أبيها صلى الله عليه وآله، ثمّ قالت:

أصبحتُ وَ اللهِ عائفةً لِدُنياكُنّ، قالِيةً لِرِجالِكُنّ، لَفَظْتُهم بَعْدَ أَنْ عَجَمْتُهم، وَ شَنَأْتُهم بَعْدَ أَن سَبَرتُهم؛ فَقُبْحاً لِفلولِ الحَدّ، و اللَّعْبِ بَعْدَ الجِدّ، وَ قرع الصَّفاة و صدع القَنْاة، وَ خَتلِ الآراء وَ زلل الأَهْواء؛ وَ بِئْسَ ما قدمت لَهُم أنفسهم: أن سَخِطَ اللهُ عَلَيهم وَ فی العذاب هم خالدون؛ لاجرم لَقد قلّدتُهم ربقتها، وَ حمَّلتُهم أوقَتَها، و شَنَنْتُ عَلَيْهم غاراتها؛ فَجدْعاً وَ عقراً و بُعداً لِلْقَوْمِ الظّالِمينَ.

وَيْحَهم أَنىٰ زَعْزَعُوها عَنْ رَواسِی الرِّسالَةِ، وَ قَواعِدِ النُّبوَةِ و الدَّلالَـةِ، وَ مَهْبَطِ الرُّوح الأَمين، والطِّبين بِأُمـورِ الدّنيا و الدّيـن؟ أَلاٰ ذلك هُـوَ الخُسْـران المُبين؟

وَ مَا الّذی نَقَمُوا مِنْ أَبِی الحَسَن عليه السلام؟! نَقَمُوا وَاللهِ مِنْه نَكيرَ سَيْفِه، و قلّةَ مُبٰالاته لِحَتْفِهِ، وَ شِدَّةَ وَطْأَتِه، وَ نَكال وَقْعَتِه، وَ تَنَمُّره فی ذاتِ اللهِ.

***

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

وبہ نستعین

جیسا کہ تاریخ اور روایات کی کتابوں میں مذکور ہے، رسول خدا (ص) کی رحلت کے بعد، حضرت زہراءؑ نے دو خطبے ارشاد فرمائے۔ ایک خطبہ مسجد النبی (ص) میں اور دوسرا خطبہ بستر شہادت پر جب انصار اور مہاجرین کی عورتیں آپؑ کی عیادت کے لئے آئی تھیں۔

گزشتہ دروس میں ہم نے پہلے خطبہ کو جو ذرا مفصل بھی تھا پڑھا جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ ہمارا مقصد آپؑ کے کلمات اور جملوں کی مکمل تشریح نہیں بلکہ صرف مختصر سی وضاحت کرنا مقصود ہے وہ بھی اس طرح کہ ہر سطح کے قارئین حضرات اس سے استفادہ کرسکیں اور ہم بھی ان کے نورانی الفاظ سے فیض حاصل کرسکیں۔

خطبے کی سند:

آپؑ کے اس دوسرے خطبے کو جسے ہم نے ابھی شروع کیا ہے۔ علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار کی جلد ۴۳ ص ۱۵۹ میں حضرت زہراءؑ کے حالات زندگی کے حصے میں ذکر فرمایا ہے، اگرچہ یہ خطبہ دوسری کتابوں میں بھی نقل ہوا ہے لیکن ہم اسے "احتجاج طبرسی" سے نقل کررہے ہیں(۱)۔

۱۔ کتاب احتجاج کے علاوہ، شرح ابن ابی الحدید ج ۱۶ ص ۲۳۳ نے "سقیفہ و فدک" نامی کتاب سے اپنی سند کے ساتھ، اور =

اس خطبے کا راوی " سوید بن غفله " ہے (۱) بعض نے اس کا نام " سوید بن غفلة " کہا ہے لیکن شیعہ اور سنی، علم رجال کے مشہور ماہرین نے " سوید بن غفلة " ہی ذکر کیا ہے۔ یہ شخص ایک نیک انسان تھا پیغمبر (ص) کی زندگی میں مسلمان ہوا لیکن اسے مدینہ آکر آپ (ص) کی زیارت کرنے کا شرف حاصل نہ ہوا۔

اب اگر کسی فرد کے صحابی ہونے کا معیار یہ ہو اکہ وہ اپنی آنکھوں سے آنحضرت (ص) کی زیارت کرے تو "سوید بن غفلہ" صحابی نہیں کہلائے گا، لیکن اگر صحابی کا معیار یہ ہو کہ آنحضرت (ص) کی زندگی میں اسلام قبول کرے تو یہ شخص رسول خدا (ص) کے اصحاب میں شمار ہوگا۔ بہرحال "سوید بن غفلہ" ایک مخلص مسلمان تھا۔ سن ۸۵ ہجری کے قریب وفات پائی وہ طویل العمر انسان تھا۔ بعض نے اس کی عمر ۱۳۰ سال اور بعض نے ۱۱۰ سال ذکر کی ہے۔ بہر صورت شیعہ و سنی دونوں کے علم رجال کے ماہرین نے اس کا نام ذکر کیا ہے اور اس خطبے کا راوی ایک قابل اعتماد اور موثق انسان ہے۔

انصار اور مہاجرین کی عورتوں کا حضرت زہراء (ع) کی عیادت کرنا۔

کتاب احتجاج میں نقل ہوا ہے کہ:

" قال سوید بن غفلة، لمـّا مرضت فاطمه (ع) المرضة التی توفیت فیها "

(سوید بن غفلہ کہتا ہے کہ: جب حضرت زہراءؑ بیمار ہوئی کہ جس میں آپؑ نے وفات پائی۔ اور شہید ہوئیں۔)

" اجتمعت الیها النساء المهاجرین والانصار لیعدنها "

(انصار و مہاجرین کی عورتیں آپؑ کے پاس جمع ہوئیں تاکہ آپؑ کی احوال پرسی کریں)

= " بلاغات النساء "، " اعلام النساء " اور " احقاق الحق " نے ایک دوسری سند کے ذریعے اور " معانی الاخبار " میں " مرحوم صدوق " نے دو سندوں کے ساتھ اس خطبے کو نقل کیا ہے۔

۱۔ البتہ علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار ج ۴۳ میں اس خطبے کو دو اور سندوں کے ذریعے نقل کیا ہے۔ ایک سند، صدوق کی کتاب، معانی الاخبار سے لی ہے کہ جس نے عبداللہ بن حسن سے اور اس نے اپنی والدہ فاطمہ بنت امام حسینؑ سے یہ خطبہ نقل کیا ہے۔ دوسری سند شیخ طوسیؒ کی کتاب " امالی " میں ابن عباس کی روایت سے نقل ہوئی ہے۔

" فقلن لھا، کیف اصبحت من علتک، یابنۃ رسول اللہ ؟"

(یہ عورتیں آپؑ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں کہ: اے رسول خدا (ص) کی دختر گرامی، اس بیماری میں کس طرح صبح کی۔ اور اس کے ساتھ زندگی کیسے گزر رہی ہے ؟)

" فحمدت اللہ وصلت علیٰ ابیہا"

(تو آپؑ نے خدا کی حمد وثنا کی اور اپنے بابا۔ رسول خدا (ص)۔ پر درود بھیجا)

یہاں پر آپؑ نے جو خدا کی حمد وثنا کی تھی راوی نے ذکر نہیں کی ہے حالانکہ پہلے خطبے میں تفصیل سے نقل ہوئی تھی، بہرحال یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معمول تھا کہ پہلے خدا کی حمد وثناء سے تقریر کا آغاز کریں اور پھر اسے جاری رکھیں.

اس خطبہ میں آپؑ پہلے خداوند عالم کی حمد وثنا فرماتی ہیں پھر پیغمبر اکرم (ص) پر درود وصلوات بھیجنے کے بعد اپنی گفتگو کا آغاز فرماتی ہیں.

" ثم قالت، اصبحت واللہ عائفۃ لدنیاکن، قالیۃ لرجالکن"

(اس کے بعد آپؑ نے فرمایا کہ:

خدا کی قسم اس حالت میں، میں نے صبح کی کہ تمہاری دنیا سے نفرت رکھتی ہوں اور تمہارے مردوں سے بغض رکھتی ہوں)

" عاف الشی " " کرہہ " کے معنی میں ہے یعنی اس نے اس چیز سے نفرت کی ہے "قالیہ " بھی "ابغضہ " کی طرح ناراض ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیساکہ قرآن کریم میں بھی موجود ہے کہ : " وما ودعک ربک وما قلیٰ[1] " (۔ اے رسول۔ خدا نے نہ تجھ کو چھوڑ دیا ہے اور نہ ہی تجھ سے ناراض ہوا ہے) اس آیت میں " ما قلیٰ "، " ما ابغض " کے معنی میں استعمال ہوا ہے.

حضرت زہراء (ع) بھی یہاں فرماتی ہیں کہ: " عائفۃ لدنیاکن " (تمہاری اس دنیا سے نفرت رکھتی ہوں) " قالیۃ لرجالکن " (تمہارے مردوں کا بغض میرے دل میں ہے).

۱۔ سورۃ الضحیٰ / ۳.

لوگوں کی بے وفائی کی ایک جھلک،

" لفظتہم بعد ان عجمتہم "

(میں نے ان کو دانتوں سے کاٹنے۔ آزمائش کرنے۔ کے بعد دور پھینک دیا ہے)

عربی میں "لفظ" منہ سے کسی چیز کے پھینکنے کو کہا جاتا ہے۔ جبکہ "عجم" یعنی دانت سے کاٹنا تاکہ کسی چیز کی سختی یا نرمی معلوم ہو جائے۔

یہاں قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ بزرگان کے کلمات میں ہمیشہ استعارہ (۱) اور تشبیہ پائی جاتی ہے. اگر ہم رسول خدا (ص) اور امیر المؤمنین (ع) کے کلمات کا بغور مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ ان بزرگوں نے استعارہ اور تشبیہ سے کافی زیادہ استفادہ فرمایا ہے. حضرت زہراء (ع) ان کلمات کو بستر شہادت پر فرما رہی ہیں، رحلت پیغمبر (ص) کے بعد کے قلیل عرصہ میں آپؑ نے لوگوں کو آزمایا تھا چاہے مسجد النبی (ص) میں خطبہ دیتے وقت یا دوسرے موقعوں پر اور آپؑ نے ان کو پہچان لیا تھا کہ ان کے اندر کس قدر ہمت و جرات اور شجاعت و مردانگی موجود ہے. اس طرح آپؑ ان کی بے وفائی اور بے مروتی کو اس کڑوے پھل سے تشبیہ دیتی ہیں کہ جسے انسان لاعلمی کے عالم میں جب منہ میں رکھتا ہے اور اسے سخت کڑوا پاتا ہے تو اسے منہ سے باہر نکال کر پھینک دیتا ہے. مدینہ کے مہاجر و انصار اس قدر بے وفا تھے کہ آپؑ کو ان پر صرف ذرا سا اعتماد ہی نہ تھا بلکہ آپؑ ان سے متنفر بھی تھیں.

" وشناتہم بعد ان سبرتہم "

(اور امتحان لینے کے بعد ان۔ آپ کے مردوں۔ سے نفرت کرتی ہوں)

"سبر" یعنی امتحان اور "شنا" یعنی نفرت، ناراضگی، دشمنی. یعنی جب سے میں نے تمہارے مردوں کو آزمایا اور یہ معلوم ہوا کہ وہ وفاداری اور مردانگی سے عاری ہیں اور تعیش پسند اور دنیا سے محبت رکھتے ہیں تو وہ مجھے برے معلوم ہوتے ہیں اور میں ان سے نفرت کرتی ہوں.

" فقبحاً لفلول الحد "

۱۔ استعارہ الفاظ کا وہ مجازی معنی ہے کہ جس میں ایک معمولی سی شباہت کی وجہ سے لفظ کو مجازی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

(کسی تیز چیز کا کند ہونا کس قدر برا ہے)

جس چیز کو تیز ہونا چاہیے جیسے تلوار اور چاقو وغیرہ، اگر کند ہوجائیں تو بہت بری بات ہے اور اسے دور پھینک دینا چاہیے، جس طرح تلوار کو تیز ہونا چاہیے اسی طرح ایک مرد سے شجاعت، مردانگی، ہمت، عزت اور حق سے دفاع کی توقع رکھی جاتی ہے. اب اگر یہ مرد جسے دلیر اور نڈر ہونا چاہیے تھا بزدل اور مفاد پرست بن جائے تو یہ بہت بڑی قباحت ہوگی. یہ لوگ۔ مہاجر وانصار۔ رسول خدا (ص) کے صحابی تھے اور انہوں نے صدر اسلام کی جنگوں میں جان نثاری کا مظاہرہ کیا تھا یہی لوگ آج محافظہ کار بن گئے ہیں اور ابن الوقت بن کر حکومت سے تعاون کر رہے ہیں اس لئے آپ فرماتی ہیں کہ:

"فقبحا" بہت قبیح ہے۔ "لفلول الحد" "فلول، فل" کی جمع ہے یعنی کندی، ممکن ہے مصدری معنی میں ہو۔ اور یہ معنی زیادہ مناسب ہے۔ "حد" اس چیز کو کہا جاتا ہے جو تیز ہو۔ "فلول الحد" یعنی کسی تیز چیز کا کند ہونا۔ پس اگر کوئی چیز تیز ہو اور بعد میں اس کی تیزی ختم ہوجائے اور کند ہوجائے تو یہ بری بات ہے.

مذھب اور سیاست کے کھلاڑی:

"واللعب بعد الجد"

(سنجیدگی کے بعد کھیل کس قدر قبیح ہے)

وہ شخص جو سنجیدہ تھا متین اور نڈر تھا، باطل کے مقابلے میں مقاومت کر کے ایثار وقربانی کا عادی تھا اب وہ اچانک اگر ایک سیاسی کھلاڑی بن جائے تو اس سے قبیح اور برا کچھ نہ ہو گا. لہذا حضرت فاطمہؑ یہ بتانا چاہتی ہیں کہ کسی زمانے میں آپ سنجیدہ اور دلیر تھے لیکن ابھی۔ میدان سیاست کے۔ کھلاڑی بن گئے ہو اور یہ بہت بری بات ہے. اگر ایک آدمی ابتداء سے ہی بزدل ہو، مجاہد نہ ہو تو ابھی اس سے کوئی توقع نہیں رکھی جاسکتی لیکن وہ افراد جو ابتدا میں انقلابی تھے اور حق کی حمایت کرتے تھے ان کو اب یہ زیب نہیں دیتا بلکہ بہت بری بات ہے کہ وہ بزدل بنیں. محافظہ کاری سے کام لیتے ہوئے سیاسی کھلاڑی بن جائیں اور جوڑ توڑ نیز سیاسی سودا بازی میں مشغول ہو کر۔ انسانی اور اسلامی۔ اقدار کی خرید.

وفروخت کردیں۔

"وقرع الصفاۃ"

(سنگ خارا پر۔ تلوار۔ مارنا کس قدر بھونڈی حرکت ہے)

"صفاۃ" صاف پتھر کو کہا جاتا ہے جیسے سنگ مرمر۔ اگر سنگ مرمر صاف ہو اور اس پر تلوار یا چھری ماری جائے تو اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ جیسے اصطلاح میں کہتے ہیں "پہاڑ کو مکا مارنا" جس طرح پہاڑ پر مکا اثر نہیں کرتا اور ایک بیہودہ فعل ہے اسی طرح سنگ خارا پر تلوار مارنا بھی بیہودہ فعل ہے جس کا کوئی اثر نہیں نکلتا۔

اس جملے کے بارے میں دو احتمال ہیں اور دونوں کو علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں ذکر فرمایا ہے:

۱۔ جملہ کا معنی یہ ہو کہ اگر تم۔ انصار۔ مل کر کام کرو تو بھی وہ بے اثر ہو گا بالکل ایسا ہے کہ سخت پتھر پر تلوار ماریں۔ یہ عمل نہ صرف بے ثمر اور بیہودہ ہے۔ بلکہ تمہارے نقصان میں بھی ہے، کیونکہ تلوار کی تیزی اور حدت ختم ہو جاتی ہے اور ممکن ہے تلوار ٹوٹ جائے۔ اور جہاں تلوار سے استفادہ کرنے کا موقع ہو وہاں تم تلوار سے استفادہ نہیں کرتے دراصل تم اپنی طاقت اور قدرت سے بے جا اور غلط استفادہ کر رہے ہو۔

۲۔ شاید اس فقرہ سے یہ مقصود ہو کہ تم اب اس قدر کمزور اور ناتواں ہو چکے ہو اور ذلت و پستی تک پہنچ چکے ہو کہ دشمن تمہاری ہر چیز کو پامال کر رہے ہیں۔ جب دشمن پہنچے گا تو تمہارے پاس موجود کسی سخت پتھر کے ایک ٹکڑہ کو بھی نہیں چھوڑے گا اسے بھی توڑ دے گا۔ یعنی دشمن تمام مؤثر اور فعال مقامات کو اپنے حملے کا نشانہ بناتا ہے اور حملے کی شدت اور کثرت سے غیر مؤثر مقامات بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ: "قرع الصفاۃ" کے اس فقرے کے معنی میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ تم خود سنگ خارا پر تلوار مار رہے ہو اور اپنی توانائی کو غلط اور بیہودہ مصرف کر رہے ہو۔ دوسرا احتمال یہ کہ تم اس قدر ذلیل اور پست ہو جاؤ گے کہ دشمن تمہاری ہر چیز کو نابود کر دے گا۔

فکری کمزوری اور آراء کا اختلاف:

" وصدع القنـــاۃ"

(کس قدر قبیح ہے نیزے کی انی کا ٹوٹ جانا)

نیزے کا کام یہ ہے کہ جنگ میں کام آئے، اگر نیزہ ٹوٹ جائے تو وہ بے ثمر ہو جاتا ہے. یہ کنایہ ہے اس بات کی طرف کہ تم۔ انصار و مہاجر۔ بھی ٹوٹے ہوئے نیزہ اور شمشیر شکستہ کی طرح اپنی خاصیت کھو چکے ہو.

" وختل۔خطل۔الآراء "

(اور نظریات اور آراء میں غلطی اور اشتباہ بھی۔ کتنی بری بات ہے۔)

تمہارے عقائد اور افکار بھی متحد نہیں ہر ایک اپنا مخصوص نظریہ رکھتا ہے تم پارٹی بازی میں مشغول ہو جس کے نتیجے میں تم غلطی اور اشتباہ میں پڑ جاتے ہو.

" وزلل الاھـوآء "

(کس قدر بری ہیں خواہشات کی لغزشیں)

یہ سب جملے " فقبحـاً لفلول الحدّ " پر عطف ہوئے ہیں. (یعنی کس قدر برا اور قبیح ہے، کسی تیز چیز کا کند ہونا :) " واللعب بعد الجدّ " (سنجیدگی کے بعد کھیل تماشا :) " وقرع الصفاۃ " (اور سنگ خارا پر۔ تلوار۔ مارنا :) " وصدع القناۃ " (اور نیزے کی انی پر شگاف پڑنا :) " وختل الآراء " (. نظریے میں غلطی اور اشتباہ نیز :) " وزلل الاھوآء " (خواہشات اور آرزوں میں لغزش) (۱).

" وبئس ما قدمت لھم انفسھم "

(۔ تمہارے مردوں نے۔ بہت ہی بری چیز کو اپنے لئے آمادہ کیا ہے)

۱۔ یہ تعبیرات استعارہ ہیں اور اس وقت کے مسلمانوں کی حالت زار کی نشاندہی کرتی ہیں کہ انحراف اور بگاڑ کے مقابلے میں ان کی تیزی اور کاٹ ختم ہو گئی تھی، سنجیدگی کے بجائے بے توجہی اور کھیل تماشا نیز بیہودگی کی طرف راغب ہو گئے تھے، اپنی توانائیوں کو بیہودہ کاموں میں صرف کر کے عسکری قوت میں شگاف پڑ چکا تھا، غلط نظریات پھل پھول رہے تھے، ارفع و اعلیٰ مقاصد کے بجائے پست مقاصد کی طرف رجحان بڑھ رہا تھا۔

درحقیقت حضرت زہراء(ع) خبردار کرنا چاہتی ہیں کہ جو کام تمہارے مرد کررہے ہیں اس کا انجام جہنم ہے۔ جو لوگ حق کا دفاع نہ کریں، مظلوم کی حمایت نہ کریں اپنے پیغمبر(ص) کی بیٹی کو تنہا چھوڑ دیں اور رسول خدا(ص) کی اتنی تاکید کے باوجود امیر المومنین(ع) سے بے اعتنائی برتیں تاکہ چند دن زندہ رہیں اور پیٹ بھریں، ان کا انجام جہنم ہے، اسی لئے آپؑ فرماتی ہیں کہ:

" ان سخط اللّٰہ علیہم وفی العذاب ہم خالدون "

(ان کا کردار اس بات کا باعث بنا کہ خدا ان پر غضب کرے اور جہنم کے عذاب میں ہمیشہ مبتلا رہیں)

حکومت کی بدعنوانی کے مقابلے میں عوام کی ذمہ داری:

" لاجرم لقد قلّدتہم ربقتـہا "

(اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ خلافت۔ یا فدک۔ کی ڈور کو خود ان کی گردن میں ڈال دوں)

اگر میں فدک یا خلافت کے مسئلے میں تمہارے پاس آئی تھی اور تم سے گفتگو کی تھی اور انصاف چاہتی تھی تو اب اس کو بھی میں نے چھوڑ دیا ہے اور میں نے اس کی ذمہ داری اور نتائج کو بھی غصب کرنے والوں یا تمہارے مردوں کے کندھوں پر رکھ دیا ہے۔ حکومت وقت کے کاموں میں سب شریک تھے اور سب ان کے پروپیگنڈوں سے متاثر اور ان کے ہمنوا تھے اسی لئے وہ سب حکومت وقت کے ساتھ گناہ میں شریک ہوں گے جیسا کہ حضرت علیؑ نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں کہ: " وانما الناسُ مع الملوک والدنیا الا من عصم اللّٰہ (۱) " (بے شک عوام بادشاہوں اور حکمرانوں کے تابع اور دنیا پرست ہوتے ہیں مگر یہ کہ خدا کسی کو محفوظ رکھے)۔ یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ صالح حکومت کے لئے جد وجہد کرنی چاہیے کیونکہ اگر ایک صالح حکومت برسر اقتدار آئے تو عوام بھی خیر ونیکی کی شاہراہ پر گامزن ہوں گے، لیکن اگر حکومت فاسد ہو تو عوام کو بگاڑ اور ہلاکت کی طرف لے چلیں گے، کیونکہ یہ فطری بات ہے کہ کسی فاسد معاشرے میں بہت ہی کم لوگ اپنی اصلاح کر پاتے ہیں اور عموماً لوگوں کے ایمان

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ / ۲۱۰۔

سست اور کمزور ہوتے ہیں. پس اگر ہم لوگوں کی خیر وفلاح کے خواہاں ہوں تو لازم ہے کہ معاشرے کو سالم اور نیک بنائیں اور ایسے اقدامات کئے جائیں کہ حکومت وقت ایک صالح حکومت بنے ورنہ اگر حکومت اور حکمران فاسد اور غیر صالح ہوں تو عوام بھی فاسد اور منحرف ہوجاتے ہیں اور پھر وہی ہوتا ہے جو حضرت علیؑ نے فرمایا تھا کہ: "لوگ عموماً حکمرانوں کے تابع اور دنیا کے دلدادہ ہوتے ہیں".

خلاصہ یہ کہ: اگر حکومت اور حکمران فاسد ہوں تو بھلائی اور دینداری کی سمت حرکت کرنے والے بہت ہی کم ہوتے ہیں بلکہ وہ اپنے حکمرانوں کی اطاعت اور پیروی کرتے ہیں.

حضرت زہراء (ع) کے دور میں بھی لوگوں کی اکثریت حکومت کے تابع اور ان کے ساتھ شریک جرم تھی، اسی لئے حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ:

"لاجرم" یعنی ناچار ہوں، کیونکہ تمہارے مرد، ڈرپوک، کمزور اور مفاد پرست نکلے ہیں اور انہوں نے حکومت وقت کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا ہے. "قلدتہم ربقتہا" تو اس کی باگ ڈور اور رسی کو میں نے انہی کی گردن میں ڈال دیا ہے. یعنی خلافت یا فدک کی باگ ڈور کو انہی کے حوالے کردیا ہے. "ربقہ" اس رسی کو کہا جاتا ہے جس سے جانوروں کو باندھ دیا جاتا ہے. پرانے زمانے میں جب مویشیوں کو ایک ہی رسی سے باندھتے تھے تو دو حیوانوں کے درمیان کوئی لکڑی کا ٹکڑا رسی میں کس دیتے تھے یا رسی پر گرہ لگاتے تھے. یعنی ایک لمبی رسی کو مختلف جگہوں سے گرہ لگاتے تھے اور دو گرہوں کے درمیانی حصے سے کسی جانور کی گردن باندھ دیتے تھے، اس طرح دو گرہ کے درمیانی حصے کو "ربقہ" کا نام دیتے تھے. اس کی جمع "ربق یا ربق" ہے. اس خطبہ میں "ربقہ" اگرچہ مفرد ہے لیکن جنس "ربقہ" مراد ہے اور جمع کے معنی میں استعمال ہوا ہے.

خلاصہ کلام یہ کہ: حضرت زہراء (ع) یہ فرماتی ہیں کہ: میں نے خلافت یا فدک کی باگ ڈور کو غاصبین اور تمہارے مردوں کی گردنوں میں ڈال دیا ہے تاکہ قیامت تک انحراف، خلافت اور غصب کئے ہوئے فدک کے جواب دہ رہیں. ہم اہل بیتؑ کے جو حقوق غصب ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں لوگوں پر جو ظلم وستم ہوئے ہیں ان کی ذمہ داری غصب کرنے والوں اور تمہارے مردوں پر عائد ہوتی ہے.

لہٰذا انہیں قیامت کے دن اس کا جواب دینا پڑے گا۔

"وحمّلتھم اوقتھا"

(اور اس کے سنگین بوجھ کو ان کے کاندھوں پر رکھ دیا ہے)

"اوق" یعنی سنگین اور وزنی بوجھ۔ "اوقتھا" میں جو "تاء" ہے وہ یا تو وحدت کی تاء ہے یا جنس[1] کی۔ بہر صورت معنی یہ ہے کہ، فدک یا خلافت کے غصب کے سنگین اور وزنی بوجھ کو میں نے ان کے حوالے کر دیا ہے۔ لہٰذا انہیں قیامت کے دن اس کا جواب دینا پڑے گا، چونکہ جو ہم سے ہو سکتا ہے ہم نے دین کی خاطر انجام دیا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت علیؑ، حضرت زہراءؑ کو لے کر مہاجرین اور انصار کے گھر گھر جاتے تھے اور ان پر اتمام حجت فرماتے تھے۔

حضرت زہراء(ع) یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ ہم نے اپنی طاقت کے مطابق کوشش کی ہے تاکہ خلافت اپنی شاہراہ سے منحرف نہ ہو لیکن ابھی تم خود راضی ہو اور خلافت کو اپنی راہ پر لگانے کے خلاف ہو تو اس کے نتائج اور انجام کی ذمہ داری بھی تم پر ہی عائد ہوتی ہے اور دنیا اور آخرت میں جو بھی مشکل اور بلاء اور اعتراض ہوگا وہ سب تم پر عائد ہوگا۔

"وشننت - سننت - علیھم غاراتھا"

(غصب خلافت کے مظالم اور مضرات کی ذمہ داری خود ان پر عائد کرتی ہوں)

اگر اصل خطبہ میں "شننت" ہو تو معنی یہ ہوگا کہ میں نے چھڑکا۔ اگر "سننت" ہو تو میں نے پانی گرایا۔ البتہ یہاں دونوں عبارتوں کے ساتھ معنی صحیح ہے۔ "شنّ" پانی چھڑکنا اور "سنّ" یعنی آہستہ آہستہ پانی کا گرانا۔ قرآن میں "ماء مسنون" جو آیا ہے وہ بھی گرائے گئے پانی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس فقرے میں حضرت زہراء(ع) فرماتی ہیں کہ: "میں نے غصب خلافت کی غارتگری کے سیلاب کا رخ خود ان کی طرف موڑ دیا"۔

۱۔ "تاء" مفرد ایک عدد پر اور "تاء" جنس اصل معنی پر دلالت کرتی ہے اور اس میں کمیت کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔

جب کسی ملک پر دشمن حملہ آور ہوتا ہے تو اس ملک کی ہر چیز غارتگری کا نشانہ بنتی ہے اور وہ اس ملک کو تہس نہس کردیتا ہے. بالکل اسی طرح اس وقت کے مسلمانوں نے بھی ایسا ہی کیا کہ خلافت کی راہ کو بدل دیا جس کے نتیجے میں دشمن کے تسلط اور قتل وغارتگری کا دروازہ کھل گیا۔ نہ صرف یہی بلکہ اس وقت بھی قتل وغارتگری کا بازار گرم تھا نیز آنحضرت (ص) کے دور کی تمام انسانی اور الٰہی اقدار کو جاہلی تعصب کے ہاتھوں تباہ وبرباد کردیا گیا تھا۔ لہٰذا ان تمام مفاسد اور مظالم کی ذمہ داری خود ان کے کاندھوں پر عائد ہوتی ہے (۱).

" فجدعاً وعقراً وبعداً للقوم الظالمين "

(پس اس ظالم قوم پر ہلاکت، نابودی اور زخم ہو اور رحمت خدا سے دور ہو)

" جدع " یعنی مثلہ کرنا، جس شخص کے، ناک، کان، ہونٹ کاٹ دیئے گئے ہوں تو کہتے ہیں کہ "جدعہ" یعنی اسے مثلہ کیا گیا ہے اور دراصل یہ اس شخص کے لئے ایک قسم کی شکست اور ہلاکت ہے. بنابریں " جدع " کنایہ ہے ہلاکت اور نابودی سے. " عقراً " یعنی مقابل کو زخمی کرنا. پہلے پہل یہ گھوڑے کو زخمی کرنے کے معنی میں استعمال ہوا پھر آہستہ آہستہ ہر جاندار پر لگائے جانے والے۔ مہلک۔ زخم کو "عقر" کہا جانے لگا. پس " عقراً " یعنی مہلک زخم لگانا. " بعداً للقوم الظالمین " یعنی ظالم گروہ۔ رحمت خداوندی سے۔ دور رہے۔ یہ تینوں کلمات یہاں بددعا کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔.

شاہراہ امامت سے انحراف کا آغاز:

" ويحهم! انى زعزعوها عن رواسى الرسالة ؟ "

(وائے ہو ان پر! رسالت کے مضبوط و مستحکم مقام سے خلافت کو ہٹا کر کہاں لے گئے ؟!)

ان پر دلسوزی اور شفقت کی وجہ سے آپؑ نے یہاں پر " ویلہم " کے بجائے " ویحہم " فرمایا ہے. جب

۱۔ تاریخ بھی صراحت کے ساتھ یہ گواہی دیتی ہے کہ امامت وخلافت کو اپنے اصلی راستے سے منحرف کرنے کی وجہ سے کس قدر مفاسد پیدا ہوئے اور خون کے بازار گرم رہے. دراصل آج تک مسلمانوں کی بدبختی، بے چارگی اور تمام مصائب ومشکلات کی جڑ، امامت کے مسئلہ میں انحراف ہی ہے.

کسی کی حالت زار کو دیکھ کر دلسوزی کرنا مقصود ہو تو "ویحہ" کہا جاتا ہے جبکہ غیظ و غضب اور لعنت کرنا مقصود ہو تو "ویل" کا لفظ بولا جاتا ہے۔

"انیٰ زعزعوھا" یہ لوگ خلافت کو اڑا کر کہاں لے گئے اور اسے کس راستے پر لگا دیا ہے(۱)۔" عن رواسی الرسالۃ" یعنی رسالت و نبوت کے ثابت و استوار مقام اور چٹانوں سے۔"جبال الرواسی" کے معنی بھی ثابت اور استوار پہاڑوں کے ہیں۔ حضرت زہراء(ع) کے۔ اس جملہ کا معنی یہ ہے کہ خلافت کو علم و تقویٰ اور وحی کے ساتھ رابطے کے ذریعے ثابت اور مستحکم مقام سے ہٹا دیا ہے اور اسے ایک غلط اور باطل راستے پر لگا دیا ہے۔

رسالت کی طرف "رواسی" کی نسبت کی وجہ یہ ہے کہ در اصل امامت، رسالت کے لئے ایک قوی، مستحکم چھاؤنی اور مورچہ ہے۔ جہاں سے رسالت کے مقاصد کی پاسبانی کی جاتی ہے۔ پس اگر امامت اپنے اصلی مقام اور رتبہ سے گر جائے اور علیؑ جیسی عظیم الٰہی شخصیت کے ہوتے ہوئے ابو بکر، عمر اور عثمان جیسے افراد امام المسلمین کہلائیں تو در اصل یہ رسالت پر ایک کاری ضرب ہے اور یہ دین کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کے مترادف ہے۔

" وقواعد النبوۃ والدلالۃ "

(اور نبوت اور قیادت کی بنیادوں اور اصولوں سے۔ امامت کو جدا کر کے کس سمت لے گئے؟۔)

"قواعد، قاعدۃ" کی جمع ہے اور "قاعدۃ" بنیاد اور اصول کو کہتے ہیں جبکہ "دلالہ" راہنمائی۔ اور قیادت کے معنی میں ہے۔ یعنی خلافت سے مربوط نبوت اور قیادت کی بنیادوں اور اصولوں میں تحریف کی ہے (۲)۔

۱۔ "زعزعوھا" میں ضمیر خلافت کی جانب پلٹتی ہے اور یہ قرینہ ہے اس بات پر کہ اس سے پہلے والی عبارت، یعنی لقد قلد تم ربقتھا" میں بھی "ھاء" سے خلافت ہی مراد ہو۔

۲۔ اسلام کی فتح اور اسلامی حکومت کی تشکیل میں حضرت علیؑ کا جو کردار رہا ہے اس کی بنا پر آپؑ اسلامی حکومت کی ایک مضبوط اور مستحکم بنیاد کی حیثیت رکھتے تھے اور صرف آپؑ کی ذات گرامی ہی تھی جو نبوت کے اہداف اور پیغمبرؐ کے مشن کو آگے بڑھا سکی تھی، کیونکہ علم و تقویٰ، معنوی فضائل اور روحانی کمالات کے لحاظ سے رحمۃ للعالمینؐ کے بعد آپؑ کا درجہ تھا۔ نہ کہ دوسرے لوگ جو علم و تقویٰ وغیرہ میں رسول خداؐ کے ساتھ کسی قسم کی شباہت بھی نہیں رکھتے تھے۔

"ومہبط الروح الامین"

(اور جبرئیل امین کے نازل ہونے کے مقام سے)

اگرچہ حضرت علیؑ پر وحی نہیں ہوتی تھی لیکن جس ہستی پر وحی نازل ہوتی تھی وہ رسول خدا(ص) تھے اور رسول خدا(ص) سے سب سے زیادہ نزدیک حضرت علیؑ ہی تھے اور رسول خدا(ص) پر نازل ہونے والی تعلیمات اور خدا کے فرامین کو حضرت علیؑ بغیر کسی واسطہ کے ختمی مرتبت(ص) سے اخذ فرماتے تھے۔

"والطبین بامور الدنیا والدین"

(اور۔اس شخص سے خلافت چھینی گئی۔جو دنیوی اور دینی امور میں مکمل مہارت رکھتا تھا)

"طبین" یعنی تجربہ کار اور ماہر کامل۔امیر المؤمنینؑ حاذق ہیں اور دنیوی و دینی امور کے مکمل ماہر، لیکن ان لوگوں نے خلافت کو آپؑ سے چھینا اور اس کی راہ کو منحرف کر دیا اور خلافت کی باگ ڈور ایسے افراد کے ہاتھوں میں دے دی جو دینی اور سیاسی امور میں آگاہی نہیں رکھتے تھے۔

شاید اس کلام میں دنیوی امور سے، معاشرے کے سیاسی اور معاشرتی مسائل اور لوگوں کے اجتماعی امور مراد ہوں اور دینی امور سے مراد یہ ہو کہ شریعت کے احکام بیان کریں، انہیں تحریف، بدعت اور تغییر سے بچائیں اور لوگوں کو ایمان، فلاح اور سیدھے راستہ جانب ہدایت کریں۔

"الا ذلک ھو الخسران المبین"

(آگاہ رہو! جو کام ان لوگوں نے کیا وہ بے شک آشکار اور بہت عظیم خسارت ہے)

یعنی یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں بلکہ، خشت اول چوں نہد معمار کج   تاثریا می رود دیوار کج

سقیفہ میں پانچ آدمیوں نے ابوبکر کو خلیفہ مقرر کیا(۱) اور یہ لوگ خاموش رہے۔بعد میں ڈرانے

۱۔آیت اللہ شہید صدرؒ اپنی فدک نامی کتاب کے صفحہ ۶۳ میں سقیفہ میں بغاوت کی بنیاد، ابوبکر، عمر اور ابوعبیدہ جراح کی سہ نفرہ سیاسی پارٹی کو قرار دیتے ہیں اور پیغمبر اکرمؐ کے بعد رونما ہونے والے بہت سے حادثات اور سیاسی سرگرمیوں اور مسائل کی بنیاد اور جڑ اسی سیاسی پارٹی کو قرار دیتے ہوئے ص ۵۸ پر لکھتے ہیں کہ اس پارٹی نے مملکت کے اہم کلیدی عہدوں کو اپنے اصلی ارکان کے درمیان تقسیم کر لیا تھا اس طرح ابوبکر کے حصے میں قیادت و خلافت، عمر کے حصے میں عدالتی نظام اور مالی امور ابوعبیدہ کے حصے میں آئے تھے!!۔

دھمکانے کے ذریعے اور خوف وہراس پھیلا کر غلط پروپیگنڈوں اور افواہوں کے ذریعے لوگوں سے بیعت لی اس طرح پیغمبر (ع) کی جانشینی کو اس کے صحیح حقدار سے چھین لیا. یہ سب اس بات کا باعث بنا کہ خلافت ہمیشہ کے لئے غلط راہ پر لگ جائے اور اسلام کو مسخ کیا جائے. اسی لئے وہ لوگ جو اس دن خاموش تماشائی بنے رہے، بعد میں ہونے والے ہر ظلم وجنایت میں شریک جرم بن گئے اور یہ خود ایک خسران مبین ہے.

اصحاب سقیفہ کے سیاسی مقاصد:

" وما الذی نقموا من ابی الحسن علیہ السلام؟"

(وہ کونسا سبب تھا کہ جس کی وجہ سے ان لوگوں نے ابی الحسن - علیؑ - کے خلاف انتقامی کاروائی کی؟)

امیر المؤمنینؑ کے ساتھ ان کی کونسی دشمنی اور عداوت تھی سوائے اس کے کہ حضرت علیؑ شجاع تھے، بے باک اور نڈر تھے، جنگی محاذوں پر حق کا دفاع فرماتے تھے اور اسلام کی حمایت اور محافظت کرتے تھے. البتہ یہ ان کی مجبوری تھی کہ وہ مسند حکومت پر کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھ سکتے تھے جو حق کی خاطر جان کی بازی لگانے پر آمادہ ہو - اور اس بارے میں کسی قیمت پر سودا بازی اور سہل انگاری کے لئے آمادہ نہ ہو..

(۱)" ونقموا واللّٰہ منہ نکیر سیفہ"

(خدا کی قسم اس سے اس کی باطل شکن تلوار کا انتقام لیا ہے)

یعنی، یہ لوگ ناراض تھے، لہذا وہ آپؑ سے انتقام لینے کے در پے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ امیر المؤمنینؑ ہمیشہ برائیوں اور مفاسد کا مقابلہ کرتے تھے، وہ سیاسی سودا بازی کے قائل نہ تھے بلکہ اپنی شرعی ذمہ داری کے پابند تھے اور صرف خداوند متعال کی حرمت اور دینی والٰہی اقدار کی پاسداری کو مدنظر رکھتے تھے. اگر حضرت علیؑ کچھ سیاسی کھیل کھیلتے تو وہ حکومت پر قابض ہوتے اور اس کے دشمن ناکام ہوجاتے لیکن یہ قیمت ضرور ادا کرنی پڑتی تھی کہ دینی اقدار سے بے رخی برتی جائے، حالانکہ

آپؑ اس کے لئے تیار نہ تھے کہ حکومت حاصل کرنے کی خاطر غیر شائستہ طریقہ کار اپنایا جائے۔
"نکیر" کو غالباً انکار کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ یعنی آپؑ اجتماعی برائیوں اور باطل کو اپنی تلوار کے ذریعے روکتے تھے۔

(۲) "وقلۃ مبالاتہ لحتفہ"

(۔انتقامجوئی کی ایک علت یہ تھی کہ۔ وہ اپنی موت سے بے باک اور نڈر تھے)

امیر المؤمنینؑ ایک دلیر انسان تھے۔ آپؑ کو موت کا کوئی ڈر نہ تھا البتہ اگر انسان موت سے ڈرے تو وہ نہ جنگ کر سکتا ہے اور نہ حق کی حمایت، اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ، باطل کے خلاف حضرت علیؑ نے جہاد کیا اور طاغوت کے ساتھ جنگ کی تو یہ اس لئے تھا کہ وہ موت سے خوفزدہ نہیں تھے آپؑ خود فرماتے ہیں کہ: "واللہ لابن ابی طالب آنس بالموت من الطفل بثدی امہ" (خدا کی قسم! ماں کے سینے سے بچے کے انس اور محبت سے ابوطالب کے بیٹے کو موت سے زیادہ عشق و محبت ہے)۔

(۳) "وشدۃ وطاتہ"

(اور باطل کو اپنے طاقتور قدموں سے سختی کے ساتھ پامال کرنے کی وجہ سے)

"وطا" پامال کرنے کو کہا جاتا ہے۔ یعنی حضرت علیؑ، باطل پرست کفار و منافقین کو اپنے قدموں تلے روند دیتے تھے۔ جب باطل کے چہرے پر قدم رکھنا چاہتے تھے تو بڑی قوت اور سختی سے رکھتے اور فیصلہ کن طریقے سے میدان میں جاتے تھے۔

یہ سب کنایہ ہے اس بات کی طرف کہ امیر المؤمنینؑ دینی اور سیاسی امور کے بارے میں، صراحت، ثابت قدمی اور پختگی رکھتے تھے، چاہے وہ دشمن کے خلاف عسکری مقابلہ ہو یا مختلف سیاسی و معاشرتی گروہوں کے ساتھ آپؑ کا سلوک۔

(۴) "ونکال وقعتہ"

(اس وجہ سے کہ۔ جنگ اور مبارزہ میں۔ آپؑ دشمن کو سخت اور شدید نتائج سے دوچار کرتے تھے)

"وقعہ" جنگ اور دشمن پر حملہ آور ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جبکہ "نکال" کا معنی ہے۔

عذاب اور سزا۔ مقصد یہ ہے کہ اوائل اسلام کی جنگوں میں کفار کے مقابلے میں آپؑ ڈٹ جاتے تھے۔ اور ان کو دردناک سزا دیتے تھے۔ یعنی میدان جنگ میں نہایت ہی پختہ انداز میں کفار سے جنگ کرتے اور ان کا قلع قمع کردیتے تھے۔

(۵) " وتنمّر ۃ فی ذات اللّٰہ "

(اور راہ خدا میں شیر کی طرح اس کی ناقابل تسخیر شجاعت اور دلیری کی وجہ سے)

" تنمر، نمر " سے مشتق ہے اور " نمر " شیر کو کہا جاتا ہے۔ شیر کبھی بھی دشمن کے سامنے تسلیم نہیں ہوتا اور بحرانی حالت میں بھی۔ وہ اپنی دلیری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اگر کسی انسان کے بارے میں کہا جائے کہ " تنمّر فلان " تو اس کا معنی یہ ہے کہ وہ شیر کی طرح دلیر ہے اور دشمن کے سامنے تسلیم نہیں ہوتا اور دشمن کے خلاف اس کا غیظ و غضب بدستور باقی ہے۔

" فی ذات اللہ " سے یہاں خدا، دین اسلام اور اس کی راہ اور مقصد مراد ہیں۔

حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ امیرالمؤمنین (ع) کو صرف اس لئے انتقام کا نشانہ بنایا گیا کہ دشمن کے مقابلے میں ایک شیر کی مانند ڈٹ جاتا تھا، کیونکہ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا مطلب ایمان کی کمزوری ہے یا دنیا اور اس کی رنگینیوں سے وابستگی اور عشق یا موت سے خوف، حالانکہ حضرت امیر المؤمنینؑ ان چیزوں سے پاک اور منزہ تھے۔

آپ (ع) کے کلام کے بقیہ حصے کو انشاء اللہ ہم اگلے درس میں بیان کریں گے۔

وصلی اللّٰہ علیٰ محمد وآل محمد (ص)

چودھواں درس:

- گزشته درس کا خلاصه
- حضرت علی (ع) کی برحق حکومت کی چند خصوصیات
- عوام کے لئے حکومت کے چند مفید پروگرام
- بیت المال مسلمین اور حکومت
- اقتدار کے بھوکے اور خدمت کے شیدائی
- ظلم اور کفران نعمت
- اصحاب سقیفه کی پھر مذمت
- سقیفه کی کاروائی کی ایک جھلک
- مستقبل کے انحرافات کی پیش گوئی
- سقیفه کے بعد لوگوں کی بدحالی کی پیش گوئی
- سقیفه کے بعد رونما ہونے والے فتنوں کی خبر
- انصار ومہاجرین کی حضرت زہراء (ع) سے عذر خواہی

وَ تَااللهِ لَوْمالُوا عَنِ المَحجَّة اللاَّيِحَة، وَ زالوا عَنْ قَبُولِ الحُجَّةِ الوَاضِحَة، لَرَدَّهُمْ إليها، وَ حَمَلَهُم عليها، وَ لَسارَ بِهِمْ سَيْراً سجحاً، لايكلمُ خِشاشه و لايكلّ سائره و لايملّ راكبه؛ وَ لَأَوْرَدَهُم منْهلاً نميراً صافياً رويّاً، تطفح ضفّتاهُ و لايترنّق جانِباهُ، وَ لَأَصْدَرَهُمْ بطاناً، وَ نَصَحَ لَهُمْ سرّاً و إعلاناً، وَ لَمْ يَكُنْ يَتحلّى مِنَ الغِنى بِطائلٍ، وَ لايحظى مِن الدنيا بِنائلٍ، غَيْرَ رَىِّ النّاهِلِ وَ شَبْعَة الكافِلِ؛ وَ لَبانَ لَهُمُ الزّاهِد مِنَ الرّاغب، وَ الصّادِقُ مِنَ الكاذِب؛ وَ لو أَنَّ أَهْلَ القُرىٰ آمَنُوا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنا عَلَيْهِم بَرَكاتٍ مِنَ السَّماءِ و الأَرْضِ، وَلٰكِنْ كَذَّبُوا فَأَخَذْناهُمْ بِما كانُوا يَكْسِبُونَ؛ وَ الّذينَ ظَلَمُوا مِنْ هٰؤُلاءِ سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئات ماكَسَبُوا وَ ما هم بِمُعْجِزِينَ.

أَلا هَلُمَّ فَاسْتَمِعْ! وَ ما عِشْتَ أَراكَ الدَّهْر عجباً!! وَ إِنْ تَعجبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهم! لَيْتَ شِعْرى إِلىٰ أَىِّ سِنادٍ إِسْتَنَدُوا؟! وَ إِلى أَىِّ عِمادٍ اعْتَمَدُوا؟! وَ بِأَيَّةِ عُرْوَةٍ تَمَسَّكُوا؟ وَ عَلى أَيَّةِ ذُرِّيَّةٍ أَقْدَمُوا وَ احْتَنَكُوا؟! لَبِئْسَ الْمَوْلىٰ و لَبِئْسَ العَشيرُ، وَ بِئْسَ لِلظّالِمينَ بَدَلاً، إِسْتَبْدَلُوا وَاللهِ الذّنابى بِالقَوادِمِ، وَ العجزَ بِالكاهِلِ؛ فَرَغْماً لِمَعاطِسِ قَوْمٍ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعاً، أَلا إِنَّهُمْ هُمُ المُفْسِدُونَ وَلٰكِنْ لايَشْعُرُونَ.

وَيْحَهُمْ أَفَمَنْ يَهْدى إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ، أَمْ مَنْ لايَهِدّى إِلّا أَنْ يُهْدىٰ، فَما لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ؟! أَما لَعَمْرى لَقَدْ لَقِحَتْ، فَنظرة رَيْثَما تنتج، ثُمَّ احْتَلِبُوا مِلْءَ القَعب دَماً عَبيطاً و ذعافاً مبيداً، هُنالِكَ يَخْسَرُ المُبْطِلُونَ، وَ يَعْرِف التّالُون غِبَّ ما أَسَّسَ الأَوَّلُونَ، ثُمَّ طيبُوا عَنْ دُنْياكُم أَنْفساً، و اطْمَئِنُّوا لِلْفِتْنَة جأشاً، وَ أَبْشِرُوا بِسَيْفٍ صارِمٍ، وَ سطْوةِ مُعْتَدٍ غاشِمٍ، وَ بهرج شامِلٍ، و اسْتِبْدادِ مِنَ الظّالِمينَ، يدع فَيْئَكُمْ زهيداً، و جمعكُمْ حَصيداً؛ فَيا حَسْرَةً لَكُم! وَ أَنى بِكُمْ، وَ قَدْ عَمِيَتْ عَلَيْكُمْ، أَنُلْزِمُكُمُوها وَ أَنْتُم لَها كارِهُونَ.

قال سويد بن غفلة: فَأَعادَتِ النِّساء قَوْلَهاؑ عَلى رِجالِهِنَّ، فجاء إِلَيْها قَوْمٌ مِنْ وُجُوهِ المُهاجِرينَ وَ الأَنْصار مُعْتَذِرينَ، وَ قالوا: يا سَيِّدَةَ النِّساء، لَوْ كانَ أبوالحَسَن ذكر لَنا هٰذَا الأَمْر قَبْلَ أَنْ نبرم العَهد، وَ نحْكُمَ العَقْد، لَما عَدَلْنا عَنْهُ إِلىٰ غَيْرِه.

فَقالَتْؑ: إِلَيْكُم عَنّى، فَلاعُذْرَ بَعْدَ تَعْذيرِكُمْ، وَ لا أَمْرَ بَعْدَ تَقْصيرِكُمْ.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبہ نستعین

گزشتہ درس کا خلاصہ:

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے کہ یہ حضرت زہراء(ع) کا دوسرا خطبہ ہے جو آپؑ نے اپنے گھر میں انصار اور مہاجرین کی ان عورتوں سے خطاب فرمایا تھا کہ جو آپؑ کی عیادت کے لئے آئیں تھیں.

گزشتہ درس میں عرض کیا کہ حضرت زہراء(ع)، انصار و مہاجرین پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ: امیر المؤمنینؑ پر ان کا کیا اعتراض تھا؟ آپؑ کے ساتھ کیوں دشمنی کی؟ میدان جنگ میں آپؑ کی شجاعت و شہامت، خدا کی خوشنودی کی راہ میں آپؑ کی بے باکی اور ایثار و قربانی کے سواہ کوئی اور سبب تھا کہ جس کی وجہ سے آپؑ کو خلافت سے دور کر دیا گیا ہے؟ کیونکہ کبھی انسان کی خوبیاں بھی اس بات کا سبب بنتی ہیں کہ دوسرے لوگ اس کو معاشرے سے دور رکھنے کی کوشش کریں. کہا جاتا ہے کہ: مور کا دشمن خود اس کا پر ہے!.

حضرت علی(ع) کی بر حق حکومت کی چند خصوصیات:

خطبے کو جاری رکھتے ہوئے آپؑ فرماتی ہیں کہ:

" تاللّٰہ لو مالوا عن المحجۃ اللایحۃ وزالوا عن قبول الحجۃ الواضحۃ "

(خدا کی قسم۔ اگر حضرت علیؑ خلافت پر پہنچ جاتے تو۔
لوگ حق کے روشن راستے اور خدا کے واضح دلائل سے روگردانی کرتے)

۔ اگر حضرت علیؑ کو خلافت مل جاتی اور لوگوں کی یہ حالت ہوتی تو آپؑ لوگوں کو اسی حالت پر نہ چھوڑتے بلکہ۔

(۱)" لردھم الیہا وحملہم علیہا"

(بے شک آپؑ ان کو حق کی واضح شاہراہ اور آشکار دلائل کی طرف پلٹا دیتے اور اس کے مطابق چلنے پر آمادہ کرتے)

یعنی، اگر اقتدار اور خلافت آپؑ کو مل جاتے تو لوگوں کے انحراف اور حق اور الٰہی اقدار کے مقابلے میں ان کی بے اعتنائی کو برداشت نہ کرتے بلکہ ان کو حق و حقیقت اور صراط مستقیم کی طرف ہدایت فرماتے (۱)۔

(۲)" ولسار بہم سیراً سجحاً"

(اور آپؑ لوگوں کو انتہائی نرمی اور عطوفت کے ساتھ۔ حق پر۔ گامزن فرماتے)

"سجح" نرمی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ آپؑ، لوگوں کو سختی اور بداخلاقی کے ذریعے نہیں بلکہ نرمی اور عطوفت کے ذریعے ہدایت فرماتے تھے۔ حالانکہ ابوبکر اور عمر خشونت اور سختی کے ذریعے اقتدار کی کرسی پر قابض ہوئے تھے۔ حضرت فاطمہؑ فرماتی ہیں کہ: اگر خلافت اور اقتدار حضرت علیؑ کے ہاتھوں آجاتے تو لوگوں کو انحراف و کجروی سے دور رکھتے اور ان کو خدا کے روشن دلائل کی طرف راہنمائی فرماتے اور اس راہ میں کسی قسم کی سختی اور خشونت سے کام نہ لیتے، کیونکہ سختی اور طاقت کے بل بوتے

۱۔ شاید حضرت زہراءؑ کا مقصود یہ نکتہ بھی ہو کہ امیرالمؤمنینؑ حکومت کو الٰہی مقاصد تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھتے تھے اور خود حکومت کے لئے آپؑ کسی قیمت کے قائل نہ تھے یعنی آپؑ جاہ طلب اور اقتدار کے عاشق نہ تھے بلکہ، حق وعدالت اور دین کے اہداف ومقاصد نیز اسلامی اقدار کو عملی جامہ پہنانے کے خواہاں تھے اسی لئے ابن عباس سے فرماتے ہیں کہ: "تم پر حکومت کرنے کے مقابلے میں میرے نزدیک یہ پھٹا ہوا جوتا زیادہ قیمت رکھتا ہے مگر یہ کہ حکومت کے ذریعے حق کو قائم اور باطل کو ختم کرسکوں۔" اسی نظریے کے تحت آپؑ نے اسلام اور حق وعدالت کو اپنی حکومت اور اقتدار پر قربان نہیں کیا بلکہ خود کو ان پر قربان کردیا تاکہ اگرچہ آپؑ بحسب ظاہر خلافت اور اقتدار سے محروم ہوگئے لیکن الٰہی اقدار اور دین کی روح کمزور اور اس کا خاتمہ نہ ہوجائے۔

لوگوں کو ہدایت نہیں کی جاسکتی، بلکہ ضروری ہے کہ انسان، ایمان اور عقیدت کے سائے میں حق وعدالت کی ہدایت پائے۔

(۳) " ولا یکلم خشاشہ "

(اور لوگوں کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا تھا)

جیسا کہ پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ بزرگوں کے کلام میں وسیع پیمانے پر تشبیہہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہاں بھی آپؑ نے تشبیہہ دی ہے۔۔ یہاں آپؑ نے عوام کو اونٹ سے اور امامؑ کو اونٹ کے مالک سے تشبیہہ دی ہے۔ اس دور میں اونٹ عربوں کا بہت ہی اہم سرمایہ تھے۔ اس لئے اکثر مثالیں اور تشبیہات بھی اسی سے مربوط ہیں۔۔

" خشاش " لکڑی کی اس نکیل کا نام ہے جسے اونٹ کے ناک میں سوراخ کرکے ڈالا کرتے تھے اور رسی کو اس نکیل سے باندھ کر کھینچتے تھے۔ اگر کوئی شخص سختی سے اسے کھینچتا تو اونٹ کا ناک زخمی ہوجاتا تھا جبکہ آرام اور نرمی سے کھینچنے پر اونٹ آرام سے مقصد کی طرف چل پڑتا اور اس کا ناک بھی زخمی نہیں ہوتا تھا۔ یہ تشبیہہ آپؑ نے مطلب کو سمجھانے کے لئے دی ہے۔ یعنی جو شخص دوسرے لوگوں کی ہدایت اور قیادت کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ آرام اور نرمی کے ساتھ ہدایت کے عمل کو اس طرح انجام دے کہ لوگوں پر دباؤ اور صدمہ نہ پڑے۔ اسی لئے آپؑ فرماتی ہیں کہ: " سیراً سجحاً لا یکلم خشاشہ " کنایہ ہے اس بات سے کہ لوگوں کو اس طرح آرام اور نرمی وشفقت سے راہ حق پر لے کر چلتے کہ وہ زخمی نہ ہوجائیں۔

(۴) " ولا یکلّ سائرہ "

(اور اس سے سیر کرنے والا نہیں تھکتا تھا)

اگر کسی سواری کو تیز چلایا جائے تو اس کا سوار یقیناً تھک جاتا ہے لیکن اگر آرام اور آہستہ چلائے تو نہیں تھکے گا اور اپنی منزل تک وہ آرام سے سفر کرے گا۔

(۵) " ولا یملّ راکبہ "

(اور اس اونٹ جو سوار ہو رہ تھک سکتا نہیں تھا)

یہ سب تشبیہات ہیں. مقصد یہ ہے کہ اگر (ع) معاشرے کی قیادت امیر المؤمنینؑ کے ہاتھ میں ہوتی تو انسانیت کا یہ کاروان نرمی اور سکون کے ساتھ حرکت کرتا. اس میں خشونت اور سختی نہ ہوتی کیونکہ جبر وتشدد کے نتیجہ میں لوگ تھک جاتے ہیں، حکمرانوں سے تنگ آجاتے ہیں اور حکومت ومعاشرے کو درپیش مشکلات میں بے توجہی سے کام لیتے ہیں جس کے نتیجے میں حکومت اور ملت کا رابطہ دن بدن کمزور ہو جاتا ہے.

عوام کے لئے حکومت کے چند مفید پروگرام:

(۶) " ولاوردھم منھلاً نمیراً صافیاً رویاً "

(اور بے شک آپؑ لوگوں کو ایسے صاف وشفاف اور گوارا چشمہ تک لے جاتے جہاں سے وہ پیٹ بھر کر پانی پیتے)

اگر کسی پیاسے قافلے کو پانی کے گھاٹ تک کوئی راہنمائی کرنا چاہے تو ممکن ہے وہ انہیں صاف وشفاف اور گوارا چشمے تک لے جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی گندے تالاب تک لے جائے. یہاں حضرت زہراء (ع) تشبیہہ سے کام لیتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ اگر قیادت حضرت علیؑ کے ہاتھ میں ہوتی تو آپؑ مسلمانوں کو۔ زندگی کے۔ صاف وشفاف اور گوارا چشمے تک لے جاتے اور سیراب کرتے.

" منہل " یعنی، چشمہ اور ندی سے پانی لینے کی جگہ. " نمیر اور نمر " یعنی صاف ستھرا اور مفید پانی. البتہ بعض نے کہا ہے کہ " نمر " صاف اور گوارا پانی کو اور " نمیر " مفید پانی کو کہا جاتا ہے، کیونکہ ممکن ہے کبھی ایک چیز بہت خوشگوار ہو اور انسان کا جی چاہے کہ اس سے استفادہ کرے لیکن وہ مضر اور نقصان دہ ہو جبکہ بعض چیزیں ایسی ہوں کہ جن سے آپ خوش نہ ہوں لیکن آپ کے لئے مفید ہوں.

بہر صورت حضرت فاطمہؑ فرماتی ہیں کہ: اگر امیر المؤمنینؑ حاکم بنتے تو تمہیں ایک ایسے چشمے پر لے جاتے جو " صافیاً " صاف وستھرا ہو، " رویاً " اور تمہیں سیراب کردے. یہاں پر حضرت علی (ع) کے پروگراموں کو گوارا، صاف اور مفید پانی سے تعبیر کیا گیا ہے؛

" تطفح ضفتاہ ولا یترنق جانباہ "

(اس کے دو کنارے پانی سے بھرے ہوئے ہیں اور اس کے اطراف میں گندگی نہیں ہے)

اگر آپ کسی نہر یا ندی پر جائیں تو دیکھیں گے کہ اس کے کنارے پر بدبودار پانی ٹھہرا ہوا ہے اور اطراف میں کوڑا کرکٹ اور گندگی کا ڈھیر لگا ہوا ہے وہاں سے اگر آپ پانی لینا چاہیں تو گندگی کی آمیزش کی وجہ سے آپ پانی نہیں لے سکتے۔

حضرت زہراء(ع) فرماتی ہیں کہ: اگر خلافت حضرت علیؑ کے حوالے کر دیتے تو وہ تمہیں ایسے چشمہ حیات پر لے جاتے کہ جس کا پانی صاف وشفاف اور مفید ہوتا اور اس کے کنارے بھی گندے پانی اور دوسری آلودگیوں سے پاک وصاف ہوتے۔

" تطفح ضفتاہ "اس کے دو کنارے پانی سے بھرے ہوئے ہوتے۔" ولا یترنق جانباہ "اور اس کے دونوں اطراف آلودگی سے پاک ہوتے۔

جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یہ تمام تعبیریں تشبیہات ہیں گویا آپؑ کسی معاشرے کی ہدایت اور قیادت کو پیاسے اونٹوں کے ایک ریوڑ سے تشبیہ دیتی ہیں کہ جسے کسی چشمے یا نہر کی طرف لے جا رہے ہوں تاکہ وہاں سے یہ اونٹ اپنی پیاس بجھا سکیں۔ اور یہ شتربان کی لیاقت اور آگاہی پر منحصر ہے کہ وہ اونٹوں کو کسی صاف اور زلال و مفید پانی کے چشمے تک لے جاتا ہے یا کسی گندے تالاب کے آلودہ اور مضر پانی تک۔

ان فقروں میں حضرت زہراء(ع) یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ: اگر مسلمانوں کے امور کی باگ ڈور حضرت علیؑ کے ہاتھ میں ہوتی تو معاشرے کو سختی اور خشونت کے بجائے نرمی اور آرامش کے ذریعے ایسے مقام تک لے جاتے کہ جو ان کے لئے مفید ہوتا اور انہیں چشمہ حیات سے سیراب فرماتے جس کے بعد معاشرے میں فقر و فاقہ، ناانصافی اور ایک دوسرے پر برتری وغیرہ کا خاتمہ ہو جاتا اور منابع اور وسائل کو عدالت کے ساتھ لوگوں میں تقسیم کر دیتے۔

" ولا صدرھم بطاناً "

(اور انہیں سیراب کر کے واپس لے آتے)

"اصدرہم" یعنی ان کو واپس لایا. جب سیراب ہونے کے بعد مویشیوں کو گھاٹ سے واپس لایا جاتا ہے تو عرب یہ کہتے ہیں کہ "اصدرہم" جبکہ مویشیوں کو گھاٹ لے جاتے وقت کہتے ہیں کہ "اوردہم".

"بطان" شکم سیری اور معدے کے کسی چیز سے بھر جانے کو کہتے ہیں. اس جملے کا معنی یہ ہے کہ جب ان کے پیٹ بھر جاتے اور پانی سے سیراب ہوجاتے تو آپؑ انہیں واپس لے آتے.

(۷) "ونصح لہم سراً واعلاناً"

(اور ۔ حضرت علیؑ ۔ ان کو آشکارا اور پوشیدہ طور پر نصیحت فرماتے اور ان کے خیر خواہ ہوتے)

یعنی، آپؑ صرف نعرہ بازی، تقریر اور زبانی حد تک لوگوں کے خیر خواہ نہ ہوتے بلکہ جہاں آپؑ ظاہری طور پر خیر خواہ نظر آتے ہیں وہاں باطن میں بھی لوگوں کے خیر خواہ اور ان کے دلسوز ہوتے.

بیت المال مسلمین اور حکومت:

(۸) "ولم یکن یتحلیٰ من الغنیٰ بطائل"

(اور قومی خزانے سے اپنے لئے کوئی جائیداد نہ بناتے اور اپنے سرمایے میں اضافہ نہ فرماتے)

یعنی، اگر خلافت حضرت علیؑ کے ہاتھ آتی تو آپؑ بیت المال کو اپنی ذات، برادری، دوستوں اور پارٹی کے افراد کے مفاد میں استعمال نہ کرتے اور اس سے کوئی شخصی یا گروہی مفادات کے لئے استفادہ نہ فرماتے اور اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے اس سے غلط فائدہ نہ اٹھاتے.

"یتحلیٰ" کی اصل "حلو" ہے یعنی شیرین اور میٹھا. جب کسی چیز سے کوئی اچھا خاصا فائدہ حاصل ہو تو "حلی" سے تعبیر کرتے ہیں. "لم یکن یتحلیٰ" یعنی کوئی فائدہ نہ اٹھاتے. "من الغنیٰ" قومی سرمائے اور خزانے ۔ بیت المال ۔ سے. "بطائل" اپنے ذاتی مفاد کے لئے.

(۹) "ولا یحظی من الدنیا بنائل، غیر ری الناهل وشبعة الکافل"

(دنیا سے کوئی استفادہ نہ فرماتے سوائے اس کے کہ پیاس مٹانے کے لئے ایک گھونٹ پانی پیتے اور یتیم کے کفیل کی طرح بھوک مٹانے کے لئے ایک روٹی کے کھاتے)

"یحتظی" مادہ "حظ" سے فعل مضارع ہے اور یہاں مقصود یہ ہے کہ دنیا سے اپنے لئے کوئی۔ مادی۔ فائدہ نہ اٹھاتے اور آپؑ کی روش ایسی نہ تھی کہ بیت المال مسلمین سے اپنے لئے کچھ لیں یا اس سے ذاتی جائیداد بنائیں یا ذاتی مفادات کے لئے بیت المال کو استعمال کریں سوائے روٹی کے چند لقموں یا پانی کے چند گھونٹ کے کہ جس سے آپؑ اپنی بھوک اور پیاس ختم کر سکیں، لیکن بیت المال سے ذخیرہ اندوزی اور حاتم بخشی کا کام نہ لیتے۔

" غیر ری النّاھل " سوائے پیاس بجھانے کے کوئی اور استفادہ نہ کرتے. بالکل اس پیاسے شخص کی مانند جو کسی نہر کے کنارے پہنچ جائے اور اپنی پیاس بجھا کر وہاں سے چلا جائے۔

" وشبعۃ الکافل "" کافل " یعنی یتیموں کی سرپرستی کرنے والا۔ فقہی اعتبار سے۔ کفیل صرف اتنا حق رکھتا ہے کہ اگر یتیم کے لئے کوئی کام کرے اور خود فقیر ہو اور بھوکا بھی ہو تو قوت لایموت کے طور پر قناعت کے ساتھ کچھ کھا سکتا ہے تاکہ بھوک اسے نہ ستائے۔ اس جملے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح کٹھن شرائط میں یتیم کا کفیل یتیم کے مال سے کچھ کھا سکتا ہے اسی طرح امیر المؤمنینؑ بھی بیت المال سے بھوک مٹانے کے لئے تھوڑا سا استفادہ فرماتے۔ یعنی اگر خلافت حضرت علیؑ کو ملتی اور بیت المال آپؑ کے ہاتھ میں آتا تو آپؑ معاشرے کے دوسرے افراد کی طرح معمولی سی غذا کھاتے اور بس۔ مختلف حیلے بہانے بنا کر زر اندوزی اور مال و ثروت جمع کرنے اور اپنی جائیداد میں اضافے کے بارے میں آپؑ سوچ بھی نہیں سکتے ہیں اس طرح بیت المال اور ملت کے قومی سرمائے کو آپؑ اپنی ذات اور حکومت کے مفادات پر خرچ نہ کرتے بلکہ امت کی ترقی و تکامل پر صرف فرماتے (۱)۔

اقتدار کے بھوکے اور خدمت کے شیدائی:

۱۶" ولبان لھم الزاھد من الراغب "

۱۔ جس حکومت کا سربراہ علیؑ جیسی ہستی ہو تو اگر اس حکومت کی تقویت کی راہ میں بیت المال خرچ کرتے تو بھی عرف اور شریعت کے رو سے اس میں کوئی اشکال نہ ہوتا لیکن آپؑ یہ چاہتے تھے کہ مادی امکانات سے استفادہ کرنے کے سلسلے میں فقیرانہ زندگی گزاریں تاکہ قیامت تک کی انسانیت کے لئے زندہ نمونہ اور رہبر و راہنما بن سکیں۔

(۔اگر حضرت علیؑ کی حکومت ہوتی تو۔لوگوں پر واضح ہوتا کہ دنیا۔کی رنگینیوں۔سے منہ پھیرنے والا کون ہے
اور اس کی طرف رغبت رکھنے والے کون)

حضرت زہراء(ع) کے اس کلام سے شاید یہ استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ اس دور میں حکومت وقت کے اندر بیت المال کے بارے میں اسراف اور حاتم بخشی پائی جاتی تھی، جس کی وجہ سے آپؑ اس طرف اشارہ فرماتی ہیں. اگرچہ رحلت رسول خدا(ص) کو چند دن ہی گزرے تھے لیکن اس کے باوجود حکمران ٹولہ بیت المال سے۔ شخصی و گروہی مفادات کی راہ میں استفادہ اور۔اسراف کررہا تھا.

" لبان لہم "تو مسلمانوں پر واضح ہوتا کہ " الزاھد من الواغب "دنیا کے حریص کون ہیں اور دنیا سے بے رغبت کون.

خلافت اور چند دن کی دنیوی حکومت اور ریاست کے لئے جو لوگ دختر رسول(ص) پر ظلم کریں اور ان پر اس طرح مظالم ڈھائیں تو یہ اس بات پر ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ یہ لوگ دنیا پرست ہیں اور مقام و منصب ان کے لئے ہر چیز سے زیادہ قیمت رکھتے ہیں.

"والصادق من الکاذب" (۱۱)

(اور سچے سے جھوٹے کو پہچان لیتے)

اس طرح مسلمانوں کو معلوم ہوتا کہ حقیقت میں کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔کون لوگ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ مخلص ہیں اور کون مفاد پرست، کون دنیا کے حریص ہیں اور کون دنیا سے روگردان۔

ظلم اور کفران نعمت:

حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا قرآن کی اس آیۂ شریفہ کو بطور شاہد پیش کرتی ہیں کہ:

" ولو ان اھل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السمآء والارض (۱)"

(اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیزگار بنتے
تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں (کے دروازے) کھول دیتے)

۱۔ سورۂ اعراف / ۹۶.

" ولکن کذبوا فاخذناهم بما کانوا یکسبون (۱) "

(لیکن۔ ایمان لانے کے بجائے۔ انھوں نے۔ ہمارے پیغمبروں کو۔ جھٹلایا

تو ہم نے ان کے غلط کاموں کے بدلے میں ان کو پکڑ لیا)

سورۂ ابراہیمؑ میں خداوند تعالیٰ اپنی نعمتوں کا ذکر فرماتا ہے اور اس کے بعد ارشاد فرماتا ہے کہ:
" وآتاکم من کل ما سالتموہ " (اپنی ذاتی استعداد اور صلاحیتوں کے لحاظ سے انسان کو جس چیز کی ضرورت تھی خدا نے اسے عنایت فرمائی) " وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا " (اگر تم خدا کی نعمتوں کو گننے لگو تو شمار نہ کر سکو گے)۔

یہاں ممکن ہے کوئی یہ سوال کرے کہ: پھر انسان کی زندگی میں وسائل کی یہ قلت کیوں نظر آتی ہے؟
اس سوال کا جواب خود خداوند علیم وخبیر دیتا ہے کہ: " ان الانسان لظلوم کفار (۲) " انسان کے اندر دو بری صفات ہیں ایک تو وہ بہت زیادہ ظلم کرتا ہے اور دوسری یہ کہ وہ حد سے زیادہ کفران نعمت کا مظاہرہ کرتا ہے۔

کفران نعمت یہ ہے کہ خدا کی نعمتوں سے بہتر اور مناسب طریقے سے انسان استفادہ نہ کریں۔ مثال کے طور پر پانی ہے لیکن اس سے صحیح استفادہ نہیں کرتے۔ نہر نکال کر، بند باندھ کر، زراعت اور بجلی گھر وغیرہ کے لئے استفادہ نہیں کرتے بلکہ پانی کو ضائع ہونے دیتے ہیں۔ زمین موجود ہے، معادن بھی ہیں لیکن ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

" ظلوم " یعنی کچھ لوگوں کا دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈالنا اور ان کے خون پسینے کی کمائی سے خود استفادہ کرنا۔ پس دنیا میں جو قلت دکھائی دیتی ہے اس کی دو وجوہ ہیں: ایک انسان کا اپنے ہمنوع پر ظلم کرنا اور دوسری کفران نعمت۔ اسی لئے خداوند فرماتا ہے کہ: " ان الانسان لظلوم کفار " (کہ انسان بہت بڑا ظالم اور کفران نعمت کرنے والا ہے)۔

پس اگر کوئی یہ پوچھے کہ اگر خداوند متعال نے انسان کی تمام ضروریات کی پوری ہیں تو یہ قلت اور

۱۔ سورۂ اعراف / ۹۶۔ ۲۔ سورۂ ابراہیمؑ / ۳۴۔

فقر وفاقہ اور غربت کیوں ہے؟ تو خدا جواب دیتا ہے کہ اس فقر وفاقہ اور بے چارگی کی وجہ تم خود ہو کیونکہ تم ۔ انسان ۔ ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہو اور دوسروں کے حقوق غصب کرتے ہو اور میری نعمتوں سے نامناسب اور غیر شائستہ طریقے سے استفادہ کرتے ہو۔

حضرت زہراء (ع) ۔ خلافت حقہ کی برکات اور غصب خلافت کی حقیقت اور غلط نتائج کے بارے میں ۔ اس آیہ شریفہ سے استدلال کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ: " ولو ان اهل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیهم برکات من السمآء والارض ولکن کذبوا فاخذناهم بما کانوا یکسبون(۱) " (اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم آسمان اور زمین کی نعمتوں کا دروازہ ان پر کھول دیتے، لیکن ان لوگوں نے جھٹلایا ہے تو ہم نے ان کے اس کام کے بدلے میں ان کو پکڑلیا ہے۔)

آپؑ قرآن سے مزید تمسک کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

" والذین ظلموا من هٰؤلاء سیصیبهم سیئات ما کسبوا "

(اور ان لوگوں میں سے جنہوں نے ظلم کیا ہے عنقریب ان کو اپنے غلط کاموں کے برے نتائج سے دوچار ہونا پڑے گا)

یعنی مکہ میں رہنے والا ۔ یا جو شخص بھی ۔ ظلم کا ارتکاب کرے اسے اپنے کاموں کے برے نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا یعنی غلط کاموں کے فطری نتائج معاشرے میں برآمد ہوں گے اور جب آگ لگتی ہے تو خشک وترسب کو جلا دیتی ہے۔

حضرت فاطمہؑ نے اس آیت کے مضمون کی تطبیق ان لوگوں پر فرمائی ہے کہ جنہوں نے اہل بیتؑ پر ظلم کیے تھے لیکن آیت کا معنی عام ہے اور کسی خاص فرد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

" وما هم بمعجزین(۲) "

(اور اس وقت وہ کچھ نہ کرسکیں گے)

یعنی نہ وہ قہر وغضب خداوندی کو روک سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے عذاب سے فرار یا نجات کا کوئی انہیں راستہ مل سکتا ہے۔

۱۔ سورۂ اعراف / ۹۶۔ ۲۔ سورۂ زمر / ۵۱۔

"الا ھلمّ فاستمع"

(آئیں اور سنیں)

اگرچہ حضرت زہراء (ع) کے سامنے جو حاضر تھے وہ سب عورتیں تھیں لیکن یہ خطاب عام ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ "ھلمّ" مردوں کے لئے مخصوص ہے اور عورتوں کے لئے "ھلمّن" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض دوسرے اہل لغت کہتے ہیں کہ "ھلمّ" سے مرد وزن دونوں کو خطاب کیا جاتا ہے۔

بہر صورت یہاں حضرت زہراء (ع) عام خطاب فرماتی ہیں اور آپؑ کے اس خطاب میں "خواتین اور حضرات" سب شامل ہیں۔ یعنی سب آئیں اور سنیں۔ جس طرح بعض مطالب کی ابتداء میں۔ عربی اور فارسی کتابوں میں۔ "اعلم" یعنی جان لو۔ کا لفظ لایا جاتا ہے یا صرف میر (۱) کی ابتداء میں" بدان ایدک اللہ" آیا ہے۔ تو یہاں لفظ "اعلم" اگرچہ مذکر ہے لیکن مقصود ہر وہ انسان ہے جو اس کتاب کو پڑھے۔ اسی طرح یہاں حضرت زہراء (ع) کا مقصد بھی اس وقت کے تمام مسلمان ہیں۔

"وما عشت اراک الدھر عجباً"

(جب تک تم زندہ رہو گے زمانہ تمہیں عجیب چیزیں دکھاتا رہے گا)

یہاں پر بھی تمام مسلمانوں سے خطاب ہے کہ جس طرح تم نے ہمارے ساتھ عجیب سلوک کیا ہے زمانہ تمہیں بھی تعجب انگیز اور عجیب چیزیں دکھائے گا۔ کون یہ سوچ سکتا تھا کہ ایک دن اسلام کے نام پر، پیغمبر اسلام (ص) کے اہل بیتؑ اور اس کی بیٹی کو ان بے تحاشا مظالم کا نشانہ بنایا جائے گا۔

بعض نسخوں میں" ما عشت اراک "کے بجائے" ما عشتن اراکنّ "ذکر ہوا ہے لیکن معنی ومفہوم کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

"وان تعجب فعجب قولھم"

۱۔ صرف میر عربی گرامر کی ایک کتاب ہے جو عربی سیکھنے والے ابتدائی طالبعلموں کو پڑھائی جاتی ہے اور اس میں عربی الفاظ کی بناوٹ اور گردان کے قواعد بیان کئے گئے ہیں۔

(اگر تم تعجب کرتے ہو تو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ۔ان کی باتیں عجیب ہیں)

یہ جملہ قرآن کریم سے ماخوذ ہے اور وہاں یہ جملہ قیامت اور حشر ونشر کے منکرین کے بارے میں نازل ہوا ہے۔

"لیت شعری الیٰ ای سناد استندوا ؟!"

(اے کاش میں بھی جان لیتی کہ انہوں نے کس سند کا سہارا لیا ہے اور اس پر اعتماد کئے ہوئے ہیں ؟!)

لوگوں نے۔اپنے دینی ودنیوی امور میں۔کس پر اعتماد کیا ہے اور کس پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں؟ حالانکہ علیؑ کو گوشہ نشین کردیا ہے! پیغمبر(ص) کی عترتؑ کے ساتھ یہ۔غیر انسانی۔سلوک روا رکھنے کے بعد کیوں کر دوسروں کے پیچھے چلے گئے ہیں ؟! یا یہ کہ آپؑ کا مقصد یہ ہو کہ حضرت علیؑ اور اہل بیتؑ جیسے بھروسے کے مستحکم اور قوی مقام کو چھوڑ دیا ہے اور ان کی جگہ پر وہ کونسے افراد ہیں جن کو اپنے بھروسے اور اعتماد کے لئے انتخاب کیا ہے ؟!

"والیٰ ای عماد اعتمدوا ؟!"

(اور کس ستون پر ٹیک لگائے ہوئے ہیں ؟!)

یہ جملہ دوسرے معنی کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے یعنی اہل بیتؑ پیغمبر(ص) کے بعد آخر وہ کونسا ستون اور اعتماد کا مقام ہے کہ جو قابل اعتماد وبھروسہ ہو ؟

"وبایۃ عروۃ تمسکوا ؟!"

(اور کس رسی کو تم نے پکڑا ہوا ہے ؟)

یعنی، کسی بھی معاشرے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک صحیح اور قابل اعتماد بھروسے کا مقام ہو، لیکن ان لوگوں نے جس حکومت کو اس مقصد کے لئے بنایا ہے وہ ظلم اور تجاوز کی فراوانی کا سبب بنے گی اگرچہ فی الحال ابوبکر اور عمر کسی حد تک ظاہرداری سے کام لے رہے ہیں لیکن کچھ عرصہ بعد معاویہ اور یزید جیسے حکمران آئیں گے۔اور خون کا دریا بہائیں گے۔

"وعلیٰ ایۃ ذریۃ اقدموا واحتنکوا ؟!"

(اور کس کی اولاد کے خلاف کاروائیاں کررہے ہیں اور نابود کررہے ہیں ؟!)

" احتنک " یعنی ہلاک کرنا، نابود کردینا۔ قرآن میں بھی شیطان کی یہ بات نقل ہوئی ہے کہ:

" لاحتنکنّ ذریته الاقلیلاً(۱) " (سوائے چند افراد کے میں آدم کی اولاد کو ہلاک اور نابود کردوں گا)۔

حضرت زہراء(ع) یہ سوال کرتی ہیں کہ: " وعلی ایة ذریة اقدموا واحتنکوا؟ " (کس کی اولاد کے خلاف یہ اقدام ہورہا ہے اور ان کی نابودی کے درپے ہیں ؟) کیا لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ سقیفہ کی سازش کا ہدف یہ ہے کہ پیغمبر(ص) کے اہل بیتؑ نابود کردیئے جائیں؟ کیا انہیں، اہل بیتؑ کے اہداف، کمالات اور خدا کے ہاں ان کے قرب ومنزلت کا علم نہیں ہے؟۔

" ولبئس المولیٰ ولبئس العشیر (۲) "

(کس قدر برا ہے۔ اس معاشرہ۔ کا " مولا " اور کس قدر برا ہے اس کے مددگار اور اس کا تعاون کرنے والے)

" مولیٰ " یا تو اپنے مشہور معنی۔ سربراہ وسرپرست۔ میں استعمال ہوا ہے یا دوست، مدد کرنے والے اور محبت کرنے والے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ " عشیر " بھی دوست اور تعاون کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔ پس " مولا " اور " عشیر " دونوں تکیہ گاہ کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔

یہ فقرہ بھی قرآن کریم سے ماخوذ ہے اور مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے لئے برے اور غلط بھروسے کا مقام انتخاب کیا ہے (۳)۔

" وبئس للظالمین بدلاً(۴) "

(ظالموں کے لئے یہ بھروسے کا مقام بہت ہی برا مقام ہے)

یہ فقرہ بھی قرآن سے اقتباس کیا گیا ہے اور حضرت زہراء(ع) کا مقصود، سقیفہ۔ کی بغاوت۔ ہے کہ جہاں چند مفاد پرست لوگوں نے حضرت علیؑ کے۔ خلاف بغاوت کی۔ اور ابوبکر کو امام اور۔

۱۔ سورۂ اسراء / ۶۲۔ ۲۔ سورۂ حج / ۱۳۔

۳۔ " مولیٰ " کے کئی معانی ہیں منجملہ: مالک، آقا، غلام وبندہ، احسان کرنے والا، نعمت دینے والا، جس کو نعمت دی جائے، دوست، ساتھی، محب اور ہم پیمان وغیرہ۔

۴۔ سورۂ کہف / ۵۰۔

"خلیفۃ المسلمین" کے عنوان سے پہچنوایا۔

سقیفہ کی کاروائی کی ایک جھلک۔

"استبدلوا واللّٰہ الذنابی بالقوادم"

(خدا کی قسم: ان لوگوں نے پرندے کے اگلے پروں کو چھوڑ کر پچھلے پروں کو پکڑا ہوا ہے)

"قوادم، قادمہ" کی جمع اور پرندے کے اگلے پروں کو کہا جاتا ہے جبکہ "ذنابی" پرندے کی دم کے نزدیک والے پروں کو کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ حضرت امیر المؤمنینؑ اور حضرت زہراءؑ کے کلام میں کثرت سے تشبیہ اور استعارہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ پرندوں کے اچھے اور اعلیٰ پر، اس کے اگلے حصے کے بڑے پر ہوتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ شاہین کے پروں کے اگلے حصے میں دس بڑے پر ہوتے ہیں، دوسرے پرندوں کے بھی اپنی جسامت کے حساب سے پر ہوتے ہیں۔ بہر صورت پرندے اپنے پروں کے ذریعے پرواز کرتے ہیں، ان کی قدرت وطاقت بھی انہی پروں میں ہوتی ہیں اور انہی پروں کے ذریعے اپنے دفاع بھی کرتے ہیں، لیکن دم پر موجود پر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔

حضرت زہراء(ع) یہاں تشبیہ دیتی ہیں کہ کسی معاشرے کا پیشرو اور بانفوذ طبقہ اگر دلیر، عاقل، تجربہ کار اور سنجیدہ ہو تو یہ افراد معاشرے کی ترقی اور تکاملی پرواز میں پرندوں کے اگلے پروں کی حیثیت رکھتے ہیں اور معاشرے کے پست اور گھٹیا قسم کے افراد پرندے کی دم کے پروں کی مانند ہیں۔ اس طرح آپؑ فرماتی ہیں کہ: ان لوگوں نے اچھے اور بڑے پر کو۔ جو قدرت، شجاعت اور پرواز کا ذریعے ہیں۔ چھوڑ کر دم کے نزدیک والے بے خاصیت پروں سے استفادہ کیا ہے!

"استبدلوا واللہ" خدا کی قسم ان لوگوں نے بدل دیا "الذنابی" دم کے پاس والے بالوں سے "بالقوادم" بازو کے بڑے پروں کو، البتہ دوسرے جانوروں میں دم کو "ذنب" اور پرندوں میں "ذنابی" کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اگلے بڑے پروں کو دے کر جو قدرت و پرواز کا وسیلہ ہیں دم کو لے لیا ہے جو کہ

کثافت اور گندگی کی جگہ ہے۔ پست اور گھٹیا افراد کو جو اپنا کوئی ارادہ نہیں رکھتے بلکہ دوسروں کے اشاروں پر ناچتے ہیں "ذنابی" کہا جاتا ہے۔ سقیفہ میں جمع ہونے والوں کے بارے آپؑ کی یہ تشبیہ اس لئے ہے کہ۔ ان لوگوں نے ایسی عظیم ہستیوں کو خلافت سے دور رکھا ہے جو ہراول دستہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ شجاع تھے اور معاشرے کی ترقی وتکامل اور بلندیوں کی طرف پرواز کا ذریعہ بن سکتے تھے جبکہ ان کی جگہ پر ایسے افراد کو آگے لایا گیا ہے کہ جو پست، گھٹیا اور کردار سے عاری تھے۔ تاریخ نے بھی یہ بات وضاحت سے بیان کی ہے کہ جنگ خیبر سمیت دوسری بہت ساری جنگوں میں خلیفہ اول اور دوم ہمیشہ پیچھے پیچھے رہے اور دشمن کے مقابلے میں پیچھے ہٹتے رہے، وہ جنگ وجہاد کے آدمی نہیں تھے لیکن امیرالمؤمنینؑ تمام جنگوں اور حساس مواقع پر سب سے آگے آگے رہے، آگے بڑھتے گئے اور مسلمانوں کی فتح و کامیابی اور اسلام کی ترویج وپیشرفت کا باعث بنے۔

"والعجز بالکاهل"

(اور کوہان کو چھوڑ کر دم کو پکڑا ہوا ہے)

"کاھل" کوہان کو کہا جاتا ہے۔ اور "کاھل القدم" سے کسی قوم یا قبیلہ کا وہ افراد مراد ہیں جو سختیوں اور مشکلات میں لوگوں کا ملجاء اور پناہگاہ ہوں۔ "عجز" دم اور بدن کے آخری حصہ کو کہا جاتا ہے۔ یعنی، ان لوگوں نے مشکلات وسختیوں میں جو ان کا ملجاء اور پناہگاہ ہے اور جو ان کے کمال کا سبب ہے کو چھوڑ دیا ہے اور دم کی طرح پست اور گھٹیا انسانوں کے ساتھ ہوگئے ہیں۔

"فرغماً لمعاطس قوم یحسبون انهم یحسنون صنعاً"

(خاک پہ رگڑے اس قوم کی ناک کو۔ خدا ذلیل کرے اس قوم کو۔ جو۔ فتنہ برپا کرنے کے بعد۔

یہ گمان کرنے لگی ہے کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں)

"معاطس، معطس" کی جمع ہے اور اسم مکان ہے۔ عطسہ، یعنی چھینک آنے کی جگہ اور اس سے ناک مراد ہے۔ لفظی ترجمہ یہ ہے کہ خاک پہ رگڑے اس قوم کی ناک کو جو "یحسبون انهم یحسنون صنعاً" یہ خیال کرتی ہے کہ کوئی اچھا قدم اٹھا رہی ہے، حالانکہ انہوں نے فتنہ وآشوب برپا کیا ہے اور لوگوں کو حق

سے منحرف کر کے تاریخ اسلام میں ظلم اور انحراف کی بنیاد رکھی ہے۔

آپؑ قرآن کی اس آیۂ شریفہ سے استناد فرماتی ہیں کہ:

"الا انهم هم المفسدون و لكن لا يشعرون[1]"

(آگاہ رہو! یہی لوگ مفسد ہیں اور یہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ مصلح ہیں۔)

"ويحهم![2] افمن يهدي الى الحق احق ان يتبع ام من لا يَهدي الا ان يُهدى"

(افسوس ہو ان پر! دوسروں کو حق کی جانب ہدایت کرنے والے پیروی کے زیادہ حقدار ہیں؟

یا وہ جو خود ہدایت کے محتاج ہیں؟)

یہ آیۂ کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص دین کے مبانی اور احکام سے زیادہ آگاہی رکھتا ہو اور معاشرے کی راہنمائی بہتر طریقے سے کر سکے اسے معاشرے کا سربراہ اور امام ہونا چاہئے لیکن وہ افراد جو ہدایت اور امور کو درک کرنے کے اعتبار سے کمتر درجہ رکھتے ہیں اور دوسروں کی مدد اور ہدایت کی طرف محتاج ہیں تو وہ اتباع اور پیروی کے لائق نہیں ہیں۔

"فما لكم كيف تحكمون؟![3]"

(پس تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم کس طرح فیصلہ کرتے ہو؟!)

تم اپنے ضمیر کی طرف رجوع کرو کہ یہ کیسا فیصلہ ہے جو تم کر رہے ہو؟! حضرت علیؑ علم اور آگاہی کے لحاظ سے سب سے آگے ہیں، تو کیوں وہ خانہ نشینی پر مجبور ہو جائیں؟ اور ان کے حقوق پامال ہوں؟!

مستقبل کے انحرافات کی پیش گوئی:

"اما لعمري لقد لقحت"

(آگاہ رہو! میری جان کی قسم کہ۔ یہ حکومت جو ان لوگوں نے بنائی ہے۔ بتحقیق کہ حاملہ ہو چکی ہے)

۱۔ سورۂ بقرہ / ۱۲۔

۲۔ "ویحہ" دلسوزی اور ترحم کے مقام پر بولا جاتا ہے جبکہ "ویل" نفرین اور لعنت کے مقام پر۔

۳۔ سورۂ یونس / ۳۵۔

سقیفہ میں ان لوگوں نے جو نئی حکومت بنائی ہے وہ ابھی تازہ حاملہ ہوچکی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کا بچہ کیسا ہوگا اور کس طرح کا دودھ اس سے حاصل ہوگا۔

حضرت زہراءؑ یہاں مستقبل کی طرف اشارہ فرماتی ہیں کہ امامت اور حکومت میں انحراف کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کچھ مدت گزرنے کے بعد معاویہ، یزید، بنی امیہ اور بنی عباس جیسے حکمران برسر اقتدار آجائیں گے اور اسلامی تعلیمات اور خود اسلام کا مذاق اڑائیں گے۔ یہاں تک کہ "ولید (۱)" شراب کے حوض میں تیرے گا اور اپنی کنیز کے ساتھ ہمبستری کرے گا اور اس مست کنیز کے سر پر اپنا عمامہ رکھ دے گا تاکہ وہ جاکر مسلمانوں کو نماز جماعت پڑھائے !!! اس طرح، اسلام کے نام پر اسلام کی توہین اور تحریف کی یہاں تک نوبت پہنچ جائے گی !!۔

"اما لعمری لقد لقحت "اس حکومت کی۔ نئی نویلی دلہن۔ حاملہ ہوچکی ہے۔

"فنظرۃ ریثما تنتج"

(پس انتظار کریں اور دیکھیں کہ کیا نتیجہ حاصل ہوتا ہے)

"نظرۃ" ممکن ہے فعل مقدر کے لئے مفعول مطلق ہو تو نصب کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کا فعل مقدر "انظروا" تقدیر میں ہوگا۔ "ریثما" مقدار اور وقت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

سقیفہ کے بعد لوگوں کی بدحالی کی پیش گوئی:

"ثم احتلبوا ملء القعب دماً عبیطاً"

(پھر اس سے بڑے برتنوں جتنا۔ دودھ کے بجائے۔ خالص خون دوہ لو)

"قعب" یعنی دودھ کا کونڈا، بڑا برتن۔ "ملء القعب" یعنی برتن کا بھرجانا۔ "احتلاب" دودھ دوہنا۔ "عبیط" خالص کے معنی میں ہے۔ مقصود یہ ہے کہ تم نے جو خلافت بنائی ہے وہ حاملہ کی طرح اپنی حاملگی کے ایام گزار رہی ہے اور جب یہ نتیجہ پر پہنچے گی اور بچہ پیدا کرے گی تو دودھ کے بجائے تازہ اور خالص

۱۔ "ولید بن عبدالملک" بنی امیہ کا ایک بادشاہ جسے ۸۶ ہجری میں حکومت ملی تھی۔

خون تمہیں دوھنا ہو گا.

"وذعافاً مبيداً"

(اور۔ دودھ کی جگہ۔ زہر قاتل دوہ لو)

"ذعاف" یعنی زہر "بید" یعنی مہلک. مقصد یہ ہے کہ تم نے جو حکومت بنائی ہے اس کا آخری نتیجہ یہی ہو گا.

حضرت زہراء(ع) نے اپنے اس فصیح و بلیغ کلام میں صراحت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے اور پیش گوئی فرمائی ہے کہ مسلمانوں کے اس پوری تاریخ اسلام کے دور میں، اسلام کے نام پر غاصب حکومتیں ان تمام فتنوں اور مظالم کا ارتکاب کریں گی اور ان تمام فتنوں کی جڑ اور ام الفساد کو، فتنۂ سقیفہ قرار دیا ہے.

"هنالك يخسر المبطلون"

(یہاں سے اہل باطل خسارے میں ہوں گے)

"ويعرف التالون غبّ ما اسس الاولون"

(آنے والی نسلیں اس کے آخری اور برے انجام اور آثار کو جان لیں گی کہ جس کی بنیاد گزشتہ نسلوں نے رکھی تھی)

سقیفہ کے بعد رونما ہونے والے فتنوں کی خبر:

"ثم طيبوا عن دنياكم انفساً"

(۔اب جب تم اپنے مقصد کو حاصل کر چکے ہو تو۔ اپنی دنیا۔ کی رنگینیوں۔ پر خوش رہو)

"واطمئنوا للفتنة جاشاً"

(آنے والے فتنوں کے بارے میں مطمئن رہو)

"جاش" یعنی دل: مقصد یہ ہے کہ دل سے یقین کرلو کہ تم مستقبل میں فتنوں اور بلوؤں کا شکار ہو گے.

"وابشروا بسيف صارم"

(اور تیز دھار والی تلواروں کی تمہیں بشارت ہو)

تم نے جو کام کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مستقبل میں ایسے سرکش حکمران آئیں گے جو اپنی ننگی تلواروں سے بے گناہ مظلوموں کا خون بہائیں گے، کسی پر رحم نہیں کریں گے۔ ہاں ایسا ہی ہوا کہ صرف "حجاج بن یوسف(۱)" نے کوفہ۔ عراق۔ میں ایک لاکھ بیس ہزار انسانوں کا خون بہایا ہے!۔

" وسطوۃ معتد غاشم "

(۔ تمہیں بشارت ہو۔ ایسی متجاوز طاقت کی کہ جو ظلم و تجاوز کو اپنی انتہا تک پہنچا دے گی)

"سطوۃ" یعنی طاقت وقدرت۔ "معتد غاشم" وہ شخص جو بے نہایت ظلم کرے۔ میں تمہیں ایک ایسے طاقتور ظالم کی بشارت دیتی ہوں جو اپنی طاقت کے بل بوتے پر تمہیں شدید ترین ظلم وستم کا نشانہ بنائے گا۔

" وبھرج شامل "

(اور تمہیں ہمہ گیر فتنہ وفساد اور آشوب۔ کی بشارت ہو۔)

" واستبداد من الظالمین، یدع فیئکم زھیداً "

(اور ظالموں کے جبر واستبداد کی۔ بشارت دیتی ہوں۔ جو تمہارے لئے بیت المال سے بہت ہی کم چھوڑے گا کہ جس کے حقیر ہونے کی وجہ سے کوئی اس میں رغبت نہیں کرے گا)

" وجمعکم حصیداً "

(اور تمہاری جمعیت کو کاٹ ڈالیں گے۔ تمہارا قتل عام کردیں گے۔)

"حصید" کٹی ہوئی فصل کو کہتے ہیں۔

حضرت فاطمہ(ع) یہ اشارہ فرمانا چاہتی ہیں کہ: بنی امیہ، بنی عباس اور دوسرے خلفاء وامراء تمہارا قتل عام کریں گے اور تمہیں اس طرح کاٹ دیں گے کہ جس طرح کسان فصل کو کاٹ دیتے ہیں۔

" فیا حسرۃ لکم! وانی بکم؟ "

۱۔ "حجاج بن یوسف" بنی امیہ کا سفاک ترین والی رہا ہے۔ اسے ۷۵ ہجری کے بعد حکومت ملی، شہر واسط میں ایک معروف زندان بنایا جہاں ۳۳ ہزار زندانی تھے اور اپنی حکومت کے دوران اس نے ایک لاکھ بیس ہزار لوگوں کو "مثلہ" کر دیا!!۔

(پس تم پر افسوس ہو! اور تم کہاں بھٹک رہے ہو؟!)

یعنی، تم مسلمانوں کے حال اور مستقبل پر افسوس اور حسرت کرنی چاہیے۔

"وقد عمیت علیکم، انلزمکموھا وانتم لھا کارھون!"

(حق کی راہ اور خدا کی رحمت کے مقابلے میں تم اندھے ہو چکے ہو،

کیا ہم تم کو جبراً صراط مستقیم پر گامزن کریں حالانکہ تم اسے پسند نہیں کرتے ہو!)

یہ فقرہ حضرت نوح (ع) نے اپنی قوم سے فرمایا تھا اور خداوند تعالیٰ نے قرآن میں اسے نقل کیا ہے۔ حضرت زہراء (ع) نے قرآن سے اقتباس فرمایا ہے اور "خدا کی رحمت" سے آپؑ کا مقصد اہل بیتؑ کی امامت کی نعمت ہے اور سقیفہ کی بغاوت کے نتیجے میں مسلمان اس نعمت عظمیٰ سے محروم ہو گئے ہیں۔ درحقیقت اہل بیتؑ کا اس بات پر اصرار تھا کہ انسانیت اس نعمت سے محروم نہ ہو لیکن کچھ مسلمان اس بات پر آمادہ نہ تھے لہٰذا وہ مسلمانوں کے درمیان فتنہ وفساد اور ان کے اس نعمت سے محروم ہو جانے کا سبب بنے (۱)۔

بستر شہادت پر آپؑ کا یہ خطبہ یہاں پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

انصار و مہاجرین کی حضرت زہراء (ع) سے عذر خواہی:

کتاب احتجاج میں، خطبہ کے اختتام پر ذیل کے چند جملے بھی نقل ہوئے ہیں کہ:

"قال سوید بن غفلة، فاعادت النساء قولها علی رجالهنّ"

سوید بن غفلہ۔ جو اس روایت کا راوی ہے۔ کہتا ہے کہ انصار و مہاجرین کی عورتوں نے حضرت زہراءؑ کی باتوں کو اپنے مردوں تک پہنچایا۔

۱۔ آپؑ کے قوم نوحؑ سے مربوط آیت سے استفادہ فرمانے کی مناسبت اور شباہت یہ ہے کہ جس طرح سوائے چند افراد کے طوفان اور عذاب، نوحؑ کی ساری قوم پر نازل ہوا تھا اسی طرح سقیفہ کی وجہ سے ہونے والے فتنوں نے بھی تمام مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

" وجاء اليها قوم من وجوه المهاجرين والانصار معتذرين "

(اور انصار و مہاجرین کے بزرگوں کا ایک گروہ، عذر خواہی کے لئے آپؑ کے پاس آیا۔)

" فقالوا، یاسیدۃ النسآء لو کان ابو الحسن ذکر لنا هذا الامر، قبل ان نبرم العهد ونحکم العقد، لما عدلنا الی غیرہ "!

(اور کہنے لگے کہ: اے عورتوں کی سردار! ابو بکر کے ساتھ مضبوط عہد و پیمان باندھنے اور اس کی بیعت کرنے سے پہلے اگر ابوالحسن۔ علیؑ۔ اس سلسلے میں ہم سے بات کرتے تو ہم ان کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف ہرگز نہ جاتے۔!)

یعنی وقت گزر چکا ہے۔ اور ہم آپؑ اور علیؑ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم نے ابوبکر کی بیعت کرلی ہے اور اس کے ساتھ عہد و پیمان باندھ چکے ہیں لہذا شرعی طور پر اب عہد اور بیعت کو نہیں توڑ سکتے! اور اسے پامال نہیں کر سکتے لیکن علی(ع) اگر پہلے ہمارے پاس آتے اور یہی باتیں بتاتے تو ہم ان کو ہرگز تنہا نہ چھوڑتے اور ابوبکر کی بیعت نہ کرتے۔!!

" فقالت، الیکم عنی، فلا عذر بعد تعذیرکم ولا امر بعد تقصیرکم "

(تو آپؑ نے فرمایا کہ: دور ہو جاؤ، تمہاری اس ریاکارانہ معذرت خواہی کے بعد کوئی عذر باقی نہیں رہ جاتا اور نہ ہی تمہاری اس کوتاہی۔ اور جرم۔ کے بعد کوئی کام بن سکتا ہے)

"تعذیر" ریاکارانہ اور غیر صادقانہ عذر خواہی کو کہا جاتا ہے۔ یعنی۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ تم نے کوتاہی کی ہے، جرم کا ارتکاب کیا ہے، علیؑ کو خانہ نشینی پر مجبور کر دیا ہے۔ رسول خدا(ص) کے اہل بیتؑ کی شان میں گستاخی کی ہے، جس گھر میں جبرئیل بھی بغیر اجازت داخل نہیں ہوتا تھا، ابوبکر کی حکومت نے تمہاری پشت پناہی میں اسے آگ لگائی ہے! ان تمام خیانتوں کے مرتکب ہونے اور حالات کے کنٹرول سے باہر ہو جانے کے بعد آئے ہو اور اب عذر خواہی کرتے ہو!! (۱)۔

۱۔ مہاجرین اور انصار کی باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ: اگرچہ بفرض محال وہ اپنے دعوے اور عذر خواہی میں سچے بھی ہوں اور جھوٹ کا ارادہ نہ رکھتے ہوں پھر بھی وہ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے پر تیار نہ تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ ابوبکر کی حمایت کرنے پر اس کی ==

== توجیہہ کریں اس طرح کہ علیؑ نے خلافت کے بارے میں ہم سے بات کرنے سے پہلے ہی ہم نے ابوبکر کی بیعت کی ہے اور مضبوط عہد و پیمان باندھا ہے اور اب ہم نقض بیعت نہیں کر سکتے لہذا۔ اگرچہ منطق اور استدلال اور اصول و معیار کے اعتبار سے حضرت علیؑ خلافت کے حقدار ہیں لیکن چونکہ ہم نے ابوبکر کی بیعت کی ہے اور ابھی نقض بیعت نہیں کرنا چاہئے۔ ہم ابوبکر کا ساتھ دیں گے؛ حالانکہ ابوبکر کی بیعت ہی سرے سے باطل تھی کیونکہ غدیر خم میں رسول خدا (ص) نے علیؑ کی امامت اور خلافت کا اعلان کر دیا تھا اور آپؑ کو امامت پر منصوب فرمایا تھا۔ نیز سب نے وہاں بیعت بھی کی تھی اسی لئے آپؑ فرماتی ہیں کہ تمہاری اس خیانت کے بعد خلافت اب واپس نہیں مل سکتی اور تمہاری یہ ریاکارانہ عذر خواہی قابل قبول نہیں ہے۔۔

وصلی اللہ علیٰ محمد وآل محمد (ص)

حصّہ سوئم:

⊖ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

کی زبانی،

غصب فدک کی کہانی

پندرھواں درس:

- روایت کی سند
- صادق آل محمد (ع) فرماتے ھیں
- ابوبکر سے حضرت زھراء (ع) کا احتجاج
- فدک، امامت کی نشانی
- فدک اور امّ ایمن کی گواھی
- فدک اور حضرت علی (ع) کا ابوبکر کی سرزنش کرنا
- ابوبکر کے مقابلے میں حضرت علی (ع) کا استدلال
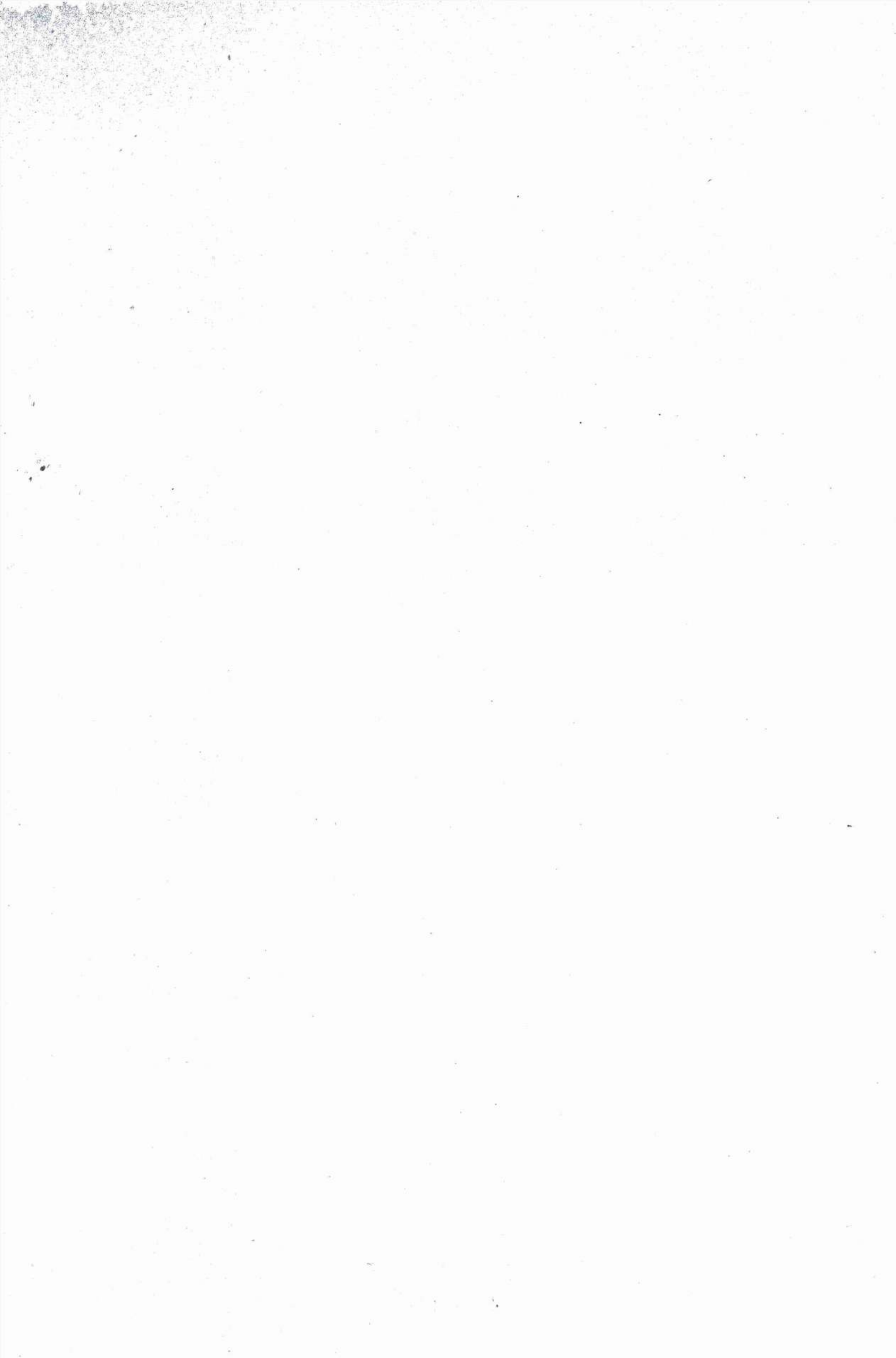
عَنْ حمّادِ بنِ عُثمان، عَنْ أَبی عَبْدِاللهِ عليه السلام، قالَ:

لَمّا بُويِعَ أَبوبكر وَ اسْتَقامَ لَهُ الأَمر عَلی جَميعِ الْمُهاجِرينَ وَ الأَنْصارِ، بَعَثَ إِلی فَدَک مَنْ أَخْرَجَ وَكيلَ فاطِمَة بِنْتِ رَسُولِ‌اللهِ صلى الله عليه وآله مِنْها؛ فَجاءَتْ فاطِمَةُ الزَّهْراءُ عليها السلام إِلی أَبی‌بَكر، ثُمَّ قالَت: لِمَ تَمْنَعني ميراثی مِنْ أَبی رَسُولِ‌اللهِ صلى الله عليه وآله وَ أَخْرَجْتَ وَكيلی مِنْ فَدَک وَ قَدْ جَعَلَها لی رَسُولُ‌اللهِ صلى الله عليه وآله بِأَمْرِ الله تَعالیٰ؟

فَقال لَها: هاتی عَلیٰ ذٰلِکَ بِشُهودٍ.

فَجاءَتْ بِأُمّ أَيْمن؛ فَقالَتْ لَهُ أُمّ أَيمن: لا أَشْهَدُ يا أَبابَكر حَتّی أَحْتَجَّ عَلَيْکَ بِما قالَ رَسُولُ‌اللهِ صلى الله عليه وآله، اَنْشُدُک بِالله، أَلَسْتَ تَعْلَم أَنَّ رَسُولَ‌اللهِ صلى الله عليه وآله قالَ: «أُمّ أَيْمَن إِمْرَأَةٌ مِنْ أَهْلِ الجَنَّة»؟ فَقالَ: بَلیٰ، قالت: «فَأَشْهَدُ أَنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ أَوْحیٰ إِلی رَسُولِ‌اللهِ صلى الله عليه وآله ﴿فَآتِ ذا القُرْبیٰ حَقَّهُ[1]﴾ فَجَعَلَ فَدكاً لِفاطِمَة عليها السلام بِأَمْرِ الله تعالی».

فَجاء عَلِيٌّ عليه السلام فَشَهِدَ بِمِثْلِ ذٰلِکَ، فَكَتَبَ لَها كِتاباً وَ دَفَعَهُ إِلَيْها؛ فَدخَلَ عُمَر فَقالَ: ما هٰذَا الكِتاب؟ فَقال: إِنَّ فاطِمَةَ عليها السلام إِدَّعَتْ فی فَدَک، وَ شَهِدَتْ لَها أُمّ أَيْمَن و عَلِيٌّ عليه السلام، فَكَتَبْتُهُ لَها؛ فَأَخَذَ عُمَر الْكِتابَ مِنْ فاطِمَة عليها السلام فَتفلَ فيه و مَزَّقَه!! وَ قالَ: هٰذا فَيْءٌ لِلْمُسْلِمينَ؛ وَ قالَ: أوس بن الْحَدثان و عايِشَة وَ حَفْصَة يَشْهَدُونَ عَلیٰ رَسُولِ‌اللهِ صلى الله عليه وآله بِأَنَّهُ قالَ: «إِنّا مَعاشِرَ الأَنْبِياء لانُوَرِّث وَ ما تَرَكْناهُ صَدَقَةٌ»؛ فَإِنَّ عَلِيّاً زَوْجُها يَجُرُّ إِلیٰ نَفْسِهِ وَ أُمّ أَيْمَن فَهِیَ إِمْرَأَةٌ صالِحَةٌ، لَوْ كانَ مَعَها غَيْرُها لَنَظَرْنا فيه.

فَخَرَجَتْ فاطِمَة عليها السلام مِنْ عِنْدِهما باكية حَزينة و هی تقول: مَزَّقَ اللهُ بَطْنَکَ كَما مَزَّقْتَ كِتابی هٰذا.

---

[1]. الروم: ٣٨

فَلَمّا کانَ بَعْدَ ذٰلِک جاءَ عَلِیٌّ علیه‌السلام إِلی أَبی‌بَکر وَ هُوَ فِی الْمَسْجِد وَ حَوْله الْمُهاجِرُونَ و الأَنْصار، فَقالَ: یا أَبابَکر! لِمَ مَنَعْتَ فاطِمَة میراثَها مِنْ رَسُولِ‌الله صلی‌الله‌علیه‌وآله؟ وَ قَدْ مَلَکَتْهُ فی حَیاةِ رَسُولِ‌الله صلی‌الله‌علیه‌وآله.

فَقالَ أَبُوبَکر: هٰذا فَیْءٌ لِلْمُسْلِمینَ، فَإِنْ أَقامَتْ شُهُوداً أَنَّ رَسُولَ‌الله صلی‌الله‌علیه‌وآله جَعَلَهُ لَها وَ إِلاّ فَلا حَقَّ لَها فیهِ.

فَقالَ أَمیرُالمُؤْمِنینَ علیه‌السلام: یا أَبابَکر! أَتَحْکُمُ فینا بِخِلافِ حُکْمِ اللهِ تَعالیٰ فِی المُسْلِمینَ؟ قالَ: لا؛ قالَ: فَإِنْ کانَ فی یَدِ المُسْلِمینَ شَیْءٌ یَمْلِکُونَهُ، ثُمَّ ادَّعَیْتُ أَنا فیهِ، مَنْ تَسْأَلُ البَیِّنَة؟ قال: إِیّاکَ کُنْتُ أَسْأَلُ البَیِّنَة، قالَ: فَما بالُ فاطِمَة سَأَلْتَها الْبَیِّنَة عَلیٰ ما فی یَدَیْها؟ وَ قَدْ مَلَکَتْهُ فی حَیاةِ رَسُولِ‌الله صلی‌الله‌علیه‌وآله وَ بَعْده، وَ لَمْ تَسْأَل الْمُسْلِمینَ بَیِّنَةً عَلیٰ ما ادَّعَوهُ شُهُوداً، کَما سَأَلْتَنی عَلیٰ ما ادَّعَیْتُ عَلَیْهِم؟ فَسَکَتَ أَبوبَکر؛ فَقالَ عُمَر: یا عَلِیّ! دَعْنا مِنْ کَلامِکَ، فَإِنّا لانقوی عَلی حُجَّتِک! فَإِنْ أَتَیْتَ بِشُهُودٍ عُدُولٍ، وَ إِلاّ فَهُوَ فَیْءٌ لِلْمُسْلِمینَ لاحَقَّ لَکَ وَ لا لِفاطِمَة فیهِ!!

***

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبہ نستعین

اب تک حضرت زہراء(ع) کے دو خطبہ ہم نے پڑھے ہیں کہ جنہیں آپؑ نے مسجد نبوی(ص) اور شہادت کے موقع پر بیان فرمایا تھا. اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ فدک کے بارے میں امام جعفر صادق(ع) سے معتبر کتابوں میں جو روایت نقل ہوئی ہے اسے برادران و خواہران کے سامنے پیش کروں تاکہ انشاء اللہ اس سے بہتر طور پر استفادہ کر سکیں.

روایت کی سند:

آیۂ شریفہ "فآت ذا القربیٰ حقہ (۱)" کی تفسیر میں "علی بن ابراہیم قمیؒ" نے اپنے والد سے ایک روایت نقل کی ہے جو فدک اور حضرت زہراءؑ سے مربوط ہے.

آپ کو معلوم ہے کہ "علی بن ابراہیم قمیؒ" راویوں کے آٹھویں طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور مرحوم کلینیؒ کے اساتذہ میں سے ہیں اور مرحوم کلینیؒ نویں طبقے سے شمار ہوتے ہیں (۲) اور کلینیؒ نے علی بن

۱۔ سورۂ روم / ۳۸.

۲۔ علم رجال میں راویوں کو رسول خداؐ سے حدیث نقل کرنے اور خود ان کی اوسط عمر کے اعتبار سے مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے. پہلا طبقہ اصحاب رسولؐ دوسرا طبقہ تابعین، تیسرا طبقہ تبع تابعین... اسی ترتیب سے ہر راوی اور حدیث نقل کرنے والا ایک خاص طبقے میں داخل ہوتا ہے ور اس سے تعلق رکھتا ہے.

ابراہیم قمیؒ سے کافی روایات نقل کی ہیں. یہ بزرگوار امام حسن العسکری (ع) کے دور کے راویوں میں سے تھے اور وہ قم کے شیخان نامی قبرستان میں مدفون ہیں. شاہ کے دور میں ان کے "مقبرے کو منہدم کرنا چاہتے تھے لیکن حضرت آیت اللہ العظمیٰ بروجردیؒ وہاں تشریف لے گئے اور فاتحہ پڑھا جس کی وجہ سے حکومت ڈر گئی اور اسے خراب نہ کیا.

علی بن ابراہیمؒ نے اس روایت کو اپنے والد "ابراہیم بن ہاشم" سے نقل کیا ہے. ابراہیم بن ہاشم پہلے کوفہ میں رہتے تھے اور بعد میں وہ قم آگئے. وہ پہلا شخص ہے جو کوفہ میں شیعوں کے ہاں قابل قبول روایات قم میں لایا ہے اور اس کی ترویج کی ہے. قم والوں نے بھی ان روایات کو عقیدت کے ساتھ قبول کرلیا ہے.

ابراہیم بن ہاشم نے جو طبقہ ہفتم کے راوی ہیں، "ابن ابی عمیرؒ" سے یہ روایت کی ہے. ابن ابی عمیرؒ طبقہ ششم کے راوی اور اصحاب اجماع کے بزرگوں میں سے ایک ہیں (۱) لہذا یہاں تک روایت کی سند درست ہے.

تفسیر علی بن ابراہیمؒ میں سند کو جاری رکھتے ہوئے اس طرح نقل کیا ہے کہ: " عن عثمان بن عیسیٰ وحماد بن عثمان..." عثمان بن عیسیٰ، مذہب کے اعتبار سے واقفی اور طبقہ ششم کا راوی ہے جو ابن ابی عمیرؒ کے ساتھ راویوں کے طبقے میں شریک ہے. علم رجال کے علماء کا کہنا ہے کہ اس نے حضرت امام کاظم (ع) اور امام رضا (ع) سے روایات نقل کی ہیں اور یہ فرقہ واقفیہ کے بزرگوں میں سے تھے (۲).

۱۔ حدیث کے راویوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کے بارے میں علماء رجال کا کہنا ہے کہ اگر کسی حدیث کی سند ان اشخاص تک درست ہو تو ان کے بعد معصوم تک کے درمیان میں جتنے بھی راوی ہوں وہ قابل اعتماد ہیں. اگرچہ وہ راوی ہمارے لئے مجہول ہی کیوں نہ ہوں. اس قسم کے اشخاص کو علم رجال کی اصطلاح میں "اصحاب اجماع" کہا جاتا ہے. البتہ بعض کا کہنا ہے کہ "اصحاب اجماع" کا مطلب یہ ہے کہ یہی افراد خود قابل اعتماد ہیں لیکن ان افراد اور معصومؑ کے درمیان جو وسائط ہیں ان کا بھی قابل اعتماد ہونا مقصود نہیں ہے. بہرصورت "اصحاب اجماع" ۱۸ افراد ہیں کہ علم رجال کی کتابوں میں ان کے نام موجود ہیں.

۲۔ واقفیہ وہ لوگ ہیں جو امام موسیٰ کاظمؑ تک، اماموں کو مانتے ہیں اور ساتویں امام کے بعد ائمہؑ کی امامت کو قبول نہیں کرتے.

اس کے باوجود علماء رجال کا کہنا ہے کہ عثمان بن عیسیٰ موثق (۱) ہے اور اس کی روایت قابل قبول ہے۔

(فرقہ واقفیہ کا پس منظر :)

علی بن ابی حمزہ بطائنی، زیاد قندی اور عثمان بن عیسیٰ، حضرت امام موسی بن جعفر علیہما السلام کے وکیل تھے جب امام کاظم علیہ السلام شہید ہوئے تو ان کے پاس۔ امامؑ سے مربوط۔ کافی رقم موجود تھی، ان تینوں افراد نے چاہا کہ یہ بھاری رقم امام رضا علیہ السلام کے حوالے نہ کریں لہذا یہ کہنے لگے کہ حضرت امام کاظمؑ شہید نہیں ہوئے ہیں بلکہ وہ پردۂ غیب میں موجود ہیں اور وہ دوبارہ ظہور کریں گے۔ اس طرح انہوں نے وہ رقم ہڑپ کرلی۔

یہاں جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ: صرف اسی ایک روایت کے علاوہ ایسی کوئی اور روایت دکھائی نہیں دیتی جو اس (عثمان بن عیسیٰ) نے امام صادقؑ سے نقل کی ہو۔ در اصل یہاں ایک مشکل ہے اور وہ یہ کہ: یہ شخص طبقہ ششم کا راوی ہے جبکہ امام صادقؑ سے روایت نقل کرنے والے راوی کو طبقہ پنجم کا راوی ہونا چاہیے۔۔ اگر عثمان بن عیسیٰ کے واقفی ہونے کو نظر انداز بھی کردیں تو دوسری مشکل یہی ہے کہ وہ طبقہ ششم کے راوی ہیں جو امام صادقؑ کے ہم عصر نہیں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ ہم عصر نہیں تو اس نے کس طرح امامؑ سے یہ روایت نقل کی ہے؟۔۔

۔۔اب آئیں۔۔ حماد بن عثمان کی طرف۔ چونکہ تفسیر علی بن ابراہیمؒ میں اس طرح منقول ہے کہ: "... عن عثمان بن عیسیٰ و حماد بن عثمان..." ۔۔یہ شخص ذو طبقتین ہے یعنی اس کا شمار دونوں طبقہ کے راویوں میں سے ہوتا ہے اور یہ امام صادق اور امام کاظم علیہما السلام دونوں سے روایت نقل کرسکتا ہے۔

بہر صورت یہ احتمال درست نظر آتا ہے کہ اصل میں عبارت کچھ اس طرح ہو کہ: "عن عثمان بن

۱۔ موثق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے امور سے قطع نظر، حدیث نقل کرنے میں راوی امانت داری سے کام لیتا ہو اور جھوٹ نہ بولتا ہو۔

عیسیٰ عن حماد بن عثمان عن ابی عبداللہؑ" یعنی، عثمان بن عیسیٰ نے حماد بن عثمان سے اور اس نے ابی عبداللہ امام صادقؑ سے روایت نقل کی ہو۔ اگر ہم اس طرح کہیں تو سند درست ہوتی ہے کہ طبقہ ششم کے عثمان بن عیسیٰ نے روایت طبقہ پنجم کے راوی حماد بن عثمان سے سنی اور اس نے امام صادقؑ سے۔ لہذا متن میں جو آیا ہے کہ" عن عثمان بن عیسیٰ و حماد بن عثمان " یعنی عثمان بن عیسیٰ اور حماد بن عثمان دونوں نے امام صادقؑ سے یہ روایت نقل کی ہے، درست نظر نہیں آتا۔ بلکہ بات وہی درست ہے جو اس سلسلے میں ابھی ہم نے بیان کی ہے۔

بہر صورت روایت کی سند درست ہے، کیونکہ روایت کو علی ابن ابراہیمؒ نے اپنے والد ابراہیم بن ہاشمؒ سے اس نے ابن ابی عمیرؒ اس نے حماد بن عثمان اور اس نے امام صادقؑ سے نقل کی ہے۔ پس عثمان بن عیسیٰ، سند میں موجود ہو یا نہ ہو روایت کی سند میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ ابن ابی عمیر طبقہ ششم کا راوی ہے اس نے طبقہ پنجم کے حماد بن عثمان سے بھی روایت نقل کی ہے۔ لہذا سند کو عثمان بن عیسیٰ۔ کے ہونے یا نہ ہونے۔ کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے۔

اس روایت کو معمولی سے فرق کے ساتھ "احتجاج طبرسی" اور "تفسیر علی بن ابراہیم قمی" دونوں نے نقل کیا ہے۔ ممکن ہے یہ روایت احتجاج طبرسی میں تفسیر علی بن ابراہیم سے نقل ہوئی ہو یا شاید کسی دوسری کتاب سے نقل کی ہو اور یہ معمولی سا فرق نسخوں کے باہمی اختلاف کا نتیجہ ہو، لیکن دونوں کتابوں میں روایت کے اکثر مطالب یکساں ہیں۔

صادق آل محمد علیہ السلام فرماتے ھیں:

" عن ابی عبداللہؑ قال:

لمّا بویع ابوبکر واستقام له الامر علیٰ جمیع المهاجرین والانصار "

(امام صادقؑ نے فرمایا کہ:

جب ابوبکر کی بیعت ہو چکی اور تمام مہاجرین وانصار پر اس کی حکومت کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں)

"امر" عموماً حکومت کے لئے بولا جاتا ہے۔ ذیل کی قرآنی آیت میں بھی "امر" سے حکومت مراد ہے کہ: " وشاورھم فی الامر (۱) " اور حضرت علیؑ کے اس کلام میں بھی "امر" سے مراد حکومت ہے کہ: " فلما نھضت بالامر نکثت طائفۃ ومرقت اخریٰ (۲) " (جب میں نے حکومت سنبھالی تو ایک گروہ نے بیعت توڑی تو دوسرا دین سے خارج ہوگیا)۔

امام صادقؑ بھی یہاں فرماتے ہیں کہ: جب ابوبکر کی بیعت ہوچکی اور "امر" یعنی حکومتی امور اس کے لئے مستحکم ہوگئے اور جب تمام مسلمانوں پر اس کی حکومت قائم ہوگئی تو:

" بعث الیٰ فدک من اخرج وکیل فاطمۃ بنت رسول اللہ (ص) منھا "

(اس نے ایک شخص کو فدک روانہ کیا تاکہ وہ حضرت فاطمہ (ع) کے نمائندے کو وہاں سے نکال دے)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فدک میں حضرت فاطمہؑ کی طرف سے نمائندے متعین تھے اور اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ رسول مقبول (ص) کی حیات طیبہ سے ہی فدک حضرت فاطمہؑ کے اختیار میں تھا۔ ورنہ یہ بعید ہے کہ رسول خدا (ص) کی وفات کے بعد ان بحرانی شرائط اور مشکل حالات میں اتنی جلدی۔ دس دن کے اندر اندر۔ وہاں کوئی وکیل یا نمائندہ بھیجا گیا ہو (۳)۔

فدک حجاز میں ایک باغ اور بستی کا نام ہے جو مدینہ سے تین روز کے فاصلے یعنی تین منزل۔ تقریباً ۲۴ فرسخ۔ کی مسافت پر واقع تھا۔ البتہ بعض روایت کے مطابق وہاں ایک چشمہ بھی تھا جہاں سے پانی نکلتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ: ابوبکر جو خلیفہ مسلمین بن چکا ہے اور بظاہر تمام امور اس کے کنٹرول میں ہیں

۱۔ سورۂ آل عمران / ۱۵۹ (یعنی۔ اے ہمارے حبیب۔ حکومت کے امور میں ان سے مشورہ کیا کر)۔

۲۔ نہج البلاغہ خطبہ ۳ خطبہ شقشقیہ۔

۳۔ اسی روایت میں دو مورد پر حضرت امیرالمؤمنینؑ فدک کے بارے میں ابوبکر سے احتجاج کرتے ہوئے تصریح فرماتے ہیں کہ پیغمبر خداؐ نے اپنی زندگی میں فدک کو حضرت زہراءؑ کی ملکیت قرار دیا تھا اسی طرح حضرت زہراءؑ نے ابوبکر کے ساتھ اپنی گفتگو میں بھی فرمایا تھا کہ "وقد جعلھا لی رسول اللہ (ص)" اس جملے کا مطلب بھی یہی ہے کہ رسول خداؐ نے اپنی زندگی میں فدک آپؑ کو بخشا تھا۔ مسجد میں آپؑ کے خطبہ میں بھی "نحلۃ ابی" کا لفظ مذکور ہے کہ جس کا معنی "میرے بابا کی بخشش اور ہبہ" ہے۔

اچانک اس نے یہ کیسے سوچا کہ حضرت زہراءؑ سے فدک کو غصب کرلیا جائے ؟ البتہ اس سوال کا جواب واضح ہے کہ: حضرت علیؑ اور امامت کے گھرانے کے لئے فدک در آمد کا ایک اہم ترین ذریعہ تھا اور جب تک ان کے ہاتھ میں در آمد کا یہ ذریعہ ہوگا، بعض لوگ ان سے وابستہ رہیں گے اور یہ بھی ممکن تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حکومت کے لئے خطرہ بن جائے. ابوبکر اور عمر بھی یہ چاہتے تھے کہ حضرت علیؑ اور حضرت زہراءؑ کے مقام کو معاشرے میں ممکنہ حد تک کم کردیا جائے اور ان کو کمزور کردیا جائے تاکہ وہ کبھی بھی حکومت کے خلاف مبارزہ کرنے کی طاقت اور قدرت پیدا نہ کریں. یہ وہ سبب تھا کہ جس کی بناپر ابوبکر خلافت پر قابض ہونے ۔ اور مدینے میں بیعت مہم کو سر کرنے ۔ کے بعد فوراً فدک کی طرف اپنے ہرکارے بھیج دیتا ہے تاکہ فدک سے حضرت زہراءؑ کے اہل کاروں کو نکال دیا جائے. " بعث الی فدک من اخرج وکیل فاطمة بنت رسول اللّٰہ (ص) منہا".

" منہا " میں " ھاء " مؤنث کی ضمیر ہے یہاں پہ ضمیر اس لئے ذکر ہوئی ہے کہ اس کا مرجع قریہ ہے ۔ یعنی فدک کی بستی ۔ قریہ چونکہ عربی میں مؤنث مجازی ہے اس لئے ضمیر بھی مؤنث ہی کی لائی گئی ہے.

ابوبکر سے حضرت زھراء (ع) کا احتجاج:

" فجاءت فاطمة الزھراء (ع) الی ابی بکر "

(پس حضرت فاطمہ زہراء (ع) ابوبکر کے پاس آئیں)

" ثم قالت، لِمَ تمنعنی میراثی من ابی رسول اللّٰہ (ص) واخرجت وکیلی من فدک ؟ "

(اور فرمایا کہ: ۔ اے ابوبکر! ۔ مجھے میرے بابا رسول خدا (ص) کی میراث سے کیوں محروم کیا ہے اور فدک سے میرے نمائندے کو کیوں نکال باہر کیا ہے ؟)

حضرت فاطمہؑ بیان فرماتی ہیں " میراثی " اور فدک کو میراث سے تعبیر فرماتی ہیں جبکہ بعد والے فقرے میں فرماتی ہیں کہ: " وقد جعلھا لی رسول اللّٰہ (ص) بامر اللّٰہ تعالیٰ " یعنی خداوند کے حکم سے رسول اکرم (ع) نے فدک کو میری ملکیت قرار دیا تھا ۔ اس طرح ان دو فقروں میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے ۔

کیونکہ رسول خدا (ص) کی رحلت کے بعد ملنے والی چیز ارث ہے جبکہ آپ فرماتی ہیں کہ: رسول خدا (ص) کی زندگی میں ہی خدا کے حکم سے مجھے فدک دیا گیا تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ: یہاں میراث سے، اصطلاحی میراث مراد نہیں جو کسی کی وفات کے بعد اس کے ورثہ کو منتقل ہوتی ہے، بلکہ یہاں میراث اپنے کلی اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوئی ہے جس کے مطابق ہر اس چیز کو میراث کہا جاتا ہے جو باپ، دادا سے انسان کو ملے، چاہے ان کی زندگی میں یا وفات کے بعد، اور اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ فلاں کو ہوشیاری اور ذہانت اپنے باپ سے وراثت میں ملی ہے، حالانکہ یہ وراثت اس کو باپ کی زندگی میں ہی ملی ہے۔

"وقد جعلھا لی رسول اللّٰہ (ص) بامر اللّٰہ تعالیٰ"

(حالانکہ رسول خدا (ص) نے خدائے بزرگ و برتر کے حکم سے فدک کو میری ملکیت قرار دیا تھا)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ارث سے اصطلاحی ارث مراد نہیں کیونکہ حضرت زہراء کوئی ۔العیاذ باللہ۔ غلط اور بیہودہ بات نہیں فرما سکتیں بنابریں اگرچہ والد گرامی کی زندگی میں ہی کیوں نہ ملا ہو، اسے ارث کہا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت فاطمہ نے صراحت کے ساتھ فرمایا کہ: در اصل خدا کے حکم اور رحمۃ للعالمین (ص) کے توسط سے فدک مجھے دیا جا چکا تھا۔ فریقین نے بہت ساری روایات نقل کی ہیں کہ جب " فآت ذا القربیٰ حقہ " والی آیت نازل ہوئی تو رسول مقبول (ص) نے جبریل سے وضاحت چاہی کہ "ذا القربیٰ" سے مراد کون ہیں؟ اور جبریل نے جواب میں کہا کہ اس سے مراد حضرت زہراء ہیں اور آنحضرت (ص) نے حضرت فاطمہ کو بلا کر فدک ان کے حوالے کر دیا[1]۔

۱۔ تفسیر در المنثور میں آیا ہے کہ، "بزاز، ابو یعلی، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے ابی سعید خدری سے نقل کیا ہے کہ، "جب سورۂ اسراء کی آیت ۲۶ نازل ہوئی تو رسول خدا نے فدک حضرت زہراء کو بخشا"۔ اسی واقعے کو ابن مردویہ نے ابن عباس سے بھی نقل کیا ہے۔ مذکورہ آیت کے بارے میں جبریل سے وضاحت طلب کرنے کا واقعہ، کتاب وسائل الشیعہ میں انفال باب ۱ حدیث ۵، کافی ج ۱ ص ۵۴۳ حدیث ۵ میں بھی مذکور ہے۔ بحار الانوار طبع قدیم ج ۸ ص ۹۳ میں بھی اس آیہ شریفہ کی تفسیر میں متعدد سندوں کے ذریعے بہت ساری روایات نقل ہوئی ہیں۔

فدک، امامت کی نشانی:

آپ بارہا مجھ سے یہ سن چکے ہیں کہ کمیونسٹ اور بعض دوسرے لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ فدک کی بڑی آمدنی تھی اور پیغمبر اکرم (ص) مسلمانوں کے بیت المال میں بڑی احتیاط سے تصرف فرماتے تھے اور بارہا اپنے اہل بیتؑ کو سادہ زیستی کی سفارش فرمائی تھی، تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ رسول خدا (ص) فدک جیسی کثیر آمدنی والی بستی، حضرت زہراءؑ کو دے دیں جبکہ مہاجرین اور انصار کی اکثریت اور اصحاب صفہؓ اور دوسروں کی معاشی حالت بہت ہی خراب تھی؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فدک کا امامت کے مسئلے کے ساتھ گہرا ربط تھا، اس طرح کہ جب رسول خدا (ص) نے مولا علیؑ کو اپنا جانشین بنایا تو آپ (ص) یہ بھی چاہتے تھے کہ خاندان امامت کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ بھی ہونا چاہیے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگر فدک جیسے آمدنی کے ذریعے کو حضرت علیؑ کے حوالے کردیں تو ان سے بہ آسانی غصب کیا جاسکتا تھا لیکن اگر اسے فاطمہؑ کو دے دیں تو پیغمبر (ص) کی اکلوتی بیٹی سے چھینتے ہوئے انہیں شرم آئے گی! اگر۔ بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔ چھین بھی لیں تو ان کی حقیقت کا پول کھل جائے گا کہ کس طرح ان لوگوں نے یادگار رسالت (ص) کے حق میں جسارت کی ہے اور ان کا پاس نہیں رکھا ہے!۔ پس رسول خدا (ص) کی یہ پالیسی تھی کہ فدک، حضرت زہراءؑ کو دیں اور اس طرح آپ (ص) چاہتے تھے کہ حضرت علیؑ اور حضرت زہراءؑ خالی ہاتھ نہ رہیں اور امامت کا گھرانہ محتاج نہ رہے۔ در اصل حضرت فاطمہؑ امامت وولایت کے محور کے طور پر ایسے مقام پر تھیں کہ ان کو فدک بخشنے کا مطلب یہ تھا کہ گویا یہ امامت وولایت کو بخشا گیا ہے۔ ہمارے اس موقف کی (فدک کے امامت کے ساتھ گہرے ربط ہونے کی) تائید میں بہت سی صحیح اور معتبر روایات موجود ہیں، منجملہ یہ روایت کہ: "ایک دن ہارون الرشید نے امام موسی کاظمؑ سے عرض کیا کہ: آپؑ فدک کے حدود اربعہ کو معین کریں تاکہ اسے واپس کیا جائے! آپؑ نے پہلے اس بات کو قبول نہیں فرمایا چونکہ آپؑ جانتے تھے کہ اگر فدک کے حدود اربعہ کا تعین کریں تو وہ اسے واپس نہیں کرے گا، لیکن ہارون الرشید نے کافی اصرار کیا تو آپؑ نے اس وقت کی اسلامی ریاست کے حدود اربعہ کو فدک

کے حدود اربعہ کے عنوان سے معین فرمایا، تو ہارون کہنے لگا کہ: واہ! معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ ۔ فدک کے عنوان سے ۔ خلافت طلب کر رہے ہیں (۱)"۔

خلاصہ یہ کہ یہ سارے قرائن اس بات پر گواہ ہیں کہ فدک کا مسئلہ صرف ایک مالی اور معاشی مسئلہ نہیں تھا بلکہ ایک اہم اور سیاسی مسئلہ تھا جو امامت اور حضرت امیر المؤمنینؑ کی خلافت کے ساتھ گہرا ربطہ رکھتا تھا (۲)۔

۱۔ مناقب ج ۴ ص ۴۳۵۔

۲۔ چند ضروری نکات کی یاد دہانی:

۱/۔ کتاب شریف سفینۃ البحار میں ج ۲ ص ۳۵۱ پر فدک کے عنوان کے ذیل میں لکھا ہے کہ: "ایک روایت کے مطابق فدک کی سالانہ آمدنی ۲۴ ہزار دینار اور دوسری روایت کے مطابق ۷۰ ہزار دینار تھی۔

۲/۔ مجمع البحرین میں بھی فدک کے حدود اربعہ کے بارے میں حضرت علیؑ سے ایک روایت نقل ہوئی ہے جہاں فدک کا حدود اربعہ اس طرح معین ہوا ہے: ایک طرف احد کی پہاڑی، دوسری حد، عریش مصر ہے کہ جو احتمالاً سینا کے علاقے میں مصر کے ایک شہر کا نام تھا، تیسری حد سیف البحر، بحر احمر یا بحر خزر اور آرمینیا ہے، چوتھی حد دومۃ الجندل ہے کہ احتمالاً جو کوفہ اور شام کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے جہاں حکمیت کا واقعہ بھی رونما ہوا تھا۔

۳/۔ علامہ مجلسیؒ بحار الانوار میں طبع قدیم ج ۸ ص ۱۰۸ پر اس اشکال کا جواب دیتے ہیں کہ: "حضرت زہراءؑ اتنے زہد اور دنیا سے بے رغبتی کے باوجود آخر فدک کے بارے میں اس قدر اصرار کیوں فرماتی تھیں؟ یہاں تک کہ آپؑ مسجد میں ایک بھرے مجمع سے خطاب بھی فرماتی ہیں۔ یعنی آپؑ کے زہد اور اس اقدام میں تضاد ہے اگر تضاد نہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟۔ علامہ مجلسیؒ اس سوال کا جواب اس طرح دیتے ہیں کہ: فدک صرف حضرت زہراءؑ کی ملکیت نہیں تھا بلکہ ان کی اولاد۔ ائمہ اطہارؑ۔ سے متعلق تھا اور یقیناً ایک ایسی چیز میں کوتاہی اور سہل انگاری جو تمام اہل بیتؑ سے مربوط ہو جائز نہ تھی، کیونکہ اگر سہل انگاری اور کوتاہی فرماتیں تو ان کے حقوق پامال ہوتے..."۔

۴/۔ ابن ابی الحدید نے بھی "علی بن تقی" نامی ایک شیعہ عالم دین سے یہ کلام نقل کیا ہے کہ: "حضرت فاطمہؑ سے فدک غصب کرنے کی صرف ایک ہی وجہ تھی اور وہ یہ ہے کہ ابوبکر اور عمر نہیں چاہتے تھے کہ حضرت علیؑ فدک کی آمدنی کو ان کی خلافت وحاکمیت کے خلاف جہاد و مبارزہ میں خرچ کریں" (احتجاج، مطبع نشر مرتضی ج ۱ ص ۹۱)۔

اسی سلسلے میں شہید صدرؒ نے اپنی کتاب فدک ص ۴۷ پر ابن ابی الحدید سے اس کی شرح نہج البلاغہ ج ۴ ص ۸۰ سے یہ بات نقل کی ہے کہ: "اگرچہ حضرت زہراءؑ نے ابوبکر کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ فدک کی آمدنی کو ہم تمام مسلمین کی مصلحت اور منفعت عامہ پہ خرچ کریں گے لیکن ابوبکر مطمئن نہیں تھا اور ڈرتا تھا کہ کہیں فدک کی آمدنی ان کی حکومت کے خلاف استعمال نہ ہو"۔

== اسی طرح ابن ابی الحدید نہج البلاغہ پر اپنی شرح کی ج ۱۶ ص ۲۸۴ پر رقمطراز ہے کہ: "بغداد کے مدرسہ عربیہ کے ایک معلم اور خود میرے اپنے استاد "علی بن الفارقی" سے میں نے پوچھا کہ: آپ کے نزدیک، فدک کے بارے میں حضرت فاطمہؑ کا دعویٰ صحیح تھا یا نہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ: ہاں فاطمہؑ اپنے دعویٰ میں سچی تھیں. میں نے پوچھا کہ: پھر ابوبکر نے فدک کو انہیں واپس کیوں نہیں کیا؟ میرے جواب میں مسکراتے ہوئے انہوں نے ایک باریک نکتہ بتایا کہ: اگر اس دن ابوبکر فدک کو واپس دے دیتا تو دوسرے دن حضرت زہراءؑ آئیں اور خلافت کے واپس کرنے کا دعویٰ بھی کرتیں تو اس صورت میں ابوبکر کے پاس کوئی عذر اور دلیل نہ ہوتی۔ کہ خلافت سے دست بردار نہ ہو، کیونکہ فدک کے بارے میں وہ حضرت زہراءؑ کی صداقت و سچائی کو قبول کر چکے ہوتے۔ لہٰذا خلافت کے مسئلے میں بھی ان کی بات حجت ہوتی اور انہیں ماننا پڑتا تھا۔

ابن ابی الحدید کہتا ہے کہ استاد کی یہ بات درست اور حقیقت پر مبنی ہے اگرچہ انہوں نے اسے مزاحیہ انداز میں بتایا تھا۔

۵/۔ اس بارے میں کہ فدک کا مسئلہ ایک اہم سیاسی مسئلہ تھا، شہید صدر طاب ثراہ اپنی کتاب "فدک" کے صفحہ ۴۹ پر لکھتے ہیں کہ: "حضرت زہراءؑ کا فدک کے مسئلے کو اہمیت دے کر اس بارے میں جدوجہد کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ در اصل فدک کا مسئلہ، اسلام اور کفر، ایمان اور منافقت نیز نص اور شوریٰ کے درمیان محاذ آرائی کا کرشمہ تھا"۔

اور اسی کتاب کے صفحہ ۴۳ اور ۴۸ پر انہوں نے "فدک کو ایک عظیم مقصد اور ہمہ گیر انقلاب کی علامت اور رمز کے طور پر متعارف کرایا ہے اور ایسا ہمہ گیر انقلاب اور وہ بھی ایسی حکومت کے خلاف جس کی بنیاد سقیفہ میں ابوبکر، عمر اور ابوعبیدہ جراح کی تین نفری پارٹی نے رکھی تھی اور صفحہ ۵۰ پر فرماتے ہیں کہ "اگر حضرت زہراءؑ کا مقصد یہ ہوتا کہ میراث یا ہبہ کے عنوان سے زمین کے ایک ٹکڑے کو حاصل کیا جائے تو گواہی کے نصاب کو مکمل کرنے کے لئے آپؑ حضرت علیؑ کے طرفدار اور شیعوں میں سے مطلوبہ افراد پیدا کر سکتے تھے لیکن آپؑ کا مقصد کچھ اور تھا"۔

اسی بنا پر آپ نے اپنی کتاب کے ص ۸۷ پر تاکید کی ہے کہ "حضرت فاطمہؑ نے حکومت کے خلاف جو تحریک چلائی، وہ چھ مرحلوں پر مشتمل تھی:

۱)۔ ابوبکر کے پاس اپنا نمائندہ بھیجنا تاکہ فدک سمیت اپنی میراث کا مطالبہ کریں اور ہبہ کے طور پر دعویٰ دائر کرنے سے قبل ارث کے عنوان سے مطالبہ فرمایا۔

۲)۔ آپؑ کا اس مسئلے میں خود بلاواسطہ دخالت کرنا اور ابوبکر کے ساتھ سخت لہجے سے بات کرنا۔

۳)۔ رسول خداؐ کی رحلت کے دسویں دن مسجد نبویؐ میں معروف خطبہ دینا۔

۴)۔ انصار اور مہاجرین کی عورتوں سے خطاب کرنا۔

۵)۔ بستر شہادت پر ابوبکر اور عمر سے غضبناک لہجہ میں گفتگو کرنا. جب وہ آپؑ کی عیادت اور آپؑ سے عذر خواہی کے لئے آئے تھے تو آپؑ نے اپنی ناراضگی اور غم اور غصہ سے انہیں آگاہ فرمایا۔ ==

۴۔ آپؑ کی یہ وصیت کہ شہادت کے بعد۔ تجہیز و تکفین و تدفین میں۔ مخالفین کو شرکت کی اجازت نہ دینا اور یہ کہ آپؑ ان کی شرکت کرنے پر راضی نہیں ہیں۔

اس تحریک کا آغاز حضرت علیؑ کے بجائے حضرت زہراءؑ نے فرمایا۔ اس امر کی علت بیان کرتے ہوئے شہید صدرؒ اپنی کتاب "فدک" کے ص ۸۶ پر یوں فرماتے ہیں کہ: "حضرت زہراءؑ نے جو اس قیام کا آغاز فرمایا اس کے بنیادی طور پر دو مثبت اور اہم عنصر تھے، ایک اس تحریک کے احساسات اور جذبات سے مربوط عنصر تھا کیونکہ آپؑ پیغمبرؐ کی یادگار اور اکلوتی بیٹی ہونے کے لحاظ سے لوگوں کے احساسات وجذبات کو بہتر اور بیشتر بیدار کر سکتی تھیں اور ذہنوں میں رسول خداؐ کے دور کی یاد تازہ کرنے میں بڑا کردار ادا کر سکتی تھیں اور دوسرا عنصر، اس واقعے کا سیاسی پہلو تھا کیونکہ اگر حضرت زہراءؑ کے بجائے حضرت علیؑ سامنے آتے اور تحریک چلاتے تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ مسلمان خانہ جنگی کا شکار ہو جائیں اور حکومت وقت سے مقابلہ کرنے میں مسلحانہ جہاد شروع ہو جائے اس طرح داخلی خلفشار کا شکار ہو کر مسلمانوں کا شیرازہ بکھر جائے"۔

حضرت علیؑ نے مسند خلافت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد فدک کے مسئلے کو نہیں چھیڑا، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فدک کے نام پر جو تحریک چلی تھی وہ اس لئے تھی کہ حکومت اور اقتدار کو اس کے صحیح حقدار تک منتقل کیا جائے جب اقتدار اور حکومت اپنی حقیقی منزل پر پہنچ جائیں تو اس سلسلے میں مزید تحریک چلانا بے معنی نظر آتا ہے۔

۴۔ ایک سوال یہ بھی اٹھایا جاتا ہے کہ جب امیر المؤمنینؑ کو خلافت ملی تو آپؑ نے فدک، اہل بیتؑ کو واپس کیوں نہیں کیا حالانکہ عمر بن عبد العزیز اور مامون جیسے خلفاء نے فدک بنی ہاشم کو واپس کر دیا تھا؟

اس سوال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

۱۔ قاضی القضاۃ نے "کتاب مغنی" میں کہا ہے کہ "حضرت علیؑ کے اپنے دور حکومت میں فدک کو واپس نہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ نے ابوبکر کے سامنے حضرت فاطمہؑ کے احتجاج میں گواہی نہیں دی تھی۔ اگر وہاں پر گواہی دی ہوتی تو آپ پر لازم ہوتا کہ اپنے علم پر عمل کرتے ہوئے بعد میں فدک کو واپس لیں۔ (شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱۶ ص ۲۷۰)۔

لیکن شیعہ اور سنی منابع و ماخذ کے مطابق قاضی القضاۃ کا یہ دعویٰ باطل ہے کیونکہ ان منابع و مآخذ میں حضرت علیؑ اور ام ایمن کی گواہی کا ذکر موجود ہے جو انہوں نے حضرت زہراءؑ کے حق میں دی تھی اور یہ قابل انکار نہیں ہے۔

۲۔ علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار طبع قدیم ج ۸ ص ۱۴۱ پر ایک مستقل باب میں اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور اس باب کی ابتداء میں ایسی روایات کو نقل کیا ہے کہ جو امیر المؤمنینؑ کے دور حکومت میں فدک دوبارہ واپس نہ لینے کی وجوہات بیان کرتی ہیں۔ بعض روایات میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ "چونکہ خدا نے ظالم اور مظلوم کو اپنے اعمال کا بدلہ دیا ہے لہذا حضرت علیؑ نے فدک کے بارے میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہا..."

بعض دوسری روایات میں آیا ہے کہ "ائمہ طاہرینؑ، عوام کے حقوق کے لئے قیام فرماتے ہیں لیکن اپنے ذاتی حقوق کے لئے کوشش نہیں فرماتے"۔ اس کے بعد علامہ مجلسیؒ قاضی القضاۃ کا یہ کلام نقل فرماتے ہیں کہ "شیعوں کے نزدیک امیر المؤمنینؑ کے فدک واپس نہ لینے کی وجہ شاید تقیہ ہو" اور پھر اس نے تقیہ اور اس مقام پر تقیہ کے امکان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ==

فدک اور امّ ایمن کی گواهی:

جیسا کہ پہلے ذکر کیا ہے کہ حضرت زہراء(ع) نے ابوبکر سے فرمایا کہ: "خدا کے حکم سے میرے بابا نے مجھے جو چیز بخشی تھی اسے تم نے مجھ سے کیوں چھینا ہے؟"

حضرت زہراء(ع) کے اس اعتراض کے جواب میں ابوبکر کہنے لگا کہ:

لیکن اس مورد میں تقیہ کا احتمال بہت بعید ہے، کیونکہ امیر المؤمنین کے دور حکومت میں معاویہ کے علاوہ کوئی قابل توجہ طاقت موجود نہ تھی سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ چونکہ ابوبکر اور عمر کا فدک کے غصب میں ہاتھ تھا اور آپ اسی میں مصلحت دیکھتے تھے کہ ابوبکر اور عمر نے جو امور طے کئے تھے ان میں سے بعض میں ان کی مخالفت نہ کی جائے۔ اسی بناپر آپ نے ان کے بہت سارے احکام اور پالیسیوں کو نہیں بدلا۔ کتاب "شافی" میں مرحوم سید مرتضیٰ نے فدک واپس نہ لینے کی علت، اسی امر کو قرار دیا ہے۔

۳۔ تیسرا احتمال یہ ہے جو شہید صدر اور علامہ مجلسی اور استاد معظم (آیت اللہ منتظری مدظلہ) کے فدک کے بارے میں نظریے سے معلوم ہوتا ہے کہ فدک اہل بیت سے مربوط تھا اور رسول خدا نے حضرت زہراء کو فدک اس لئے عنایت فرمایا تھا کہ اہل بیت خالی ہاتھ نہ رہیں اور خلافت و امامت کے مسئلے میں اہل بیت کی معاشی حالت مستحکم ہوجائے اور فدک کی آمدنی کے ذریعے سے اہل بیت اپنے حق کو حاصل کرنے کی راہ میں پائیداری کے ساتھ مقاومت کر سکیں۔ بنابریں جب حضرت امیر المؤمنین کے ہاتھوں خلافت آگئی تو فدک کے مسئلے کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہ تھی۔ پہلے فدک کے مسئلے کو اس لئے اٹھایا تھا کہ اس کے ذریعے امامت و خلافت کو بھی اپنے اصل مقام تک لایا جائے اور جب خلافت اور قیادت آپ کی چوکھٹ پر آگئی تو فدک کا مسئلہ اٹھانے کی کوئی وجہ ہی نہیں رہی تھی۔

۔ خلاصہ یہ کہ امیرالمؤمنین نے اپنے دور حکومت میں فدک کو واپس کیوں نہ نہیں لیا؟ اس سوال کے جواب میں ذیل کی چند وجوہات بیان کی گئی ہیں:

۱۔ قاضی القضاۃ نے کہا کہ فدک اہل بیت کا حق نہ تھا بلکہ ابوبکر کا موقف صحیح تھا۔

۲۔ ظلم وستم کے ذریعے چھینا گیا تھا لہذا اس کا حساب خدا پر چھوڑ دیا گیا ہے اور حضرت علی نے مداخلت نہ کی۔

۳۔ تقیہ کی وجہ سے واپس نہ لیا۔

۴۔ بعض مصلحتوں کی بناپر فدک کے مسئلے میں ابوبکر کے فیصلے کو برقرار رکھا جیسا کہ اسی بناپر خلفاء کے بعض دوسرے امور بھی برقرار رہے۔

۵۔ فدک اپنی کوئی ذاتی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ خلافت اور قیادت کے مسئلے میں احقاق حق کا ایک ذریعہ تھا اور اہل بیت کے حق رہبری کا ایک حصہ تھا جب خلافت و حکومت حضرت علی کے ہاتھ آگئی تو فدک کا اختیار بھی آپ کے ہاتھ میں تھا اور واپس کرنے کا کوئی معنی نہ تھا کیونکہ اگر واپس بھی کرتے تو بھی آپ کے اختیار میں ہوتا۔

" فقال لہا ابوبکر، ھاتِ علیٰ ذلک بشہود "

(تو ابوبکر نے آپؑ سے کہا کہ: اپنے اس دعوے پر گواہ لائیں)

اگر فدک، ترکہ پیغمبر(ص) ہوتا تو یہاں گواہی طلب کرنا ایک نامعقول سی بات تھی، جبکہ یہاں حضرت زہراءؑ نے گواہ پیش کئے۔ اور یہ نہیں فرمایا کہ ارث میں گواہ کی ضرورت نہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ارث سے یہاں اس کا اصطلاحی معنیٰ مراد نہیں ہے۔

" فجاءت بامّ ایمن "

(آپ (ع) نے ام ایمن کو گواہ کے طور پر پیش کیا)

ام ایمن، ایک کنیز تھی جو پیغمبر(ص) کو ملی تھی اور آپ(ص) نے خدا کی راہ میں اسے آزاد فرمایا تھا۔ یہ خاتون رسول خدا(ص) سے بہت عقیدت رکھتی تھی اور رسول خدا(ص) بھی اس پر بہت مہربان تھے۔ اس کا اصلی نام "برکہ" اور اس کی ماں کا نام "سلمہ" تھا۔ واقعاً ام ایمن بابرکت خاتون تھیں۔

"برکہ" (ام ایمن) نے بعد میں "عبید خزرجی" سے شادی کی اور اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام "ایمن" رکھا گیا۔ اسی مناسبت سے "برکہ" کو "ام ایمن" کہا جانے لگا۔ کچھ مدت کے بعد اس کا شوہر مرگیا اور ایک دن پیغمبر اکرم(ص) نے فرمایا کہ جو شخص ایک ایسی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے کہ جو سو فیصد اہل بہشت ہو تو وہ "ام ایمن" سے شادی کرلے۔ اس وقت "زید بن حارثہ" نے "ام ایمن" سے شادی کی اور اس شادی سے "اسامہ بن زید" پیدا ہوا۔

" ام ایمن " ایک وفا شعار خاتون تھیں۔ اسے قرآن کی کافی آیات حفظ تھیں اور وہ جنگوں میں شرکت کرنے کا شوق رکھتی تھیں اسی لئے وہ جنگ بدر اور احد میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں اور مجاہدین کو پانی پلاتی تھیں۔

مختصر یہ کہ انہوں نے اسلام کی کافی خدمت کی اور رسول خدا(ص) کے بعد حضرت امیرالمؤمنینؑ اور حضرت زہراءؑ کے وفادار عقیدت مندوں میں سے شمار ہوتی تھیں۔

حضرت زہراء(ع) نے اس عظیم خاتون کو گواہ کے لئے پیش فرمایا:

" فقالت له امّ ایمن، لا اشهد یا ابابکر حتی احتج علیک بما قال رسول اللّٰہ (ص) "

(ام ایمن نے ابوبکر سے کہا کہ: اے ابوبکر میں تیرے سامنے اس وقت تک گواہی نہیں دوں گی

جب تک کہ میں اپنے بارے میں رسول خدا (ع) کے فرمان سے احتجاج نہ کروں)

" انشدک باللّٰہ، الست تعلم ان رسول اللّٰہ (ص) قال، امّ ایمن امراۃ من اھل الجنۃ ؟ "

(اے ابوبکر تجھے خدا کی قسم! کیا تو نہیں جانتا کہ رسول خدا (ص) نے فرمایا کہ:

ام ایمن اہل بہشت خواتین میں سے ہے ؟)

" فقـال، بلـیٰ "

(تو اس نے کہا کہ: ہاں۔ جانتا ہوں۔)

دراصل ام ایمن یہ بتانا چاہتی تھیں۔ اور ساتھ ہی ابوبکر سے اس حقیقت کا اقرار لینا چاہتی تھیں۔ کہ جو شخص اہل بہشت سے ہو وہ ہرگز جھوٹ نہیں بولتا اور ابھی جو گواہی دے رہی ہوں وہ سچ اور عین حقیقت بات ہے۔

" قالت، فاشھد ان اللّٰہ عز وجل اوحیٰ الیٰ رسول اللّٰہ (ص)، " فـآت ذا القربیٰ حقـه (۱) "

فجعل فدکاً لفاطمۃ (ع) بامـر اللّٰہ تعالیٰ "

(ام ایمن نے کہا کہ: پس میں گواہی دیتی ہوں کہ بے شک خداوند بزرگ و برتر نے اپنے رسول پر وحی نازل کی کہ:

" قریبی رشتہ داروں کے حق کو ادا کر "

۔ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ تو رسول خدا (ص) نے خدا کے حکم سے فدک کو فاطمہ (ع) کی ملکیت قرار دیا)

" فجـآء علیّ (ع) فشھد بمثل ذلک "

(اس کے بعد حضرت علی (ع) تشریف لائے اور ام ایمن کی طرح گواہی دی)

یعنی، حضرت علیؑ نے بھی ام ایمن کی طرح یہ گواہی دی کہ آیہ " فآت ذا القربیٰ حقه " نازل ہوئی تو رسول خدا (ص) نے فدک حضرت زہراءؑ کو بخشا۔

۱۔ سورۂ روم / ۳۸۔

" فکتب لـهـا کتاباً ودفعه الیها "

(اس۔ گواہی۔ کے نتیجے میں ابوبکر نے حضرت زہراء (ع) کے لئے ایک تحریر لکھی اور فدک کو واپس کردیا)

مختصر یہ کہ: جب ابوبکر نے دیکھا کہ علیؑ اور ام ایمن جیسے دو عادل گواہوں نے گواہی دے دی ہے تو وہ مان گیا اور سند لکھ کر فدک کو حضرت زہراءؑ کے حوالہ کردیا.

" فدخـل عمر، فقال، ما هـذا الکتاب؟ "

(اچانک عمر داخل ہوا اور کہا کہ: یہ تحریر کیا ہے ؟)

" فقال، ان فاطمة (ع) ادّعت فی فدک وشهدت لها امّ ایمنؓ وعلیّ (ع) فکتبته لها "

(ابوبکر نے جواب میں کہا کہ: فاطمہؑ نے فدک پر دعویٰ کیا ہے اور ام ایمنؓ اور علیؑ نے گواہی دی ہے لہذا میں نے یہ سند ان کے لئے لکھی ہے۔ اور فدک کو انہیں واپس دے دیا ہے۔)

" فاخذ عمـر الکتاب من فاطمة (ع) فتفل فیه ومزّقه" وقال هذا فیء للمسلمین" "

(تو عمر نے وہ تحریر حضرت فاطمہؑ سے چھین لی اور اس پر تھوکا اور اسے پھاڑ دیا!!!

اور کہا کہ: یہ فدک۔ فیِ مسلمین ہے!! (۱))

" وقال، اوس بن الحدثان وعائشة وحفصة یشهدون علیٰ رسول اللّٰه (ص) بانه قال، انا معاشر الانبیاء لانورث وما ترکناه صدقـة (۲) "

اور اس نے کہا کہ: اوس بن حدثان، عائشہ اور حفصہ گواہی دیتے ہیں کہ رسول خدا (ص) نے فرمایا: "ہم گروہ انبیاء ارث نہیں چھوڑتے اور جو کچھ ہم چھوڑ کے جاتے ہیں وہ صدقہ ہے")

" فان علیـاً زوجها یجرّ الیٰ نفسه وامّ ایمن امـراة صالحة، لو کان معها غیرها لنظرنا فیه" (۳) "

۱۔ فیِ کا معنی صفحہ ۳۵۲ پر بیان ہوئے ہیں.

۲۔ گزشتہ دروس میں ثابت ہوچکا کہ یہ روایت جعلی اور من گھڑت ہے.

۳۔ "وقال هذا فیء للمسلمین" کی عبارت سے لے کر یہاں تک احتجاج میں ذکر نہیں ہوا ہے بلکہ روایت کا یہ حصہ تفسیر علی بن ابراہیم" میں ج ۲ ص ۱۵۵ پر مذکور ہے نیز بعد والا جملہ "فخرجت فاطمة" من عندهما باکیة حزینة" میں "عندهما" اور "حزینة" کے دو الفاظ احتجاج طبرسی میں ذکر نہیں ہوئے ہیں.

(بے شک علیؑ فاطمہؑ کا شوہر ہے وہ اپنے مفاد میں گواہی دے رہا ہے جبکہ ام ایمن ایک نیک عورت ہے اگر اس کے ساتھ کوئی دوسرا شخص گواہی دے تو ہم اس بارے میں سوچتے !!!)

" فخرجت من عندهما باكية حزينة "

(تو آپ (ع) ابوبکر اور عمر کے یہاں سے گریہ اور حزن کی حالت میں واپس ہوئیں)

" وهى تقول: مزق الله بطنك كما مزقت كتابى هذا "

(۔ آپ (ع) اس گریہ اور حزن کی حالت میں عمر سے ۔ یہ فرماتے ہوئے نکلیں کہ: جس طرح تم نے میری اس تحریر کو پھاڑا، خدا تمہارے شکم کو پھاڑے)

کئی سالوں کے بعد آپؑ کی یہ دعا مستجاب ہوئی، اس سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ ضروری نہیں دعا فوراً مستجاب ہو جائے کیونکہ کبھی مصلحت اسی میں ہوتی ہے کہ کسی خاص وقت میں دعا مستجاب ہو جائے۔

فدک اور حضرت علی(ع) کا ابوبکر کی سرزنش کرنا:

" فلما كان بعد ذلك، جاء علىّ (ع) الى ابوبكر وهو فى المسجد وحوله المهاجرون والانصار "

(اس واقعہ کے بعد:
جب حضرت علیؑ ابوبکر کے پاس آئے، حالانکہ ابوبکر مسجد میں انصار و مہاجرین کے حلقے میں بیٹھا ہوا تھا)

" فقال: يا ابابكر!

لم منعت فاطمة ميراثها من رسول الله (ص) وقد ملكته فى حياة رسول الله (ص)؟ "

(تو حضرت علیؑ نے فرمایا کہ: اے ابوبکر!
رسول خدا (ص) کی میراث سے فاطمہ (ع) کو کیوں رد کیا، حالانکہ خود رسول خدا (ص) کی زندگی میں وہ اس کی مالک تھیں؟)

یہاں حضرت علیؑ پہلے ارث کی بات کرتے ہیں لیکن بلا فاصلہ فرماتے ہیں کہ رسول خدا (ص) کی زندگی میں ہی حضرت فاطمہؑ فدک کی مالک تھیں، آپؑ کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ارث کا معنی

صرف ارث اصطلاحی نہیں بلکہ ہر وہ چیز ہے جو باپ کی طرف سے اولاد کو ملے خواہ وہ باپ کی زندگی میں ہی کیوں نہ ہو اور فدک اسی قسم کا ارث ہے یعنی رسول خدا (ص) نے خدا کے حکم سے اپنی زندگی میں حضرت زہراءؑ کو عنایت فرمایا۔ اسی لئے بعض لوگوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت فاطمہؑ نے ارث کا ذکر مجادلہ کے طور پر فرمایا ہے کہ اگر تم فدک کے ہبہ ہونے کو تسلیم نہیں کرتے ہو تو میراث کے عنوان سے بھی میرا حق بنتا ہے، کیونکہ ارث کا جو معنی ہم نے ابھی ذکر کیا ہے، ہبہ اور عطاء کے منافی نہیں ہے۔
اگر آپ کو یاد ہو تو جب ہم مسجد میں آپؑ کے خطبہ کو پڑھ رہے تھے تو وہاں ہم نے دیکھا کہ آپؑ نے ارث کے مسئلے کو کافی اہمیت دی اور اس پر زور دیا تھا اور جب واپس آئیں تو حضرت علیؑ سے فرمایا کہ: " نحلة ابى وبلغة ابنى " (یعنی میرے بابا کی بخشش اور ہبہ اور میرے بچوں کا وسیلہ معاش یہ لوگ ہم سے چھین رہے ہیں) اس طرح یہاں پر فدک کو ہبہ اور " نحلہ " سے تعبیر فرمایا۔ یہاں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زہراءؑ کے نزدیک بھی ارث ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو باپ کی طرف سے اولاد کو ملے اگرچہ ان کی زندگی میں ہی کیوں نہ ہو۔۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ۔ دراصل ارث کا معنی یہ ہے کہ: " ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہونے والی چیز، اگرچہ وہ پہلی نسل کی زندگی میں ہی کیوں نہ ملے "۔

" فقال ابو بكر، هـذا فـىء للمسلمين "

(تو ابو بکر نے جواب دیا کہ: فدک فیئ مسلمین ہے!)

یہاں ابو بکر وہی بات کر رہا ہے جو عمر نے اسے سکھائی تھی اسی لئے وہ بھی اب کہتا ہے کہ فدک فیئ مسلمین ہے ورنہ ابو بکر نے تو خود پہلے سند لکھ دی تھی اور دستخط بھی کر دیئے تھے کہ فدک حضرت زہراءؑ کا حق ہے، لیکن جب عمر نے آکر کہا کہ فدک فیئ مسلمین ہے تو اس کے بعد اب ابو بکر بھی یہی کہتا ہے!!!۔

حقیقت یہ تھی کہ ابو بکر کو عمر چلاتا تھا سقیفہ میں بھی عمر نے ہی ابو بکر کو خلیفہ بنایا تھا چونکہ وہاں خود عمر کے لئے خلافت کی راہ ہموار نہ تھی لہذا ملی بھگت کے ذریعے پہلے سقیفہ میں ابو بکر کا انتخاب عمل میں

لایا گیا، اسی لئے ابوبکر نے بعد میں عمر کو خلیفہ بنایا۔ اسی لئے حضرت امیر المؤمنینؑ خطبہ شقشقیہ میں فرماتے ہیں کہ: " لشدّ ماتشطرا ضرعیہا[1] " (ان دونوں نے حکومت کے دو تھنوں کو اپنے درمیان تقسیم کرلیا تھا)۔

بہرصورت ابوبکر ابھی یہ بتا رہا ہے کہ فدک فئ مسلمین ہے۔ "فئ" لغت میں رجوع کرنے اور پلٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب " ولایۃ الفقیہ " میں بھی بتایا ہے کہ فئ اس لئے کہا جاتا ہے کہ روی زمین کی نعمتوں کو خدا نے اپنے نیک بندوں کے لئے پیدا کیا ہے لیکن ناجائز طریقوں سے کفار کے ہاتھوں لگی ہوئی ہیں اب اگر جنگ کے ذریعے یا کفار اپنے اختیار سے وہ نعمتیں مسلمانوں کو لوٹا دیں تو گویا حق، حقدار کو مل گیا ہے اور اپنے صحیح مقام پر پلٹ آیا ہے اور قرآن میں بھی خداوند اسی معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے کہ: " وما افآء اللّٰہ علیٰ رسولہ من اھل القریٰ[2] " (وہ اموال جنہیں خدا نے بستی والوں کے مال سے اپنے رسول (ص) کی طرف لوٹایا ہے) ۔ اس آیت میں بھی یہی مقصود ہے کہ کفار و مشرکین کے پاس جو مال ہے وہ گویا ان کا نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کا ہے۔ اب جنگی غنائم یا صلح کے نتیجے میں جو مال رسول خدا (ص) کے ہاتھ لگے وہ در اصل اپنا مال تھا جو لوٹا دیا گیا ہے۔

" فان اقامت شہوداً ان رسول اللّٰہ جعلہ لہا والا فلا حق لہا فیہ "

(۔ ابوبکر نے کہا کہ یہ فئ مسلمین ہے۔

اگر فاطمہ (ع) گواہ پیش کریں کہ رسول خدا (ص) نے فدک ان کو بخشا ہے ۔ تو فدک واپس کریں گے ۔

ورنہ فدک پر فاطمہ (ع) کا کوئی حق نہیں !!)

گویا ابوبکر یہ کہنا چاہتا ہے کہ حضرت زہراء (ع) نے جو گواہ پیش کئے تھے وہ کافی نہیں ہیں یہاں پر حضرت علیؑ ابوبکر کی اس باطل سوچ کا دندان شکن جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۳۔ ۲۔ سورۂ حشر / ۷۔

ابو بکر کے مقابلے میں حضرت علی(ع) کا استدلال

" فقال امیر المؤمنین(ع)، یا ابا بکر، اتحکم فینا بخلاف حکم اللہ تعالیٰ فی المسلمین ؟"

(اس وقت حضرت امیر المؤمنین (ع) نے ابو بکر سے فرمایا کہ:

اے ابو بکر! مسلمانوں کے درمیان خدا کے حکم کے برعکس تم ہمارے بارے میں حکم کرتے ہو ؟!)

" فقال، لا " (تو اس نے کہا کہ: نہیں)

" قال، فان کان فی ید المسلمین شیی یملکونہ ثم ادّعیت انا فیہ، من تسال البیّنۃ ؟"

(حضرت امیر المؤمنین (ع) نے پوچھا کہ:

اگر کسی مسلمان کے قبضے میں کوئی چیز ہو جس کا وہ مالک ہو اور میں اس پر دعویٰ کروں،

تو تم کس سے گواہی طلب کرو گے ؟)

" قال، ایاک کنت اسئل البیّنۃ "

(ابو بکر نے کہا کہ: میں تو صرف آپؑ سے گواہی اور دلیل طلب کروں گا۔ چونکہ آپ مدعی ہیں۔)

" قال، فما بال فاطمۃ (ع) سالتہا البیّنۃ علیٰ ما فی یدیہا ؟!"

(حضرت علی (ع) نے پوچھا کہ:

تو پھر کیا وجہ ہے تم فاطمہ (ع) سے ایسی چیز کے بارے میں گواہی طلب کر رہے ہو جو ان کے قبضے میں ہے ؟!!)

" وقد ملکتہ فی حیاۃ رسول اللہ (ص) و بعدہ، و لم تسال المسلمین بیّنۃ علیٰ ما ادّعوہ شہوداً،

کما سالتنی علیٰ ما ادّعیت علیہم ؟!"

(حالانکہ پیغمبر خدا (ص) کی زندگی میں اور اس کے بعد، حضرت فاطمہ (ع) ہی فدک کی مالک تھیں اور مسلمانوں سے اپنی دعوے کے صحیح ہونے پر کیوں گواہ طلب نہیں کرتے ہو، جیسا کہ۔ جو مثال میں نے دی تھی اس کے تحت۔

تم مجھ سے میرے دعوے کی صداقت پر گواہی اور دلیل طلب کر رہے ہو ؟!!)

حضرت امیر المؤمنینؑ کے اشکال کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے گھر میں بیٹھا ہو اور میں باہر سے جا کر یہ دعوی کردوں کہ وہ گھر میرا ہے تو تم کس سے گواہی اور دلیل طلب کرو گے ؟ اس شخص سے جو ابھی

گھر میں بیٹھا ہوا ہے اور " ذو الید " ہے۔ یعنی مکان کا قبضہ اس کے پاس ہے۔ یا اس شخص سے گواہی طلب کرو گے کہ جس نے باہر سے آکر گھر پر دعویٰ کیا ہے؟ اور یہ ایک واضح سی بات ہے کہ دلیل اور گواہ مدعی سے طلب کیا جاتا ہے کیونکہ رسول خدا (ص) کا فرمان ہے کہ: " البیّنة علی المدعی والحلف علی من انکر " (مدعی گواہ پیش کرے اور مدعی علیہ قسم کھائے) یعنی مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ لائے اور دلیل قائم کرے اگر وہ گواہ لائے تو اس کی بات قبول کی جاتی ہے ورنہ مدعی علیہ پر لازم نہیں کہ وہ دلیل وگواہ پیش کرے بلکہ وہ مدعی کے دعوے کو رد کرنے کے لئے قسم کھائے تو بھی کافی ہے۔ اوپر کی مثال میں منکر وہ ہے جو گھر میں قیام پذیر ہے اور مدعی وہ شخص ہے جو اس گھر پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کر رہا ہے لہذا تم مدعی ہو اور اپنے دعوے کے اثبات کے لئے دلیل اور گواہ پیش کرو۔

ہمارے اس مسئلے میں فدک حضرت زہراء کی ملکیت میں تھا اور پیغمبر خدا (ص) کی حیات طیبہ اور آپ (ص) کی رحلت کے بعد فدک حضرت فاطمہ (ع) کے قبضے میں تھا۔ ابھی تم آکر یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ فدک مسلمانوں کی ملکیت ہے تو پس تم مدعی ہو اور۔ اسلام کے عدالتی قانون کے تحت۔ تم پر گواہ پیش کرنا واجب ہے نہ کہ حضرت فاطمہ (ع) پر کہ جو " ذو الید " ہیں اور ان کے نمائندے وہاں۔ فدک میں۔ تھے۔ جنہیں تم نے جبراً نکال دیا ہے۔ پس تم یہ جو گھر کے مالک اور " ذوالید " سے گواہ طلب کر رہے ہو تو تمہاری یہ حرکت حکم خدا کے مخالف ہے!!۔

یہاں پہنچ کر ابو بکر شکست کھا گیا اور حضرت علی (ع) کو کوئی جواب نہ دے سکا (۱)۔

۱۔ ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں ج ۱۶ ص ۲۸۵ پر قاضی القضاۃ سے ایک مطلب نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ۔ " اگر فدک حضرت زہراء کے تصرف میں تھا تو ابو بکر کے پاس آپ نے " دلیل ید " سے استدلال کیوں نہیں فرمایا اور۔ " دلیل ید " جیسی ٹھوس اور ناقابل خدشہ دلیل کو چھوڑ کر۔ ارث کا دعویٰ فرمایا؟ اگر آپ " قاعدہ ید " ۔ جو ملکیت کے ثبوت کے لئے ایک محکم دلیل ہے۔ سے ابو بکر کے سامنے استدلال فرمائیں تو ابو بکر پیغمبر سے منسوب اس روایت کو نقل نہیں کر سکتا تھا تاکہ یہ کہا جائے کہ قرآن کے ارث سے مربوط دلائل کی عموم خبر واحد کے ذریعے سے تخصیص ہوئی ہے۔

اس اشکال کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ، حضرت زہراء نے فدک کے ہبہ اور بخشش ہونے کا دعویٰ فرمایا تو در حقیقت آپ نے یہ دعویٰ فرمایا ہے کہ فدک میرے تصرف اور قبضے میں تھا لہذا میں ذو الید ہوں۔ ==

"فسکت ابوبکر !!"

(۔جب یہ استدلال سنا تو۔ ابوبکر خاموش ہوگیا !!!)

"فقال عمر، یا علیؑ! دعنا من کلامک فانا لا نقویٰ علی حجتک !!

فان اتیت بشهود عادل، والا فهو فیء للمسلمین لا حقّ لک ولا لفاطمة فیه !!!"

(اس وقت عمر نے حضرت علیؑ سے کہا کہ:

اے علی! ان باتوں کو چھوڑ دو، کیونکہ ہم آپؑ کے دلائل کا جواب نہیں دے سکتے اور آپ سے بحث نہیں کر سکتے !!!

اگر عادل گواہ لے آئے۔ تو فدک حضرت فاطمہؑ کو ملے گا۔

ورنہ یہ مسلمانوں کی ملکیت ہے اس پر تیرا یا فاطمہؑ کا کوئی حق نہیں !!!)

جب عمر نے محسوس کیا کہ حضرت علیؑ کے دلائل کا کوئی جواب نہیں۔ اور نہ ہمارے پاس کوئی شرعی دلیل ہے۔ اور اس طرح جب اس نے استدلال کے میدان میں شکست کھائی تو بغیر دلیل والے اپنے دعوے کا تکرار کیا اور بڑے متکبرانہ انداز میں کہا کہ: یا علی! آپؑ کا یہ استدلال ہم نہیں سمجھتے لہذا

= ابن ابی الحدید اس جواب پر اشکال کرتا ہے کہ پیغمبرؐ کی طرف سے حضرت زہراء کو فدک کا بخشا جانا اگرچہ مسلم اور قطعی ہے لیکن ممکن ہے حضرت فاطمہؑ نے اس پر قبضہ اور تصرف نہ کیا ہو! پس صرف ہبہ کرنا قابض ہونے کی دلیل نہیں کیونکہ "اعطاء" کا معنی وسیع ہے۔ قبضہ اور بغیر قبضہ ہر قسم کے ہبہ اور بخشش کو اعطاء کہا جاتا ہے۔

ابن ابی الحدید کے جواب میں یہ کہنا چاہیئے کہ: شیعہ منابع و مآخذ کے علاوہ اہل سنت کے بھی اکثر مآخذ کے مطابق یہ ایک قطعی اور مسلم امر ہے کہ رسول خداؐ کی زندگی میں فدک حضرت زہراءؑ کو بخشا گیا اور آپؑ کے حوالے کر دیا گیا تھا اور حضرت زہراءؑ نے وہاں اپنا نمائندہ مقرر فرمایا تھا۔ عثمان بن حنیف کے نام حضرت علیؑ کے مکتوب میں آپؑ صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ "بلی کانت فی ایدینا فدک..." (یعنی فدک ہمارے قبضے میں تھا...) اور لغت میں بھی لفظ "عطاء" کے معنی میں قبضہ اور تصرف بھی شامل ہے۔

بنابریں خود ابن ابی الحدید کی مورد قبول روایات جو فدک کے ہبہ ہونے پر دلالت رکھتی ہیں، ہمارے دعوے کی بین دلیل ہیں۔

پس فدک کو نحلہ اور ہبہ قرار دینا اس کے علاوہ کوئی اور مفہوم نہیں رکھتا کہ فدک پیغمبرؐ نے بخشا اور حضرت زہراءؑ کے تصرف اور قبضے میں تھا اور "قاعدہ ید" کے بجائے ہبہ اور بخشش کے عنوان کو انتخاب کرنے کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ آپؑ ابوبکر کو یہ سمجھانا چاہتی تھیں کہ تمہارا یہ اقدام رسول خداؐ کی سیرت طیبہ کے سو فیصد مخالف ہے کیونکہ پیغمبرؐ نے مجھے فدک بخشا اور تم نے مجھ سے چھین لیا۔ اس مقصود کو سمجھانے کے لئے "ید" کے مقابلے میں یہ تعبیر زیادہ مناسب ہے۔

آپؑ کے سامنے دو راستے ہیں، ایک یہ کہ کوئی "عادل" گواہ لائیں (۱) یا یہ کہ فدک سے محروم رہیں!۔

اگرچہ عمر نے مولا علی (ع) کے ساتھ استدلال اور منطقی گفتگو میں اپنی ناتوانی کا اعتراف کیا ہے لیکن مسجد میں سب کے سامنے خدا اور رسول خدا (ص) کے حکم کی مخالفت بھی کی ہے!!۔

یہاں حضرت علی (ع) ابو بکر کی مذمت کرنے کے لئے ایک دوسری روش سے استفادہ فرماتے ہیں۔ انشاء اللہ اگلے درس میں اس پر بحث ہوگی۔

وصلی اللہ علیٰ محمد و آل محمد (ص)

۱۔ جیسا کہ متن میں گزرا ہے کہ جب ابو بکر نے فدک کی سند لکھی تو عمر نے اسے پھاڑ دیا اور حضرت علیؑ پر مفاد پرستی کا الزام لگاتے ہوئے آپؑ کی گواہی کو مسترد کر دیا؛ یہاں پر وہ گواہ کے لئے "عادل ہونا" شرط قرار دیتا ہے کہ اگر کوئی اور گواہ اور شاہد لائیں بھی تو اس پر کوئی نہ کوئی الزام لگائیں اور اسے عدالت سے ساقط کر دیں اور اس کی گواہی کو بھی مسترد کر دیں!۔

سولھواں درس:

- گزشتہ درس پر ایک نظر
- حضرت امیرالمؤمنین (ع) کی ابوبکر سے وضاحت طلبی
- لوگوں میں فکری اعتبار سے تبدیلی
- حضرت فاطمۃ الزہراء (ع) کا اپنے بابا (ص) کے مزار پرسوز اور گریہ
- حضرت امیرالمؤمنین (ع) کے قتل کی سازش
- سازش قتل کا انکشاف
- نماز کی حالت میں ابوبکر کا تردد اور پشیمانی
- حضرت امیرالمؤمنین (ع) کی عمر کو دھمکی

فَقالَ أميرُالمُؤمِنين﵇: يا أبابَكر تَقرَأُ كِتابَ الله؟ قالَ: نَعَمْ؛ قالَ: أخبِرْني عَنْ قَوْلِ الله عزّوجلّ: ﴿إنّما يُريدُ الله لِيُذهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهيراً[1]﴾ فيمَنْ نَزَلَتْ، فينا أمْ في غَيْرِنا؟ قالَ: بَلْ فيكُمْ، قالَ: فَلَوْ أنَّ شُهوداً شَهِدُوا عَلىٰ فاطِمَة بِنْتِ رَسُولِ‌اللهﷺ بِفاحِشَةٍ، ما كُنْتَ صانِعاً بِها؟ قالَ: كُنْتُ أُقيمُ عَلَيْها الحَدّ كَما أُقيمُهُ عَلىٰ نِساءِ المُسْلِمينَ؛ قالَ: إذَنْ كُنْتَ عِنْدَالله مِنَ الكافِرينَ؛ قالَ: وَ لِمَ؟ قالَ: لِأنَّکَ رَدَدْتَ شَهادَةَ الله بِالطَّهارَةِ وَ قَبِلْتَ شَهادَةَ النّاسِ عَلَيْها، كَما رَدَدْتَ حُكْمَ الله وَ حُكْمَ رَسُولِه، أن جَعَلَ لَها فَدَكاً وَ قَدْ قَبَضَتْهُ فی حَياتِهِ، ثُمَّ قَبِلْتَ شَهادَةَ اعرابیٍ بائِلٍ عَلىٰ عَقِبَيْهِ عَلَيْها وَ أخَذْتَ مِنْها فَدَكاً، وَ زَعَمْتَ أنَّهُ فَيْءٌ لِلْمُسْلِمينَ، وَ قَدْ قالَ رَسُولُ‌اللهﷺ: «اَلْبَيِّنَةُ عَلى الْمُدَّعی، وَ الْيَمينُ عَلى المُدَّعیٰ عَلَيْه»؛ فَرَدَدْتَ قَوْلَ رَسُولِ‌اللهﷺ: اَلْبَيِّنَةُ عَلىٰ مَنِ ادَّعیٰ، وَ الْيَمينُ عَلىٰ مَنِ ادُّعِیَ عَلَيْهِ.

قالَ: فَدَمْدَمَ النّاس وَ أنْكَروا، وَ نَظَر بَعْضُهُم إلى بَعْضٍ وَ قالُوا: «صَدَقَ وَ الله عَلِيُ بنُ أبی طالِبٍ﵇»؛ و رَجَعَ عَلِيٌ﵇ إلىٰ مَنْزِلِه.

قالَ: وَ دَخَلَتْ فاطِمَة﵍ اَلْمَسْجِد وَ طافَتْ بِقَبْرِ أبيها وَ هِیَ تبكی تَقُولُ:

إنّا فَقَدْناکَ فَقْدَ الأرضِ وابِلَها ... وَ اخْتَلَّ قَوْمُکَ فَاشْهَدْهُمْ وَ لاتَغِب

قَدْ كانَ بَعْدَکَ أنْباءٌ وَ هَنْبَثَة ... لَوْ كُنْتَ شاهِدَها لَمْ تَكْثُرِ الخطب

قَدْ كانَ جِبْريلُ بِالآياتِ يُؤنِسُنا ... فَغابَ عَنّا فَكُلُّ الْخَيْرِ مُحْتَجَب

وَ كُنْتَ بَدْراً وَ نوراً يُسْتَضاءُ بِهِ ... عَلَيْکَ تنزلُ مِنْ ذِی العِزَّةِ الكُتُب

تَجَهَّمَتْنا رِجالٌ وَ اسْتُخِفَّ بِنا ... إذْ غِبْتَ عَنّا فَنَحْنُ الْيَوْم نُغتصب

فَسَوْفَ نَبْكيکَ ما عِشْنا وَ ما بقيت ... مِنّا العُيُون بِتَهْمالٍ لَها سَكَب

قالَ: فَرجع أبوبكر و عمر إلى مَنْزِلِهما، وَ بَعَثَ أبوبَكر إلى عُمَر فَدَعاهُ، ثُمَّ قالَ لَه: أما رَأيْتَ مَجْلِس عَلِيٍ مِنّا فی هٰذَا الْيَوْم، وَ الله لَئِنْ قَعَدَ مَقْعَداً آخر مِثْلَه

---

۱. الاحزاب: ۳۳.

لَيُفْسِدَنَّ عَلَيْنا أَمْرَنا، فَمَا الرَّأى؟ فَقال: عُمَر: الرَّأىُ أَنْ تَأْمُرَ بِقَتْلِه، قال: فَمَنْ يَقْتُلُه؟! قالَ: «خالِدُ بْنُ الْوَليد».

فَبَعَثا إلى خالِدِ بْنِ الوَليدِ فَأَتاهُما، فَقالا لَه: نُريدُ أَنْ نحْمِلَكَ على أَمْرٍ عَظيمٍ، قالَ: إِحْمِلاني عَلىٰ ما شِئْتُما، وَ لَوْ عَلىٰ قَتْلِ عَلِيّ بْنِ أَبي طالِبٍ، قالا: فَهُو ذاكَ، فَقالَ خالد: متى أَقْتُلُه؟ قالَ أَبُوبكر: احْضرِ المَسْجِد وَ قُمْ بِجَنْبِهِ فِي الصَّلوٰة، فَإذا سَلَّمْتُ فَقُمْ إلَيْهِ وَ اضْرِبْ عُنُقَه، قال: نَعَم.

فَسَمِعَتْ أَسْماءُ بِنْتُ عُمَيْس وَ كانَتْ تَحْتَ أَبي‌بَكرٍ؛ فَقالَتْ لِجارِيَتِها: إذْهَبي إلىٰ مَنْزِلِ عَلِيٍّ وَ فاطِمَة(عليهماالسلام) وَ اقرَئيهِمَا السَّلام وَ قُولي لِعَلِيٍّ عليه السلام: ﴿إِنَّ المَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ إِنِّي لَكَ مِنَ النّاصِحينَ[1]﴾ فَجاءَتْ، فَقالَ أَميرُالمُؤْمِنينَ عليه السلام: قُولي لَها: «إِنَّ اللهَ يَحُولُ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ ما يُريدُونَ».

ثُمَّ قامَ وَ تَهَيَّأَ لِلصَّلوٰةِ، وَ حَضرَ الْمَسْجِدَ، وَ صَلّىٰ خَلْفَ أَبي‌بَكْرٍ؛ وَ خالِدُ بْنُ الوَليد يُصَلّي بِجَنْبِهِ، وَ مَعَهُ السَّيْف؛ فَلَمّا جَلَسَ أَبُوبَكر فِي التَّشَهُّد، نَدِمَ عَلىٰ ما قالَ وَ خافَ الفِتْنَةَ، وَ عَرَفَ شِدَّةَ عَلِيٍّ عليه السلام وَ بَأْسَه، فَلَمْ يَزَل مُتَفَكِّراً لايَجْسِر أَنْ يُسَلِّم، حَتّى ظَنَّ النّاسُ أَنَّهُ قَدْ سَها.

ثُمَّ الْتَفَتَ إلى خالِد، فَقال: «يا خالِد! لاتَفْعَلَنَّ ما أَمَرْتُك، وَ السَّلامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُاللهِ وَ بَرَكاتُه»! فَقالَ أَميرُالمُؤْمِنينَ عليه السلام: يا خالد! مَا الَّذي أَمَرَكَ بِه؟ فَقال: أَمَرَني بِضَرْبِ عُنُقِكَ. قالَ: أَوَ كُنْتَ فاعِلاً؟! قالَ: إي وَ اللهِ، لَوْ لا أَنَّهُ قالَ لي لاتَقْتُلْه قَبْلَ التَّسْليم، لَقَتَلْتُكَ.

قالَ: فَأَخَذَهُ عَلِيٌّ عليه السلام فَجَلَدَ بِهِ الأَرْض، فَاجْتَمَعَ النّاسُ عَلَيْهِ، فَقالَ عُمَر: يَقْتُلُهُ وَ رَبِّ الكَعْبَة، فَقالَ النّاسُ: يا أَبَاالحَسَن! الله الله، بِحَقِّ صاحِبِ القَبْر، فَخَلّىٰ عَنْهُ، ثُمَّ الْتَفَتَ إلى عُمَر، فَأَخَذَ بِتَلابيبِه وَ قالَ: يَابْنَ صَهّاك، وَ اللهِ لَوْ لا عَهْدٌ مِنْ رَسُولِ‌اللهِ صلی الله علیه وآله، وَ كِتابٌ مِنَ اللهِ سَبَق، لَعَلِمْتَ أَيُّنا أَضْعَفُ ناصِراً وَ أَقَلُّ عَدَداً؛ وَ دَخَلَ مَنْزِلَهُ.

❁ ❁ ❁

---

۱. قصص: ۲۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبہ نستعین

گزشتہ درس پر ایک نظر:

گزشتہ دروس میں ہم نے فدک کے بارے میں حضرت زہراء (ع) کے خطبے کے بارے میں گفتگو کی اور ابھی اسی موضوع سے مربوط حضرت امام جعفر صادق (ع) کی اس روایت پر بحث ہورہی ہے جو سند کے لحاظ سے معتبر اور درست ہے اور فدک کے بارے میں روان، آسان اور عمدہ مطالب پر مشتمل ہے.

اس سے پہلے درس میں روایت کے ایک حصہ کو ہم نے پڑھا اور کہا ہے کہ: جب فدک، ابوبکر نے حضرت فاطمہ (ع) سے چھین لیا تو آپؑ اس کے پاس گئیں اور احتجاج فرمایا، ابوبکر کے گواہی طلب کرنے پر آپؑ نے حضرت علیؑ اور ام ایمن کو بطور گواہ پیش کیا کہ فدک رسول خدا (ص) نے اپنی زندگی میں حضرت زہراء (ع) کو بخش دیا تھا.

ابوبکر نے اس گواہی کی بنا پر ایک تحریر لکھی کہ فدک حضرت زہراء (ع) کو واپس کردیا جائے لیکن اسی دوران عمر آگیا اور تحریر کو پھاڑ دیا اور کہا کہ اس بارے میں علیؑ کی گواہی قابل قبول ہی نہیں ہے اور ام ایمن کی گواہی کافی نہیں ہے!.

پھر امیر المؤمنینؑ نے مسجد میں ابوبکر پر اعتراض کیا اور حضرت زہراء (ع) کے حق میں استدلال فرمایا حالانکہ ابوبکر مہاجرین اور انصار کے کچھ لوگوں کے ساتھ وہاں بیٹھا ہوا تھا. یہاں حضرت علیؑ نے ابوبکر سے

وضاحت طلب فرمائی اور اس سے فرمایا کہ گواہ اور دلیل تمہیں لانے چاہئیں، کیونکہ فدک حضرت زہراء (ع) کے تصرف اور قبضے میں تھا اور تم اس قبضے کے خلاف دعویٰ کر رہے ہو اور مدعی ہو کہ فدک تمام مسلمانوں کا ہے۔ لہٰذا خدا اور اس کے پیغمبر (ص) کے حکم کے مطابق تجھ پر گواہ پیش کرنا ضروری ہے۔

یہاں پر ابوبکر خاموش رہا۔ چونکہ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا!۔ اور عمر نے مداخلت کرتے ہوئے مولا علیؑ سے کہا کہ: ہمیں آپؑ کی ان دلیلوں سے کوئی سروکار نہیں! یا آپؑ عادل گواہ لائیں یا آپؑ اور فاطمہؑ فدک سے محروم رہیں!!۔

جب حضرت امیرالمؤمنینؑ کو عمر کے ضدی پنے اور ہٹ دھرمی کا سامنا کرنا پڑا تو آپؑ نے استدلال کا رخ بدل دیا۔

اب آئیے آگے بڑھتے ہیں۔

حضرت امیر المؤمنین(ع) کی ابوبکر سے وضاحت طلبی:

" فقال امیر المؤمنین(ع)، یا ابابکر! تقرا کتاب اللّٰہ؟"

(اس کے بعد امیرالمؤمنین (ع) نے ابوبکر سے فرمایا کہ: اے ابوبکر! کیا قرآن پڑھتے ہو؟)

" قال، نعم " (اس نے کہا کہ: ہاں)

" قال علیه السلام، اخبرنی عن قول اللّٰہ عزوجل،" انما یرید اللّٰہ لیذهب عنکم الرجس اهل البیت ویطهرکم تطهیراً(۱)" فیمن نزلت، فینا ام فی غیرنا؟ "

(حضرت امیرالمؤمنینؑ نے فرمایا کہ: مجھے خدا کے اس فرمان کے بارے میں بتاؤ کہ:

" بتحقیق خدا یہ ارادہ رکھتا ہے کہ ہر قسم کی آلودگی اور پلیدی کو آپ اہل بیتؑ سے دور رکھے اور آپ کو پاک و منزہ رکھے" یہ آیۂ شریفہ کس کے حق میں نازل ہوئی ہے: ہمارے بارے میں یا کسی اور کے حق میں؟)

" قال، بل فیکم "

۱۔ سورۂ احزاب / ۳۳۔

(ابوبکر نے کہا کہ: یقیناً یہ آیت آپ۔ اہل بیتؑ۔ کے حق میں نازل ہوئی ہے)

" قال علیہ السلام:

یا ابابکر: فلو ان شھوداً شھدوا علیٰ فاطمة بنت رسول اللّٰہ (ص) بفاحشة ما کنت صانعاً بھا؟ "

(حضرت علیؑ (ع) نے فرمایا کہ:

اے ابوبکر! ۔ فرض کریں۔ کہ چند گواہ اگر حضرت فاطمہ (ع) کے خلاف یہ گواہی دیں کہ انھوں نے کوئی برا کام انجام دیا ہے تو تم فاطمہ (ع) کے ساتھ کیا سلوک کرتے؟)

" قال: کنت اقیم علیھا الحد کما اقیمہ علیٰ نساء المسلمین "

(ابوبکر نے کہا کہ: میں ان پر حد جاری کرتا جس طرح دوسری مسلمان عورتوں پر حد جاری کرتا ہوں)

" قال علیہ السلام: اذن کنت عند اللّٰہ من الکافرین "

(حضرت امیر المؤمنین (ع) نے فرمایا کہ: اس صورت میں تم خدا کے نزدیک کافروں میں سے شمار ہوتے)

" قال: ولِمَ؟ "

(اس نے کہا: کیوں؟!)

" قال (ع): لانک رددت شھادة اللّٰہ بالطھارة وقبلت شھادة الناس علیھا! "

(حضرت علیؑ نے فرمایا:

اس لئے کہ خدا نے ان کی پاکیزگی اور عصمت کی گواہی دی ہے اور تم نے اس کو ٹھکرا کر لوگوں کی گواہی کو قبول کی!)

یعنی، خداوند قدوس قرآن میں گواہی دیتا ہے کہ اہل بیتؑ اور حضرت زہراءؑ پاک اور طاہر ہیں اور خدا نے ارادہ فرمایا ہے ہر ناپاکی اور آلودگی کو ان سے دور کرے اور تم آکر۔ اس قرآنی گواہی کے خلاف۔ چند لوگوں کی گواہی کو ترجیح دیتے ہو؟!)

" کما رددت حکم اللّٰہ وحکم رسولہ ان جعل لھا فدکاً "

(جیسا کہ خدا اور اس کے پیغمبر (ص) کے حکم کو بھی تم نے ٹھکرا دیا ہے۔ اور وہ حکم یہ تھا کہ۔ انھوں نے فدک، حضرت فاطمہؑ کو بخشا تھا)

یہاں آپؑ آیۂ شریفہ " فآت ذا القربیٰ حقّہ(۱) " کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں، جس کے بارے میں گزشتہ درس میں بحث ہو چکی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول خدا(ص) نے جبرئیل سے "ذا القربیٰ" کے بارے میں پوچھا اور خدا کے حکم سے فدک، حضرت زہراء(ع) کے حوالے کردیا۔ اس حقیقت کو فریقین نے اپنی حدیث کی کتابوں میں نقل کیا ہے(۲)۔

" وقد قبضتـه فی حیاتـه "

(حالانکہ حضرت زہراء(ع) رسول خدا(ص) کی زندگی میں ہی فدک پر قابض تھیں)

دراصل آپؑ اس عبارت کے ذریعے اس حقیقت کی تائید فرمارہے ہیں کہ اس مسئلہ میں میراث سے مراد، اصطلاحی میراث نہیں بلکہ اس سے وسیع تر مفہوم مراد ہے جو ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو باپ کی طرف سے اولاد کو ملے چاہے وہ باپ کی زندگی میں ہی کیوں نہ ہو۔ بنیادی طور پر فدک "نحلہ یا نحیلہ" یعنی ہبہ یا عطیہ تھا جو رسول خدا(ص) کی طرف سے حضرت فاطمہ(ع) کو عطا ہوا تھا۔

" ثم قبلت شهادة اعرابیّ بائـل علیٰ عقبیه علیها واخـذت منها فدکـاً
وزعمت انه فـیء للمسلمین؛"

(پھر تم نے فاطمہؑ کے خلاف ایک ایسے بادیہ نشین کی گواہی قبول کی ہے کہ جو اپنے پاؤں پر پیشاب کرتا ہے، اس طرح تم نے حضرت فاطمہؑ سے فدک چھین لیا اور اپنے تئیں یہ سوچا کہ یہ مسلمانوں کی ملکیت ہے!)

یہاں آپؑ اس حدیث کی طرف اشارہ کررہے ہیں جسے عمر نے نقل کرتے ہوئے کہا کہ اوس بن حدثان، عائشہ اور حفصہ گواہی دے رہے ہیں کہ: "رسول خدا(ص) نے فرمایا کہ: " نحن معاشر الانبیاء لانورث وماترکناه صدقه " (یعنی ہم گروہ انبیاء ارث نہیں چھوڑتے اور جو کچھ ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہے۔"

اہل سنت بھی اس حدیث پر بہت زور دیتے ہیں۔ حضرت علیؑ کے اس جملے " بائـل علیٰ عقبیه "

۱۔ سورۂ روم / ۳۸۔

۲۔ بحار الانوار طبع قدیم ج ۱۸ باب نزول الآیات فی امر فدک۔

کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ اوس بن حدثان کی طرف اشارہ ہے۔

مختصر یہ کہ: آپؑ فرماتے ہیں کہ تم نے خدا اور رسول (ص) کا حکم مسترد کیا اور اسے پامال کردیا اور ایک بادیہ نشین اور عائشہ وحفصہ کی گواہی قبول کر کے ان کی گواہی کو حکم خدا پر مقدم رکھا، کیونکہ فدک، خدا کے حکم سے پیغمبر اکرم (ص) نے حضرت فاطمہؑ کو عنایت فرمایا تھا لیکن تم رسول خدا (ص) کے اس عطیہ کو غصب کرکے یہ سوچ رہے ہو کہ یہ تمام مسلمانوں کی ملکیت ہے۔

" وقد قال رسول اللّٰہ: البیّنة علیٰ المدعي والیمین علیٰ المدعیٰ علیه "

(حالانکہ رسول خدا (ص) نے فرمایا تھا کہ: مدعی پر گواہی اور دلیل پیش کرنا ضروری ہے جبکہ مدعیٰ علیہ پر قسم)

اور یہ واضح ہے کہ یہاں تم مدعی ہو کیونکہ فدک حضرت زہراءؑ کے تصرف میں تھا اور ان کا اس پر قبضہ تھا لہذا حضرت زہراءؑ "ذو الید" تھیں اب تم یہ دعویٰ کررہے ہو کہ فدک تمام مسلمانوں کا مال ہے تو۔ رسول خدا (ص) کے حکم کے مطابق۔ تم پر لازم تھا کہ گواہ لاتے اور دلیل پیش کرتے اور۔ تمہارے پاس گواہ نہ ہونے کی صورت میں۔ حضرت زہراءؑ قسم کھاتیں اور معاملہ ختم ہوجاتا۔

۔یہاں رسول خدا (ص) کے اس صریح حکم اور اسلامی عدالتی سسٹم کے مسلمہ اصول کے خلاف ان لوگوں نے حضرت زہراءؑ سے گواہی طلب کی اور۔ آپؑ نے دو گواہ، ایک حضرت علیؑ اور دوسرا ام ایمن پیش کیے لیکن انہیں مسترد کردیا گیا۔

" فرددت قول رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وآله وسلم "

(بنابریں تم نے رسول خدا (ص) کے فرمان کو رد کردیا ہے)

یعنی تم نے مدعیٰ علیہ اور ذو الید سے گواہی طلب کر کے در اصل رسول خدا (ص) کے حکم کے خلاف عمل کیا ہے اور آنحضرت (ص) کے فرمان کو پامال کردیا ہے!۔

لوگوں میں فکری اعتبار سے تبدیلی،

" قال علیه السلام: فدمدم الناس وانکروا "

(امام صادق (ع) فرماتے ہیں کہ:

۔ابوبکر کی اس حرکت سے ۔ لوگ ناراض ہوئے اور شور مچایا اور ۔ ابوبکر کے اس اقدام کو ۔ برا مانا)

غصے کی حالت میں انسان جو شور مچاتا ہے اس کو " دمدم " کہا جاتا ہے۔ یعنی لوگ اس بات پر ناراض ہوئے کہ ابوبکر نے حضرت علیؑ اور حضرت زہراءؑ کے بارے میں یہ ناروا سلوک کیوں روا رکھا اور ان کے حقوق کو کیوں پامال کیا؟

" ونظر بعضہم الی بعض وقالوا صدق واللہ علیّ بن ابی طالب (ع) "

(لوگوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کہنے لگے کہ: خدا کی قسم! علی بن ابی طالب درست فرما رہے ہیں)

کیونکہ وہ جانتے تھے کہ رسول خدا (ص) نے اپنی زندگی میں فدک حضرت زہراءؑ کو عنایت فرمایا تھا اور تا بحال ان کے قبضے میں تھا اور وہاں آپؑ کے نمائندے اور اہل کار کام کر رہے تھے۔ اس طرح چونکہ آپؑ " ذوالید " تھیں آپؑ پر لازم نہ تھا کہ گواہی لائیں، بلکہ مدعی ہونے کے اعتبار سے ابوبکر اور عمر پر ضروری تھا کہ وہ گواہ پیش کرتے یا دلیل قائم کرتے۔ اسی لئے جب لوگوں نے امیرالمؤمنینؑ کی باتیں سنیں تو آپؑ کی تصدیق کی اور ابوبکر و عمر کے اقدام سے ناراض ہوئے۔

" ورجع علیّ علیہ السلام الیٰ منزلہ "

(اور حضرت علیؑ اپنے گھر واپس آگئے)

حضرت فاطمۃ الزہراء (ع) کا اپنے بابا (ص) کے مزار پر سوز اور گریہ۔

" قال (ع) ودخلت فاطمۃ علیہا السلام المسجد وطافت بقبر ابیہا وھی تبکی وتقول: "

(امام صادق (ع) فرماتے ہیں کہ: اس کے بعد حضرت فاطمہؑ مسجد میں داخل ہوئیں اور بابا کی قبر کے گرد ۔ پروانے کی طرح ۔ چکر لگایا، حالانکہ آپؑ گریہ کر رہی تھیں اور ۔ ذیل کے یہ اشعار ۔ کہہ رہی تھیں (۱))

۱۔ یہ وہی اشعار ہیں جسے آپؑ نے مسجد میں اپنے خطبہ کے بعد پیغمبر اکرم کی ضریح پر پڑھا تھا شاید آپؑ نے ان اشعار کو بار بار پڑھا ہو۔

" انا فقدناک فقد الارض وابلها واختلّ قومک فاشهدھم ولا تغب "

(اے رسول خدا (ص)! ہم نے آپ کو اس طرح کھو دیا جس طرح زمین مفید اور سرشار بارش کو کھو دیتی ہے، جبکہ آپ (ص) کی قوم منحرف ہو گئی ہے آپ ان پر گواہ رہنا اور ہم سے غائب نہ رہنا)

"فقد الارض" مفعول مطلق نوعی ہے۔ یعنی فعل کی نوعیت کو بیان کرتا ہے۔ یعنی آپ (ص) ہم سے بچھڑ گئے اور ہماری حالت اس زمین کی سی ہو گئی ہے جس نے اپنے اوپر برسنے والی مفید اور سرشار بارش کو کھو دیا ہو۔ "وابل" یعنی بڑے قطروں والی بارش، جب بارش برسنے کا سلسلہ ختم ہو جائے تو زمین۔ نہ صرف اپنی شادابی کھو دیتی ہے بلکہ۔ بنجر بھی بن جاتی ہے۔

" قد کان بعدک انباء وھنبثة لو کنت شاھدھا لم تکثر الخطب "

(بتحقیق آپ (ص) کے بعد ایسی خبریں اور ایسے سخت حوادث رونما ہوئے ہیں کہ اگر آپ (ص) حاضر ہوتے اور دیکھتے تو کبھی بھی یہ مصیبتیں اتنی بڑی نہ ہوتیں)

سخت حوادث، شور و غل اور ہنگامہ آرائی کو " ھنبثۃ " کہا جاتا ہے۔ یعنی آپ (ص) کی وفات کے بعد ایسی سخت مصیبتیں اور ہنگامہ آرائیاں رونما ہوئیں کہ اگر آپ (ص) زندہ ہوتے اور ان حالات کو دیکھ رہے ہوتے تو یہ حادثات کبھی بھی رونما نہ ہوتے۔ یعنی آپ (ص) کے ہوتے ہوئے یہ لوگ اہل بیتؑ پر اتنے مظالم ڈھانے کی جرات نہ کرتے اور حریم اہل بیتؑ کی شان میں گستاخی نہ کرتے "کان" یہاں تامہ ہے اور اس کو اسم و خبر کی ضرورت نہیں ہے۔

" قد کان جبریل بالایات یؤنسنا ففاب عنا فکل الخیر محتجب "

(۔اس وقت۔ جبرئیل آیات قرآنی کے ذریعے ہمارے سکون اور انس کا باعث بنتا تھا لیکن ابھی وہ بھی ہم سے چھپ چکا ہے اس طرح تمام خوبیاں ہم سے پوشیدہ ہو گئی ہیں)

بعض لوگ جو ان اشعار کو "ہند بن اثاثہ" کی طرف منسوب کرتے ہیں تو ممکن ہے پہلے دو بیت اس کے ہوں و گرنہ کم از کم یہ بیت تو یقیناً حضرت زہراءؑ کا ہے کیونکہ جبرئیل کے ساتھ گفتگو اور اس کا مونس ہونا صرف اہل بیتؑ کے ساتھ مخصوص تھا۔

" وكنت بدراً ونوراً يستضاء به علیک تنزل من ذی العزة الكتب "

(آپ (س) بدر کامل تھے اور ایسے نور تھے کہ جس کے ذریعے روشنی پیدا ہوتی تھی، خداوند متعال کی طرف سے آپ (س) پر آسمانی کتابیں نازل ہوتی تھیں)

" تجهّمتنا(۱) الرجال واستخف بنا اذ غبت عنا فنحن اليوم نغتصب "

(بعض لوگوں نے ہمیں اپنے وحشیانہ حملے کا نشانہ بنایا، موڈ بگاڑ کر ہمارے ساتھ سخت برتاؤ روا رکھا اور آج ہمیں غارت کیا جا رہا ہے، یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ آپ (س) ہماری آنکھوں سے غائب ہیں)

" فسوف نبكيك ما عشنا وما بقيت منا العيون بتهمال لها سكب "

(جب تک ہم زندہ ہیں اور ہماری آنکھوں میں آنسو ہیں تو ہم آپ (س) کے غم میں روتے رہیں گے)

" تہمال " تعداد کی طرح تفعال کے وزن پر ہے اور اس کی اصل " ہمل " ہے جس کا معنی، جاری ہونا ہیں۔ تند و تیز طریقے سے بہنے کو " سکب " کہا جاتا ہے۔ جیسے سیلاب یا موسلا دھار بارش۔

آپؑ کا مقصد یہ ہے کہ: اے میرے والد بزرگوار! ہم آپ (س) کے لئے روتے رہیں گے جب تک کہ ہم زندہ ہیں اور ہماری آنکھوں سے آپ (س) کی جدائی میں آنسوؤں کا سیلاب جاری رہے گا(۲)۔

حضرت امیر المؤمنین (ع) کے قتل کی سازش،

" قال عليه السلام، فرجع ابو بكر و عمر الى منزلهما "

(امام صادق (ع) فرماتے ہیں کہ: ابوبکر اور عمر بھی اپنے گھروں کی طرف چلے گئے)

" وبعث ابو بكر الى عمر فدعاه، ثم قال له، اما رايت مجلس علی منا فی هذا اليوم "

(پھر ابوبکر نے عمر کو بلا بھیجا۔ جب وہ آیا تو۔ اس سے کہا کہ: کیا تم نے علیؑ کو نہیں دیکھا کہ اس نے آج ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟)

۱۔ تجہم: کسی کے ساتھ موڈ بگاڑ کر سخت رویے کے ساتھ پیش آنے کو کہتے ہیں۔

۲۔ احتجاج کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ، تفسیر قمی میں اور بھی اشعار نقل ہوئے ہیں۔

یعنی، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ لوگوں کے سامنے علیؑ نے ہمیں رسوا کیا ہے؟

" واللہ لئن قعد مقعداً آخر لیفسدنّ علینا امرنا"

(خدا کی قسم! اگر اس قسم کی کسی دوسری نشست میں وہ بیٹھ جائے تو یقیناً ہماری حکومت کا مسئلہ خراب کردے گا)

" امر " یعنی، حکومت. حکومت ابھی تازہ ابوبکر کے ہاتھ لگی تھی دوسری طرف، بعض لوگوں میں زمانہ رسول خدا (ص) کی خصوصیات پائی جاتی تھیں اسی لئے ابوبکر خوفزدہ تھا کہ اگر کسی دوسری جگہ پر حضرت علیؑ نے اس کے ساتھ مناظرہ کیا تو اسے حکومت سے ہاتھ دھونا پڑے گا. اسی لئے وہ عمر کو بلاتا ہے اور اس سے مشورہ کرتا ہے !!.

" فما الرای ؟"

(پس تیری کیا رائے ہے ؟)

" فقال عمر، الرای ان تامر بقتله !!!"

(عمر نے کہا کہ: میری رائے یہ ہے کہ تو اس کے قتل کیے جانے کا حکم دے !!!)

" قال، فمن یقتله ؟"

(ابوبکر نے کہا کہ: اسے کون قتل کر سکتا ہے ؟!)

" قال، خالد بن الولید،"

(عمر نے کہا کہ: خالد بن ولید !!)

چونکہ عمر جانتا تھا کہ خالد بن ولید حضرت علیؑ کی بہ نسبت بہت بغض وعداوت رکھتا ہے اسی لئے فوراً اس کا نام لیا !.

" فبعثا الیٰ خالد بن الولید، فاتاهما"

(اس طرح انھوں نے کسی کو بھیج کر خالد بن ولید کو بلا بھیجا اور وہ ان کے پاس آگیا)

" فقالا له، نرید ان نحملک علیٰ امر عظیم"

(ابوبکر اور عمر نے اس سے کہا کہ: ہم ایک بہت عظیم کام تمہارے سپرد کرنا چاہتے ہیں)

"قال: احملانی علیٰ ما شئتما ولو علیٰ قتل علیؑ بن ابی طالب!!"

(خالد نے کہا، مجھ سے جو کام لینا چاہتے تو لے لو، اگرچہ علی بن ابی طالب کا قتل ہی کیوں نہ ہو!!)

معلوم ہوتا ہے کہ خالد بھی جانتا تھا کہ اس کے دوست کس فکر میں ہیں!۔

"قالا: ھو ذاک!!"

(ابوبکر اور عمر نے کہا کہ: ہم بھی یہی چاہتے ہیں!!)

"فقال خالد: متیٰ اقتله؟"

(خالد نے پوچھا کہ: اسے کب قتل کروں؟!)

"قال ابوبکر: احضر المسجد وقم بجنبه فی الصلوٰة!!"

(ابوبکر نے کہا کہ: مسجد میں آجاؤ اور نماز کے وقت علیؑ کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ!!)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ مسجد میں تشریف لے جاتے تھے اور ابوبکر کے پیچھے نماز پڑھتے تھے اس کی علت تقیہ بھی ہو سکتی ہے اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی کا تحفظ بھی۔

"فاذا سلّمت فقم الیه واضرب عنقه!!"

(اور جب میں سلام پھیروں تو تم اس کی طرف اٹھو اور اس کی گردن اڑا دو!!)

"قال: نعم!" (خالد نے کہا کہ: بہت اچھا!)

سازش قتل کا انکشاف:

"فسمعت اسماء بنت عمیس وکانت تحت ابی بکر"

(اس گفتگو کو "اسماء بنت عمیس" نے بھی سنا کہ جو ابوبکر کی بیوی تھی)

اسماء بنت عمیس، خاندان عصمت وطہارت سے محبت رکھنے والوں میں سے تھیں یہ خاتون پہلے حضرت علیؑ کے بھائی جعفر بن ابی طالبؑ کے عقد میں تھیں جب حضرت جعفر۔ طیار رضوان اللہ علیہ۔ شہید ہوئے تو اسماء بنت عمیس ابوبکر کے عقد میں آئیں اور ابوبکر کی اہلیہ ہوتے ہوئے بھی آپ کا شمار

حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کے وفادار عقیدت مندوں میں سے ہوتا ہے۔

"فقالت لجاریتھا، اذھبی الی منزل علیؑ وفاطمۃؑ واقرئیھما السلام وقولی لعلیؑ:

ان الملا یاتمرون بک لیقتلوک، فاخرج انی لک من الناصحین(۱)"

(اسماء نے اپنی کنیز سے کہا کہ: علی اور فاطمہ (علیہما السلام) کے گھر جاؤ

اور انہیں میری طرف سے سلام کہو اور علیؑ کو۔ یہ آیت پڑھ کر سناؤ اور۔ کہو کہ: "یہ گروہ بے شک تمہارے قتل کی

سازش تیار کر رہے ہیں، لہذا شہر سے نکل جاؤ، یقیناً میں تمہارا خیر خواہ اور نصیحت کرنے والا ہوں")

۔ اسماء بنت عمیس نے پیغام رسانی کے لئے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ۔ قرآن سے ماخوذ ہیں اور حضرت موسیٰ کی داستان کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ: فرعون کی حکومت میں موجود ایک مؤمن نے حضرت موسیٰ کو پیغام بھیجا کہ فرعون اور اس کے درباری تیرے قتل کے بارے میں صلاح ومشورہ کر رہے ہیں اور قتل کا نقشہ تیار ہو چکا ہے، لہذا اے موسیٰ مصر سے باہر نکل جا، میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں اور تجھے نصیحت کر رہا ہوں۔

اسماء بنت عمیس اس آیت شریفہ کے ذریعے حضرت علیؑ کو یہ سمجھانا چاہتی تھیں کہ ابوبکر اور عمر آپ کے قتل کا منصوبہ تیار کر چکے ہیں لہذا بہتر ہے کہ آپؑ مدینہ سے چلے جائیں۔

"فجاءت، فقال امیر المؤمنینؑ، قولی لھا" ان اللّٰہ یحول بینھم وبین ما یریدون"

(کنیز آئی۔ اور پیغام پہنچایا۔ تو حضرت امیر المؤمنینؑ نے اس سے فرمایا کہ: اسماء سے جا کے کہو کہ:

خدا ان کو اپنے ہدف سے دور رکھے گا اور ان کی سازش کی راہ میں مانع ہو گا)

حضرت علیؑ اس جملے کے ذریعے اسماء کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خداوند ان کی سازش کو ناکام بنائے گا اور ان کو اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دے گا(۲)۔

"ثم قام وتھیا للصلوٰۃ" (پھر آپؑ اٹھے اور نماز کے لئے آمادہ ہوئے)

۱۔ سورۂ قصص / ۲۰۔

۲۔ تفسیر علی بن ابراہیم میں یہ واقعہ زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے جبکہ احتجاج طبرسی میں اسی مقدار پر اکتفا کیا گیا ہے۔

" وحضر المسجد وصلیٰ خلف ابی بکر "

(اور مسجد میں حاضر ہو کر ابو بکر کے پیچھے نماز پڑھی)

" وخالد بن الولید یصلی بجنبه، ومعه السیف؛ "

(اور خالد بن ولید تلوار کے ساتھ نماز میں حضرت امیر المومنین (ع) کے ایک طرف کھڑا ہو گیا !)

نماز کی حالت میں ابو بکر کا تردّد اور پشیمانی،

" فلمّا جلس ابو بکر فی التشهد، ندم علیٰ ما قال وخاف الفتنة، وعرف شدة علیٰ وباسه "

(جب ابو بکر تشہد کے لئے بیٹھا تو وہ خالد کو کہی ہوئی اپنی بات پر پشیمان ہوا اور اسے خوف ہوا کہ کہیں فتنہ و آشوب برپا نہ ہو جائے، نیز حضرت علیؑ کی شجاعت اور ناقابل شکست شخصیت بھی اسے یاد آئی !)

ابو بکر تشہد کی حالت میں یہ سوچنے لگا کر ممکن ہے کہ علیؑ اپنی شجاعت اور بہادری کی بنا پر غالب آجائیں اور خالد مغلوب ہو جائے، اگر خالد اپنے مشن میں کامیاب بھی ہو جائے تو ممکن ہے عوام خصوصاً شیعیان علیؑ کے جذبات قابو سے باہر ہو جائیں اور نتیجتاً اس کی حکومت کے خلاف آشوب برپا نہ ہو جائے۔ خالد کی شکست یا حضرت علیؑ کی خونخواہی میں اٹھنے والی ننگی تلواروں کا تصور ابو بکر کو نماز میں پریشان کرتا رہا اور وہ تشہد کی حالت میں اسی مسئلے پر سوچتا رہا۔

" فلم یزل متفکراً لا یجسر ان یسلّم، حتی ظن الناس انه قد سها "

(اسی لئے نماز میں وہ سوچتا ہی رہ گیا اور سلام پھیرنے کی جرات نہیں کر سکا، یہاں تک کہ لوگوں نے یہ سوچا کہ ابو بکر کو نماز میں اشتباہ ہو گیا ہے۔)

" ثم التفت الی خالد، فقال،

" یا خالد؛ لا تفعلنّ ما امرتک، والسلام علیکم ورحمة اللّٰه وبرکاته " !!

(بالاخرہ ابو بکر ۔ نماز کی حالت میں ۔ خالد کی طرف متوجہ ہوا ! اور کہا کہ: " اے خالد! جو حکم میں نے تجھے دیا ہے اس پر عمل نہ کرنا ! والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ "۔ اور سلام پھیرا ۔ !!)

" فقال امیر المؤمنینؑ: یا خالد: ما الذی امرک به؟ "

(امیر المؤمنین (ع) نے خالد سے پوچھا کہ: اے خالد! اس نے تجھے کیا حکم دیا تھا؟)

" فقال: امرنی بضرب عنقک "

(خالد نے کہا کہ: اس نے مجھے حکم دیا تھا کہ آپ کی گردن اڑا دوں!!)

" قال (ع): او کنت فاعلاً "

(آپؑ نے فرمایا کہ: کیا تم یہ کام کر گزرتے؟)

" قال: ای واللہ، لولا انہ قال لی لا تقتلہ قبل التسلیم، لقتلتک!!! "

(خالد نے کہا:

ہاں، خدا کی قسم! اگر سلام پھیرنے سے قبل وہ یہ نہ کہتا کہ اسے قتل نہ کرنا تو میں یقیناً آپ کو قتل کر دیتا!!!)

" قال (ع): فاخذہ علیؑ (ع) فجلد بہ الارض "

(۔ اس روایت کے راوی ۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ ۔ جب یہ بات سنی تو ۔
حضرت علیؑ نے خالد کو اٹھا کر زمین پر پچھاڑ دیا)

" فاجتمع الناس علیہ، فقال عمر: یقتلہ و ربّ الکعبۃ "

(پس لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور عمر ۔ ڈر کر ۔ کہنے لگا کہ: ربّ کعبہ کی قسم علیؑ اس کو قتل کر دے گا)

" فقال الناس: یا ابا الحسن: اللہ اللہ بحق صاحب القبر، فخلّی عنہ "

(پس لوگوں نے امیر المؤمنینؑ سے کہا کہ:

یا ابا الحسن! خدا کا واسطہ! خدا کا واسطہ اور ۔ رسول خدا (ص) کی ضریح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ۔ اس قبر والے کی حرمت کا واسطہ ۔ اسے قتل نہ کریں اور اسے چھوڑ دیں ۔ تو آپؑ نے خالد کو چھوڑ دیا)

حضرت امیر المؤمنین (ع) کی عمر کو دھمکی:

" ثم التفت الی عمر، فاخذ بتلابیبہ "

(اس کے بعد آپؑ، عمر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کا گریبان پکڑ لیا)

"تلابیب" یعنی گریبان، لباس کا وہ حصہ جو گردن کے ارد گرد ہو اس کا مفرد "تلبیب" ہے۔

" وقال علیه السلام، یابن صهاک، والله لولا عهد من رسول الله، وکتاب من الله سبق،

لعلمت اینا اضعف ناصراً واقل عدداً، ودخل منزله "

(اور عمر کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

اے صہاک کے بیٹے! خدا کی قسم، اگر رسول خدا (ص) کی طرف سے عہد نہ ہوتا۔ کہ طاقت کا استعمال نہ کروں۔ اور خدا کی طرف سے اس سے قبل کوئی حکم نہ ہوتا تو تجھے پتہ چل جاتا کہ ہم میں سے کون بے یار و مددگار ہے؟ کس کے پاس افرادی قوت کی کمی ہے؟۔ اس کے بعد۔ آپؑ اپنے گھر تشریف لے گئے)

حضرت علیؑ جانتے تھے کہ یہ جو ڈرامہ رچایا جا رہا ہے اس کا اصلی کردار عمر ہی ہے اور در اصل یہ عمر ہی تو تھا کہ جس نے ابوبکر کو مشورہ دیا ہے کہ خالد بن ولید کو بلا کر قتل کی سازش تیار کرے اسی لئے آپؑ نے۔ ابوبکر کے بجائے۔ عمر کا گریبان پکڑا اور اس کو عتاب کا نشانہ بنایا(۱)۔

اللّٰهم العن اول ظالم ظلم حقّ محمد وآل محمد (ص) وآخر تابع له علیٰ ذلک

والسلام علیکم ورحمة اللّٰه وبرکاته

۱۔ علامہ مجلسیؒ، بحار الانوار میں طبع قدیم ج ۸ ص ۹۶ پر لکھتے ہیں کہ، "ابن ابی الحدید نے "نقیب" نامی ایک سنی عالم دین سے پوچھا کہ، لوگ حضرت علیؑ سے کافی دشمنی اور عداوت رکھتے تھے لیکن وہ کونسا سبب تھا کہ جس کی وجہ سے آپؑ کئی سالوں تک ان کے قاتلانہ حملے سے محفوظ رہے اور اپنے گھر میں زندگی گزارتے رہے؟

"نقیب" نے جواب میں کہا کہ: اس کی علت یہ تھی کہ جب اقتدار اس پارٹی کے ہاتھوں چلا گیا تو علیؑ نے سیاست اور اقتدار کی فکر کو اپنی ذہن سے نکال دیا اور ہمیشہ عبادت، نماز اور قرآن کی جمع آوری میں مشغول رہے اور کبھی بعض کاموں میں حکمرانوں کے ساتھ تعاون بھی فرماتے تھے اس طرح جب حکمرانوں نے حضرت علیؑ کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تو انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا ورنہ وہ حضرت علیؑ کو قتل کر دیتے..."